پروفیسر مختار الدین احمد

محقّق اور دانشور

غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی

Collection of Prof. Muhammad Iqbal Mujaddidi Preserved in Punjab University Library.

پروفیسر محمد اقبال مجددی کا مجموعہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ شدہ

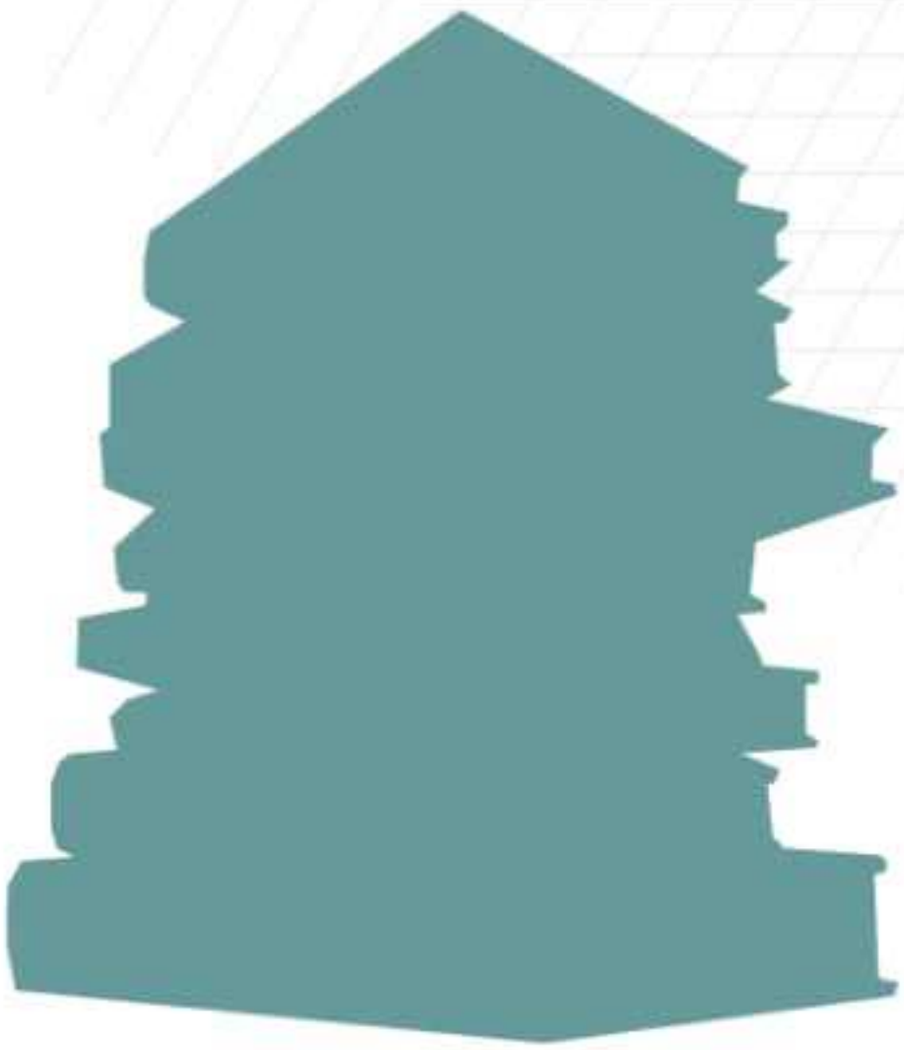

Marfat.com

پروفیسر مختار الدین احمد

(محقّق اور دانشور)

مرتّب:

شاہد ماہلی

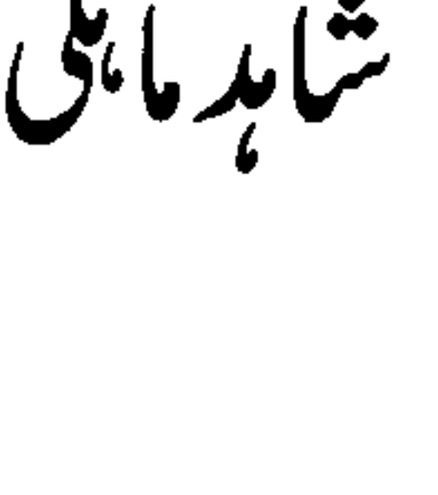

غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی

Marfat.com

(© جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ)

Prof. Mukhtaruddin Ahmed

Edited By :

Shahid Mąhuli

129371

اہتمام	:	شاہد ماہلی
اشاعت	:	۲۰۰۵ء
قیمت	:	۱۰۰/روپے
مطبوعہ	:	عزیز پرنٹنگ پریس، دہلی

غالب انسٹی ٹیوٹ،
ایوانِ غالب مارگ، نئی دہلی۔۲

www.ghalibinstitute.com-- email: ghalib@vsnl.net

Marfat.com

ترتیب

سپاس نامہ

۱۔ پروفیسر مختارالدین احمد (قدیم وجدید علمی روایات کے حامل)	پروفیسر نذیر احمد	۱۱
۲۔ غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں	پروفیسر سید امیر حسن عابدی	۲۰
۳۔ پروفیسر ڈاکٹر مختارالدین احمد	ڈاکٹر رفیع الدین	۲۳
۴۔ میرے عزیز استاد بھائی (ڈاکٹر مختارالدین احمد)	ڈاکٹر نبی بخش بلوچ	۳۱
۵۔ پروفیسر مختارالدین احمد آرزو (نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو)	پروفیسر مسعود حسین	۳۴
۶۔ اظہارِ نیازمندی	پروفیسر داؤد رہبر	۳۹
۷۔ نقوشِ آرزو	پروفیسر اسلوب احمد انصاری	۵۶
۸۔ ڈاکٹر مختارالدین احمد (چند مکاتیب کے آئینے میں)	ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب	۶۰
۹۔ پروفیسر مختارالدین احمد (ذاتی تاثرات)	عبدالعلیم قدوائی	۷۱
۱۰۔ ہم عصر شخصیات (پروفیسر مختارالدین احمد کی نظر میں)	پروفیسر ریاض الرحمٰن شروانی	۷۵
۱۱۔ پروفیسر مختارالدین احمد	پروفیسر نیّر مسعود	۹۲
۱۲۔ پروفیسر مختارالدین احمد: ممتاز ماہرِ غالبیات	ڈاکٹر خلیق انجم	۹۵

Marfat.com

۱۳۔ترستی ہے نگاہ نارسا جس کے نظارے کو	مولانا وارث ریاضی	۱۰۸
۱۴۔آرزو صاحب (حسنِ سلوک کا بہترین نمونہ)	ڈاکٹر ابنِ فرید	۱۲۱
۱۵۔غالبیات اور ڈاکٹر مختار الدین	پروفیسر عبدالقوی دسنوی	۱۲۷
۱۶۔پروفیسر مختار الدین احمد (منفرد مزاج ومنہاج کی تصویر و تفسیر)	پروفیسر عبدالغفار شکیل	۱۳۴
۱۷۔آرزو صاحب میری نظر میں	ڈاکٹر سید امین اشرف	۱۳۹
۱۸۔پروفیسر مختار الدین احمد	پروفیسر نورالحسن نقوی	۱۴۹
۱۹۔مختار الدین احمد کا اندازِ تربیت	پروفیسر کبیر احمد جائسی	۱۵۳
۲۰۔شرف مختار	پروفیسر اصغر عباس	۱۶۲
۲۱۔ڈاکٹر مختار الدین احمد (ایک خط کی روشنی میں)	پروفیسر محفوظ الحسن	۱۶۵
۲۲۔پروفیسر مختار الدین احمد (ایک مایۂ ناز محقق)	پروفیسر شریف حسین قاسمی	۱۶۹
۲۳ پروفیسر ڈاکٹر مختار الدین احمد (اقدار و معیار کے محافظ)	پروفیسر شاہ عبدالسلام	۱۷۲
۲۴۔مکتوباتی سرمایۂ ادب اور مختار الدین احمد	ڈاکٹر شمس بدایونی	۱۷۵
۲۵۔مختار الدین احمد اور کربل کتھا کی دریافت	ڈاکٹر نسیم احمد	۱۸۶

Marfat.com

سپاس نامہ

بہ خدمت جناب پروفیسر مختار الدین احمد صاحب

غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی کو آج یہ فخر حاصل ہو رہا ہے کہ اس کی دعوت پر آج ہم سب جنابِ والا کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں یہاں جمع ہیں۔

جنابِ محترم!

آپ کی ہمہ گیر اور کثیر الجہات شخصیت سے عربی، فارسی اور اردو دنیا بہ خوبی واقف اور ان تینوں زبانوں میں تحقیق و تدوین کے میدان میں آپ کی مساعیِ جمیلہ کی معترف ہے۔ مشرقی علوم کی ترویج میں آپ کی دانشورانہ خدمات کا مختلف ذرائع سے اعتراف ہوتا رہا ہے جو ہم سب کے لیے باعثِ فخر ہے۔

چھوٹوں سے شفقت، علمی ضرورت مندوں کی دستگیری، شریفانہ عادات و اطوار، قدیم شرفا کی وضعداری ایسے اوصاف ہیں جو آپ کی شخصیت کو امتیاز بخشتے ہیں۔ جنابِ والا! غالب کے احوال و آثار سے متعلق آپ کی بنیادی تحقیقات اہم مآخذ کی بازیافت اور ان کا منطقی تجزیہ، ماہر غالبیات کی صف میں آپ کو اعلیٰ مقام پر فائز کرتا ہے۔ آپ کے مرتبہ عربی، فارسی اور اُردو متون بجا طور پر متنی تنقید و تحقیق کے شاہکار سمجھے جاتے ہیں۔ آپ کے علمی و ادبی کارنامے اس حقیقت کا ثبوت ہیں کہ آپ کا علمی ذوق ہمیشہ نئے آفاق اور اچھوتے گوشوں کی جستجو کرتا رہا ہے۔ یورپ میں اعلیٰ تعلیم کے لیے آپ کا قیام اور علمی و تحقیقی کاوشوں میں وہاں کے بعض مایۂ ناز مستشرقین کی تربیت و راہنمائی نے بھی آپ کی علمی شخصیت پر اپنا اثر چھوڑا ہے جس کی جھلک آپ کے تحقیقی کاموں میں نظر آتی ہے۔

Marfat.com

جنابِ عالی! مخطوطہ شناسی بھی آپ کا ایک علمی وصف ہے جس نے آپ کو ہندستان، پاکستان، دنیاے عرب اور یورپ کے اہم کتب خانوں میں مطالعے کے لیے آمادہ اور وہاں موجود بعض اہم اور کمیاب منابع کی بازیافت کے مواقع فراہم کیے۔ خود اپنی علمی تشنگی کی تشفی اور دوسروں کی علمی پیاس بجھانے کی لگن نے آپ کو نامہ و پیام کے ذریعہ ہند اور بیرون ہند کے بے شمار علما و فضلا سے وابستہ رکھا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہمارے دور کے کسی دوسرے عالم و محقق کے علمی تعلقات آپ کی طرح وسیع نہیں۔ گوناگوں علمی و ادبی مسایل پر علما سے آپ کی خط و کتابت، جو آپ نے خاص سلیقے سے محفوظ رکھی ہے، ایک علمی ذخیرے اور محققین کے لیے ایک راہنما ماَخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔

آپ کی فعّال علمی زندگی نصف صدی سے بیشتر عرصے پر محیط ہے۔ اس طویل عرصے میں تحقیق و تدوین کی راہ میں جو چراغ آپ نے جلائیں ہیں، وہ آنے والی نسلوں کو روشنی بخشتے رہیں گے۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں آپ کی نمایاں تدریسی خدمات اور علمی و تحقیقی کارناموں کی اہمیت و مناسبت کے پیشِ نظر آپ کو صدر جمہوریۂ ہند نے سرٹیفکٹ آف آنر اور خود غالب انسٹی ٹیوٹ نے اردو فارسی تحقیق پر غالب ایوارڈ سے نوازا ہے جو ہم سب کے لیے باعث مسرّت و افتخار ہے۔

جنابِ والا! غالب انسٹی ٹیوٹ کے جملہ اراکین کی طرف سے علمی و ادبی کارناموں پر آپ کو دلی مبارکباد پیش ہے اور خدا کی بارگاہ میں ہم سب دست بہ دعا ہیں کہ آپ صحت و سلامتی کے ساتھ اپنے علمی کاموں میں مصروف رہیں۔

این دعا از من و از جملہ جہان آمین باد

منجانب

اراکینِ، غالب انسٹی ٹیوٹ

Marfat.com

سید ہاشم علی

سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

نیپرول، امریکہ

۱۲/دسمبر ۲۰۰۲

محترمی پروفیسر نذیر احمد صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ

آپ کا ۱۲/نومبر کا کرم نامہ نومبر کے آخر میں ملا۔ دل کے دورے کی وجہ سے جواب دینے میں تاخیر کے لیے نادم ہوں۔

پروفیسر ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو صاحب علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے ان اساتذہ میں سے ہیں جن کے علم اور فضل، و اخلاق و کردار نے مجھے بہت متاثر کیا اور میرے دل میں ان کے لیے بڑا احترام ہے۔ علی گڑھ چھوڑنے کی بعد ان سے خط و کتابت کے سلسلہ بھی رہا۔

پروفیسر مختار الدین احمد علی گڑھ کے ان پر خلوص، لائق اور باوقار اساتذہ میں سے ہیں جن کو دانش ور کہا جاسکتا ہے اور جن کی وجہ سے مسلم یونیورسٹی کا وقار عظیم قائم ہے۔

میں غالب انسٹی ٹیوٹ کو اعتراف خدمات کے ایسے جلسے منعقد کرنے کے لیے مبارک باد دیتا ہوں۔

میری دعا ہے کہ خدا ان کے اور آپ جیسے باوقار عالموں کو صحت کامل اور عمر دراز عطا فرمائے۔

خاکسار

سید ہاشم علی

Marfat.com

سید حامد

سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
تعلیم آباد، نئی دہلی
۱۴/اگست ۲۰۰۳

محترمی سلام وسپاس

''مختار نامہ'' ارسال کرکے آپ نے مجھ پر احسان کیا۔ حیران رہ گیا کہ ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں۔ میں پروفیسر مختار الدین احمد صاحب کا نیاز مند رہا ہوں آج یہ محسوس کرکے کہ میں ان کے اکتسابات و کمالات سے اس قدر ناواقف رہا اپنی محرومی پر دکھ اور اپنی غفلت پر انفعال سے دو چار ہوں۔ کیسی منضبط زندگی، کتنی مسلسل جدو جہد، کتنی معیاری اور کس قدر سچی اور جانکاہ طلب، یہ کام جو مختار الدین احمد صاحب نے کر دکھایا بہت کم افراد کے بس کا ہوگا۔ اندازہ ہوتا ہے کہ انسان میں بیحد صلاحیتیں اور امکانات پنہاں ہیں، شرط صرف یہ کہ وہ انھیں بروئے کار لانے کا عزم کرے اور عزم سے روگردانی کا خیال بھی کبھی ذہن میں نہ لائے۔ تدوین و تحقیق اور کسبِ فضیلت اور حصول علم کو ایسا ہی مزاج اور ایسی صلابت، ریاضت اور مداومت درکار ہے۔ اس کی قدر کرنے کا مجھے حق اس لیے ہے کہ مذکورہ اوصاف سے بالکل محروم ہوں۔

پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی مرحوم کا دور بدگمانی جب پایان کو پہنچا تو مجھے ان کی خدمت میں حاضر ہونے اور ان کی لائبریری کو دیکھنے اور ان کے نظام اوقات کا اندازہ لگانے اور طریق تحقیق و تخلیق کی آہٹ پانے کا موقع ملا۔ میں حیران رہ گیا۔

اسی نوع کی حیرانی مجھے ''مختار نامہ'' کو پڑھ کر ہوئی۔ ہماری خاکستر میں یارب ایسی چنگاریاں بھی ہیں۔

''حرفے چند' تعریف سے بالا تر اور توصیف سے بے نیاز ہے۔ ڈاکٹر عطا خورشید اور مہر الٰہی ندیم سپاس وستایش کے مستحق ہیں جن کا لکھا ہوا ''تعارف نامہ'' مختار الدین احمد صاحب کے شایان شان ہے اور ان کی متنوع شخصیت کے اہم گوشوں کو بے نقاب کرتا ہے۔

خیر اندیش
سید حامد

Marfat.com

پروفیسر نذیر احمد

پروفیسر امیریٹس، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

پروفیسر مختار الدین احمد

(قدیم وجدید علمی روایات کے حامل)

پروفیسر مختارالدّین احمد سے میری ملاقات ۱۹۵۱ء میں ہوئی، یعنی آج سے تقریباً ۵۳ سال قبل۔ ان دنوں میں لکھنؤ یونیورسٹی میں لکچرر تھا۔ اسی سال آل انڈیا اورینٹل کانفرنس کا اجلاس لکھنؤ یونیورسٹی میں ہورہا تھا۔ اس کے مقامی سکریٹری پروفیسر آئر تھے، جو بعد میں سنسکرت یونیورسٹی بنارس کے وائس چانسلر ہوگئے۔ بڑے شریف اور نیک دل انسان تھے، ان کی تصویر آنکھوں میں پھر رہی ہے۔ آل انڈیا اورینٹل کانفرنس میں عربی وفارسی کا ایک مستقل شعبہ ہے، اُردو کا شعبہ مقام کی مناسبت سے قائم کرلیا جاتا ہے، لکھنؤ میں اُردو کا شعبہ قائم ہوا تھا۔ پروفیسر مختارالدّین احمد عربی وفارسی اور اُردو دونوں شعبوں کے تعلق سے اجلاس میں شرکت کی غرض سے علی گڑھ سے لکھنؤ آئے تھے، یہیں ان سے میری پہلی ملاقات ہوئی۔

پروفیسر مختارالدّین احمد سے میرے تعلقات رفتہ رفتہ کافی استوار ہوگئے۔ ان میں موصوف کی پُر خلوص محبت کے ساتھ ساتھ ہماری علمی وفکری ہم آہنگی کو بھی بڑا دخل تھا۔ ان کو بھی تحقیق سے بڑی دلچسپی ہے، اور مجھے بھی اس سے لگاؤ ہے جو مرحوم پروفیسر سیّد مسعود حسن رضوی کی فیض تربیت کا نتیجہ ہے۔ متنی تنقید وتحقیق کی طرف ڈاکٹر صاحب کا میلان ہے، مجھے بھی اس سے دلچسپی ہے۔ مختار الدّین صاحب کی تربیت یورپ میں ہوئی اور اکثر یورپی شرق شناس متنی تحقیق میں بڑا درک رکھتے تھے۔ ان کے لیے مشرقی زبانوں پر دسترس حاصل کرنا مشکل تھا، جب کہ مزاجاً وہ لوگ تاریخ سے زیادہ مناسبت رکھتے ہیں۔ بظاہر مستشرقین کی تصحیح متن کی سنگلاخ وادی کی طرف توجہ منعطف کرانے کا موجب ایک خاص امر ہوا ہوگا۔ یورپ جب اسلامی علوم کا مرکز بنا تو ہزاروں لاکھوں نوادر مخطوطات بھی وہاں پہنچے۔ ان کی بنیاد پر شاندار کتابخانے قائم ہوئے، تو مخطوطات کے روشناس کرانے کی ذمہ داری انھیں شرق شناسوں کے سر پر آئی۔ چنانچہ انھوں نے

Marfat.com

مخطوطات کے ایسے قیمتی اور مفید کیٹلاگ مرتّب کیے، جو ساری دنیا کے اہل علم کے لیے مشعلِ راہ بنے۔ کیٹلاگ کی ترتیب ہزاروں مطبوعات کے گہرے مطالعے کے بعد عمل میں آتی ہے۔ اور یہی اطلاعات جو فہارس میں مندرج ہوتی ہیں، تحقیق کی بنیاد بنتی ہیں۔ انھیں مخطوطات میں سیکڑوں نوادر ہوتے ہیں مستشرقین انھیں روشناس کراتے ہیں، بعضوں کو مرتّب کر کے شائع کرتے ہیں۔ اس طرح مخطوطات کے تعارف کے ساتھ ساتھ تصحیح متن کے اصول وضوابط سے بھی شناسائی ہوجاتی ہے۔

ایسے علمی ماحول میں مختارالدّین احمد صاحب نے کئی سال گزارے۔ وہ امریکہ کے راکیفلر فاؤنڈیشن کی فیلوشپ پر آکسفرڈ یونیورسٹی پہنچے جہاں مشہور اساتذہ اور علومِ اسلامی کے ماہرین سے انھیں استفادے کے مواقع ملے۔ پروفیسر سر ہملٹن گب جیسا بین الاقوامی شہرت کا عالم ان کا استاد ہوا اور انھیں کی رہنمائی میں انھوں نے اپنا تحقیقی مقالہ لکھا۔ انھوں نے اپنی صلاحیتوں سے پورا فائدہ اٹھایا اور محنت وتوجّہ سے کام لے کر صرف سولہ مہینوں میں، جو ایک ریکارڈ ہے، انگلستان کی اس شہرۂ آفاق یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ پروفیسر آربری (کیمبرج) اور پروفیسر بیسٹن، ناظمِ مخطوطاتِ بوڈلین لائبریری (آکسفرڈ) جو پروفیسر گب کے ہارورڈ جانے کے بعد وہاں عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے تھے ان کے ممتحنین میں تھے۔ ان دونوں نے سفارش کی تھی کہ ان کا مقالہ آکسفرڈ یونیورسٹی پریس شائع کرے۔

یورپ کے قیام نے مختارالدّین احمد صاحب کے علمی شوق کے لیے مہمیز کا کام کیا، آکسفرڈ کے اساتذہ اور یورپ کے ریسرچ اسکالرز کی صحبت میں ان کا علمی شوق بڑھتا گیا۔ انھوں نے ایک طرف یورپ کے شرق شناسوں اور محققوں سے رابطہ پیدا کیا، تو دوسری طرف وہاں کے کتابخانوں سے بھی بھرپور استفادہ کیا۔ ان کا علمی سفر انگلستان اور اسکاٹ لینڈ کے کتابخانوں سے شروع ہوا۔ وہ وہاں ان سب جامعات میں گئے، جہاں مشرقی علوم کے شعبے قائم تھے اور جہاں مشرقی مخطوطات محفوظ تھے۔ انھوں نے نوادر اور اہم مخطوطات کی تلاش میں ہالینڈ، جرمنی اور فرانس کے متعدّد سفر کیے اور مہینوں وہ وہاں قیام پذیر رہے۔ انھوں نے وہاں کے اہم عربی اور فارسی اور اُردو مخطوطات کا گہرا مطالعہ کیا، اور اس طرح نہ معلوم، کتنے مخطوطات تک ان کی رسائی ہوئی، جو نایاب ہیں۔ ان میں سے اکثر وبیشتر کی نایابی اور نُدرت کا تعیّن خود پروفیسر مختارالدّین احمد نے کیا، جو ان کے گہرے مطالعے کا نتیجہ تھا۔ ان نادر مخطوطات میں سے بعض کا انھوں نے خود تعارف کرایا،

Marfat.com

بعض کو مرتب کرکے شائع کیا، اور بعض سے ان کے دوستوں نے فائدہ اٹھایا۔ ان کی یادداشت کی کتاب میں ایسے سیکڑوں مخطوطات کا ذکر محفوظ ہے، جو اہم ہیں اور اشاعت کے قابل ہیں۔

ڈاکٹر مختار الدّین احمد قدیم اور جدید دونوں علمی روایتوں کے حامل ہیں۔ وہ عربی مدارس کی تعلیم سے فراغت کے بعد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں داخل ہوئے اور یہاں سے اعلیٰ اسناد حاصل کیے۔ پھر وہ شرقِ اوسط اور یورپ گئے اور آکسفرد میں تعلیم حاصل کی۔ اس سے ان کی صلاحیتوں میں چار چاند لگ گئے۔ انھوں نے مشرقی علماء کے سامنے برسوں زانوے تلمذتہ کیا۔ ان کی ابتدائی عمر کا بیشتر حصہ اپنے والدِ محترم مولانا ظفر الدّین قادری کی زیرِ تربیت گزرا، جو اپنے وقت کے بڑے جید عالم اور صاحبِ تصانیف کثیرہ تھے۔ پھر علی گڑھ سے انھیں فیضان ملا، جہاں علّامہ عبدالعزیز المیمنی جیسا متبحّر عالم ان کا استاد اور ان کی ڈاکٹریٹ (پی ایچ۔ ڈی) کے مقالے کا نگراں مقرّر رہوا۔ پھر یورپ کے مستشرقین کی صحبت نے ان کی صلاحیت میں بڑا نکھار، ان کی شخصیت میں بڑا رچاؤ اور ان کی طبیعت میں بڑی خوش سلیقگی پیدا کردی۔ یورپ کے اچھے محققین کی صحبت بڑی تاثیر رکھتی ہے، بعض ہندوستانی اہل علم یورپی شرق شناسوں کے کاموں کو اپنی بیجا تنقید کا نشانہ بناتے ہیں، ان کے نزدیک ان کی ساری علمی کاوشیں تخریبی رہی ہیں، دراصل ان کے اعتراضات تنگ نظری اور احساسِ کمتری کا نتیجہ ہیں۔ جب وہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کا جیسا کارنامہ وہ خود انجام نہیں دے سکتے تو وہ اپنی شرمندگی ان پر اعتراض کرکے رفع کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ورنہ مستشرقین کی ایک بڑی جماعت نے پچاسوں کتابخانے قائم کرکے ہمارے علمی سرمایے کو محفوظ کرکے، جو شاندار علمی روایات قائم کردی ہیں، ان کی مثال مشرق میں تلاش سے بھی نہیں مل سکتی۔ یہی مستشرقین ہماری میراث اور ہمارے علوم کے محافظ رہے ہیں، یہ ضرور ہے کہ ان میں سے بعض کا شرق شناسی کا دعویٰ غلط ہے، اور بعض ایسے تنگ نظر بھی ہیں جنھوں نے اسلام اور اسلامی تہذیب کو نشانۂ ملامت بنانے کی ناکام کوشش بھی کی ہے۔ لیکن چند متعصب اصحاب کی وجہ سے سارے یورپی محققین کے کارناموں پر پانی پھیرنے کی کوشش احسان فراموشی کے مترادف ہوگی۔

ڈاکٹر مختار الدّین بلند پایہ اخلاق کے مالک ہیں وہ نہایت ملنسار، خلیق اور متواضع، مخلص دوست اور شفیق استاد ہیں۔ چھوٹے اور بڑے سب سے بہت اخلاق سے پیش آتے ہیں۔ مزاج میں سادگی کے ساتھ شگفتگی ہے، گفتگو میں کشش ہے، مدلّل انداز

Marfat.com

میں بات کرتے ہیں، نہایت معاملہ فہم ہیں۔ بردباری اور تحمل ان کے مزاج میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ سیاست سے الگ تھلگ رہتے ہیں، سیاسی موضوع پر بہت کم گفتگو کرتے ہیں۔ اسلامی فکر رکھتے ہیں۔ اختلافی امور میں میانہ روی ان کا شیوہ ہے چونکہ سیاسی مزاج نہیں رکھتے، اس لیے سیاسی اختلاف کا موقع ہی نہیں۔ البتہ ادبی اور علمی مسائل میں ایسے مواقع کثرت سے آتے ہیں، جہاں اختلاف کے مواقع پیدا ہوجاتے ہیں۔ ایسی صورتوں میں بھی وہ کبھی شدّت کا طریقہ اختیار نہیں کرتے، کسی سے اختلاف بھی کرینگے تو انداز بیان ایسا نرم کہ مخالف کی کسی طرح دل شکنی نہیں ہوگی، اگرچہ وہ مشہور محقق قاضی عبدالودود سے بہت قریب رہے ہیں اور ان کے طریقِ تحقیق سے کافی متاثر بھی ہیں، لیکن قاضی صاحب کا اندازِ تحقیق معروضی ہونے کے باوجود بہت سخت تھا، وہ اگر کسی کی تحریر میں کوئی غلطی پاتے تو اُس کی تردید میں پورا زورِ قلم صرف کردیتے تھے اور ان کا لب ولہجہ بھی سخت ہوتا تھا، لیکن مختار الدّین احمد صاحب کا طریقۂ کار ان سے بالکل مختلف ہے۔

وہ مذہبی اختلاف کو بھی ہر چیز سے الگ رکھتے ہیں۔ ان کے والد مرحوم فاضل بریلویؒ کے ارشد تلامذہ اور ان کے اہم خلفا میں سے تھے، ڈاکٹر صاحب موصوف بھی بریلوی خیال کے علماء کا احترام کرتے ہیں لیکن ان کے اکثر احباب دوسرے مدرسۂ فکر سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے مخلص دوستوں میں مرحوم پروفیسر سعید احمد اکبرآبادی بھی تھے، جو دیوبندی مکتب فکر کے مشہور نمایندے تھے۔ مرحوم اکبرآبادی کے داماد پروفیسر محمد اسلم بھی دیوبندی فکر کے تھے اور ڈاکٹر مختارالدّین احمد سے ان کے خصوصی تعلّقات رہے۔ میرے ان سے تقریباً ترپن برس سے تعلقات ہیں، لیکن اس طویل مدّت میں مجھے یاد نہیں آتا کہ کبھی ایک بار بھی انھوں نے کسی اختلافی مسئلے پر شدّت سے اپنی رائے کا اظہار کیا ہو۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ مدرسۂ اسلامیہ شمس الہدیٰ، پٹنہ میں تعلیم کے دوران میں ان کے بیشتر اساتذہ دیوبند اور ندوہ کے فضلا میں سے تھے۔ پھر علی گڑھ اور یورپ کے قیام اور وہاں کی علمی فضا نے انھیں قلب ونظر کی وسعت عطا کی۔ دنیا کی ان دونوں مشہور جامعات کے علماء سے انھوں نے میانہ روی کا درس لیا اور متوازن ہونا سیکھا۔

ڈاکٹر صاحب کا حلقۂ احباب بہت وسیع ہے، ان کے احباب میں ہندوستانی، پاکستانی، ایرانی، عرب، انگریز، فرانسیسی، ڈچ اور جرمن سبھی شامل ہیں۔ منجملہ اور وجوہ کے اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے احباب سے رابطہ بہت استوار رکھتے ہیں۔ علمی وادبی مراسلت کا سلسلہ برابر جاری رکھتے ہیں، اور دوسروں کے علمی کاموں میں ہر طرح کی

Marfat.com

مدد کے لیے وہ ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔ یہ خوبی کم لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ وہ گذشتہ پچاس سال سے روزانہ ڈائری لکھنے کا التزام کیے ہوئے ہیں۔ نوعمری ہی میں انھوں نے یہ عادت ڈال لی تھی کہ سفر ہو یا حضر جب تک اپنی ڈائری میں دو چار سطریں نہ لکھ لیں وہ بستر پر نہیں جاتے۔ اس میں وہ لوگوں سے اپنی ملاقاتوں کا حال بھی لکھتے ہیں اور ان کے بارے میں کبھی کبھی اپنے تأثرات بھی۔ اس طرح ان کی ڈائری میں ان کے بہت سے دوستوں اور کرم فرماؤں کے اعمالنامے بھی درج ہونگے۔

ڈاکٹر مختار الدّین احمد کی زندگی بڑی منظّم ہے، کتابیں رسالے تو سلیقے سے رکھتے ہی ہیں، نادر تحریریں اور مشاہیر کے انگریزی، عربی، فارسی اور اُردو خطوط بھی ان کے پاس بڑی تعداد میں محفوظ ہیں۔ دنیا بھر کے دوستوں کے نام کے پتے اور ٹیلیفون، حروفِ تہجّی کے اعتبار سے انھوں نے مرتّب کر رکھے ہیں، یہ فہرست ہر وقت ان کی میز پر رہتی ہے۔ اس سے ان کا بہت سا وقت جو نام اور پتا تلاش کرنے میں صرف ہوتا، بچ جاتا ہے، زندگی کا المیہ یہ ہے کہ میرے پاس کوئی چیز مرتّب و منظّم نہیں، نہ کتابیں نہ رسالے۔

ڈاکٹر صاحب کا کتابخانہ جو سترہ ساڑھے سترہ ہزار کتب و رسائل پر مشتمل ہے تحقیقی کام کرنے والے دوستوں کے لیے میں نے ہمیشہ کھلا پایا، وہ مخصوص دوستوں کو اپنی کمیاب کتابیں عاریتہً دینے میں کبھی تامّل نہیں کرتے، ہاں ان کا اندراج وہ اپنی ڈائری میں کر لیتے ہیں تاکہ کتاب واپس نہ آنے کی شکل میں وہ یاددہانی کرا سکیں گو کبھی کبھی یہ کوشش بیکار ثابت ہوتی ہے۔

ڈاکٹر مختار الدّین کے علمی کارنامے گنانا مقصود نہیں۔ انھوں نے عربی، فارسی، اُردو تینوں زبانوں کے ادب سے متعلق اتنا قیمتی سرمایہ فراہم کر دیا ہے کہ آئندہ کا مورّخ اس کی قدر و قیمت متعیّن کریگا۔ صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے علمی مجلّات کی ادارت کے فرائض جس تن دہی، محنت اور فرض شناسی سے انجام دیے ہیں اس کی مثال آج کل نہیں ملتی۔ وہ ہر مقالے کو بغور پڑھتے ہیں جہاں ترمیم حذف یا اضافے کی ضرورت ہوتی ہے مصنّف سے کراتے ہیں لیکن اکثر خود ہی کر دیتے ہیں۔ ضرورت ہوئی تو ان پر حواشی و تعلیقات لکھتے ہیں اور علم میں اضافہ کرتے ہیں۔ جو امر اصلاح طلب ہوتا ہے اس کی اصلاح سے بھی گریز نہیں کرتے، پھر اس کا پروف بڑی دقّتِ نظر سے بار بار پڑھتے ہیں، انھیں وجوہ سے ان کی ادارت میں شائع ہونے والے ''مجلّۂ علومِ اسلامیہ'' نے بین الاقوامی شہرت حاصل کر لی تھی۔ یہ مجلّۂ اپنے دائرہ عمل اور معیار میں یورپ کے کسی رسالے

Marfat.com

سے کم نہیں تھا۔ افسوس کہ خوش درخشید و لے دولتِ مستعجل بود۔

''مجلّۂ علومِ اسلامیہ'' کی نسبت سے مجھے ایک واقعہ ہمیشہ یاد رہیگا۔ ۱۹۶۰ میں اس مجلّے کے اجرا کے زمانے میں یونیورسٹی سے ایک اور مجلّہ '' فکرونظر'' کے نام سے اس وقت کے پرووائس چانسلر ڈاکٹر یوسف حسین خان مرحوم کی ادارت میں شائع ہونا شروع ہوا تھا۔ میں نے ڈاکٹر عبدالعلیم مرحوم سے جو اس وقت ادارۂ علوم اسلامیہ کے سربراہ تھے عرض کیا کہ ''فکرونظر'' کی موجودگی میں ''مجلّہ علومِ اسلامیہ'' کی چنداں ضرورت نہیں۔ اس پر حسب معمول پروفیسر عبدالعلیم خاموش رہے۔ لیکن چند ہی دنوں میں، ''مجلّہ علومِ اسلامیہ'' نے شائع ہوکر علمی دنیا میں ہلچل مچادی۔ اس کی کامیابی کا سہرا تنہا پروفیسر مختارالدّین احمد کے سر ہے۔ '' فکرونظر'' بھی عالمی شہرت حاصل کر چکا تھا اور قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ان دونوں مجلّوں نے نہ صرف عالمی شہرت حاصل کہ بلکہ یونیورسٹی کی شہرت ومقبولیت کی ضمانت بھی ثابت ہوئے۔ غالباً ۱۹۶۱ یا ۱۹۶۲ء کا واقعہ ہے کہ انگریزی اخبار اسٹیٹسمین میں پروفیسر ہارون خان شروانی کا ایک خط شائع ہوا تھا جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ جس ادارہ سے ''فکرونظر'' جیسا مجلّہ شائع ہورہا ہو، اس ادارے کی ضمانت کے لیے یہی کافی ہے۔ ان دونوں مجلّوں کے مضامین کا ترجمہ مختلف زبانوں میں بھی ہوتا تھا۔ مجلّہ فکرونظر کے پہلے شمارے میں راقم حروف کا ایک مقالہ 'حافظ شیرازی کی زندگی کے اہم ماخذ'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا، اس کا ترجمہ فارسی میں پروفیسر علی اصغر حکمت نے کیا اور اس کا خلاصہ مجلّہ دانشکندۂ ادبیات شیراز یونیورسٹی نے شائع کیا۔ ''مجلّہ علوم اسلامیہ'' کے بعض مضامین کا ترجمہ شرقِ اوسط اور یورپ میں ہوا۔ آکسفورڈ کے پروفیسر رچرڈ والزر نے مختارالدّین احمد صاحب کے ایک مضمون کا ترجمہ انگریزی میں پروفیسر خورشید الاسلام سے کرایا جو اس زمانے میں وہیں مقیم تھے۔

پچیس تیس سال ہوئے پروفیسر مختارالدّین احمد صاحب نے علی گڑھ سے عربی میں ایک علمی اور تحقیقی رسالہ ''مجلّه المجمع العلمی الهندی'' کے نام سے شائع کرنا شروع کیا اس مجلّہ کے ذریعے عربی زبان وادب اور اسلامی علوم سے متعلق نہایت قیمتی سرمایہ فراہم ہورہا ہے، اور ظاہر ہے کہ اس سے عربی دنیا کو براہ راست استفادہ کرنے کا موقع مل رہا ہے۔ اس علمی رسالے نے کچھ ہی عرصے میں ایسی بین الاقوامی شہرت حاصل کرلی ہے کہ اسلامی علوم سے تعلق رکھنے والا دانشور اس کے حاصل کرنے کی کوشش میں رہتا ہے، ایں سعادت بزورِ بازو نیست۔ لیکن اس کی غیر معمولی مقبولیت میں ڈاکٹر

Marfat.com

مختارالدّین احمد کے علم وفضل کے علاوہ ان کے ذوق وشوق اور ان کی لگن اور محنت شاقہ کو بڑا دخل ہے، اس رسالے کے دو مخصوص شمارے (۱۰ اور ۱۱) عربی کے مشہور عالم علاّمہ عبدالعزیز المیمنی مرحوم سے متعلق ہیں جو عرب ممالک بلکہ عالمِ اسلام میں اپنے علمی کارناموں کی وجہ سے ہرجگہ معروف ہیں۔ پروفیسر مختارالدین احمد ان کے ارشد تلامذہ میں شمار ہوتے ہیں۔ انھوں نے اپنے شفیق استاد پر ان دوشماروں جو میں کوئی ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہے نہایت قیمتی مواد جمع کردیا ہے۔ انھوں نے اپنے عالمانہ انداز سے اپنے استاد کی زندگی اور ان کے کارنامے روشن کیے ہیں، یہ شمارے ہر علمی کام کرنے والے کے لیے مشعلِ راہ ہوسکتے ہیں۔ پریس بھیجنے سے پہلے اس مجموعے کے ایک ایک صفحے پر انھوں نے بڑی توجّہ صرف کی ہے۔ پروفوں کی تصحیح میں انھوں نے بڑی جانفشانی کا ثبوت دیا ہے۔ یہ خصوصی شمارے دلّی کے ایک چھوٹے سے پریس میں چھپ رہے تھے، اس میں چار صفحے سے زائد ایک ساتھ نہیں چھپ سکتے تھے، ان کے پاس کافی ٹائپ ہی موجود نہیں تھا، چنانچہ چند صفحے کمپوز کرکے پریس کا ایک کارکن دلّی سے مغرب کے وقت چل کر رات کے دس بجے علی گڑھ آتا اور مختارالدّین احمد صاحب بارہ، ایک بجے رات تک پروف دیکھ کر اسے دیتے، پریس کا آدمی رات ہی کی گاڑی سے واپس جاتا، صبح دلّی پہنچتا اور طباعت کا کام جاری رکھتا۔

مضامین کی ایڈیٹنگ کا جو معیار انھوں نے قائم کیا ہے کاش اس کا ایک حصّہ ہی دوسرے ایڈیٹروں کو مل جاتا۔ یہاں ایک مثال پر اکتفا کرتا ہوں۔

میمن صاحب نے ممتاز حسن، شان الحق حقّی، ڈاکٹر سیّد محمد یوسف اور کراچی یونیورسٹی کے بعض دوسرے شائقین کے اصرار پر ترقیِ اُردو بورڈ کراچی کے زیر اہتمام عربی زبان وادب اور عربی لغت پر اُردو میں تقاریر کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا۔ ان تقریروں کو ٹیپ کرلیا گیا تھا بعد کو انھیں سن کر کاغذ پر منتقل کیا گیا۔ یہ تقریریں بالاقساط ''اردو نامہ'' کے آٹھ دس شماروں میں شائع ہوئیں لیکن ٹیپ سے کاغذ پر منتقل کرنے میں کافی احتیاط نہیں برتی گئی۔ ''اردو نامہ'' میں اشاعت کے وقت پروف بھی توجّہ سے نہیں پڑھے گئے۔ مختارالدّین احمد صاحب نے کراچی کے مطبوعہ اور اق کی زیروکس کاپی منگوائی اور ان کا مطالعہ کیا تو اندازہ ہوا کہ متعدد مقامات پر عبارتیں گنجلک ہیں، کہیں مفہوم واضح نہیں، کہیں سماعت اور قرائت اور بعد کو طباعت کے مراحل میں الفاظ اور فقرے کچھ کے کچھ ہوگئے ہیں۔ انھوں نے کراچی جاکر ترقیِ اُردو بورڈ کے سابق ڈائرکٹر جناب شان الحق حقی اور اس

Marfat.com

وقت کے ڈائرکٹر پروفیسر ابواللیث صدّیقی سے مل کر اصل ٹیپ حاصل کرنے کی کوشش کی، اس لیے بھی کہ انھیں معلوم تھا کہ ان تقاریر کی آخری قسطیں شائع نہیں ہوسکی تھیں اور وہ مکمل متن شائع کرنا چاہتے تھے۔ انھیں اس مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی نہ ٹیپ کا پتا چل سکا نہ ان اوراق کا جو غیر مطبوعہ رہ گئے تھے۔ بہر حال علی گڑھ واپس آکر انھوں نے زیروکس کاپی سے ایک نقل تیار کی اس لیے کہ عکس واضح نہیں تھا اور طباعت جس ٹائپ میں ہوئی تھی، وہ بہت باریک تھا۔ انھوں نے پہلے نقل شدہ اجزا کا ''اردو نامہ'' کے مطبوعہ اوراق سے مقابلہ کیا، پھر انھیں اپنے دوستوں اور شاگردوں میں تقسیم کرکے ان کا عربی میں ترجمہ کرایا، ترجمے کو خود پوری توجہ اور احتیاط سے دیکھا۔ ترجمے مختلف اصحاب نے کیے تھے اور ہر ایک کا اپنا انداز تھا، لہٰذا ترجمے میں یکسانی پیدا کی، بعض مقامات پر غلط تعبیر سے ترجمہ میمن صاحب کی مراد سے دور ہوگیا تھا، اسے درست کیا۔ انھوں نے ابتدا میں ایک تمہید لکھی اور سب سے بڑا کام یہ کیا کہ ان تقاریر پر بہت مفید اور پُراز معلومات اپنی تعلیقات قلمبند کیں یہ تقریریں چونکہ لکھی ہوئی نہیں تھیں اور میمن صاحب کے سامنے غالباً نوٹس بھی نہیں تھے، وہ اپنے حافظے کی مدد سے تقریر کررہے تھے جب کہ ان کی عمر ۸۰ کے لگ بھگ ہوگی، اس لیے بعض مسامحات کا وقوع پذیر ہوجانا مستبعد نہ تھا، ایسے مقامات کی مختارالدّین صاحب نے تصحیح کی اور بعض کی اپنے حواشی میں نشاندہی کردی۔ ان مرحلوں کے بعد پروف ریڈنگ اور طباعت کی سنگلاخ وادی انھوں نے طے کی۔ انھوں نے بعض اجزا کے سات سات بار پروف پڑھے۔ صحت طباعت کی طرف سے وہ اب بھی مطمئن نہیں ہیں۔ سوسوا سو صفحے کا یہ مضمون جو محاضرات المیني کے عنوان سے چھپا ہے مجلّه المجمع العلمی الهندی کے خصوصی شمارے کے دوسرے حصّے کی ابتدا میں دیکھا جاسکتا ہے۔ یہ طریق کار کم و بیش میمن صاحب کی جملہ تحریرات کے ساتھ عمل میں آیا ہے۔ اس طرح انھوں نے اپنے استاد کی شاگردی کا ایسا حق ادا کیا ہے جو بطور یادگار عرصے تک باقی رہیگا۔

ڈاکٹر مختارالدّین احمد صاحب کا یہی عمل ان کے شاگردوں کے کام کے سلسلے میں بھی ہوتا ہے۔ وہ انھیں کام کرنا سکھاتے ہیں، تحقیق کے مسائل سے واقف کراتے ہیں، ان سے سخت محنت لیتے ہیں، ان کے مقالات پر پوری توجہ صرف کرتے ہیں، جب تک مقالے ان کے معیار پر پورے نہ اتریں انھیں پیش کرنے کی اجازت نہیں دیتے، ہر مقالے پر اپنا کافی وقت صرف کرتے ہیں شاگردوں کے کام کو دیکھنا، انھیں علمی ہدایات دینا، ان کے لیے مواد فراہم کرنا، ان کی ہر طرح مدد کرنا، اور ان ساتھ مہربانی سے پیش آنا،

Marfat.com

ان کی فطرت ثانیہ بن گئی ہے۔

جن اصحاب نے ڈاکٹر صاحب کی نگرانی میں کام کیا ہے اور جنھیں ام اے، ام۔فل کی ڈگریاں اور ڈاکٹریٹ تفویض ہوئی ہے ان کی تعداد چالیس پینتالیس سے کم نہ ہوگی، یہ شرقِ اوسط، ایران، بنگلہ دیش اور ہندوستان میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کے شاگردوں میں متعدد حضرات مختلف جامعات میں شعبۂ عربی میں پروفیسر اور صدر شعبہ ہیں یا ممتاز عہدوں پر متمکن۔ ان کے کچھ شاگردوں کے تحقیقی مقالے دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد سے شائع ہوکر خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔

علی واخلاقی اعتبار سے ڈاکٹر مختار الدّین احمد کا شمار مغتنمات میں ہے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں صحت وسلامتی عطا کرے اور تادیر وہ علم ودانش کی خدمات انجام دیتے رہیں:

ع۔ایں دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد

☆☆☆

Marfat.com

ڈاکٹر سید امیر حسن عابدی
سابق صدر شعبۂ فارسی، دہلی یونیورسٹی

غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

گزشتہ سو برس کے اندر کیسا انقلاب آیا ہے۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ ہندوستان کے کونے کونے میں عربی، فارسی اور اردو کا چرچا تھا۔ کیسے کیسے علما اور فضلا تھے، جن سے ہماری تہذیب کو چار چاند لگے ہوئے تھے، اب وہ شخصیتیں یاد آتی ہیں تو ایک ایسا خلا محسوس ہوتا ہے، جیسے شاید کبھی بھی پُر نہ کیا جاسکے گا۔ اس فضا میں خوشی کی بات ہے کہ ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جنھیں دیکھ کر، جن سے مل کر اور جن کی علمی کوششیں اور جن کی تحریرات دیکھ کر پچھلا زمانہ یاد آجاتا ہے، انہی لوگوں میں مختارالدین احمد صاحب بھی ہیں۔

اردو کے لیے فارسی اور فارسی کے لیے عربی کا جاننا ضروری ہے۔ اب ایسے لوگ شاذ و نادر ہی دکھائی دیتے ہیں جو بیک وقت تینوں زبانوں میں پوری دسترس رکھتے ہوں۔ بہرحال ان کمیاب شخصیتوں میں پروفیسر مختار الدین احمد کو ایک امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ آپ ایک طرف شعبۂ عربی کے صدر، تو دوسری طرف فارسی اور اردو کے مسلّم الثبوت محقق، جو ''غالبیات'' کے ماہروں میں شمار ہوتے ہیں۔

بدقسمتی سے مجھے موصوف سے ملنے میں تاخیر ہوئی، مگر جتنا قریب ہوتا گیا، اتنا ہی ان کے علمی کارناموں سے متأثر ہوتا چلا گیا۔ بہت کم لوگ ہوں گے جو اتنی دقّتِ نظر اور نفاست سے کام کرتے ہوں گے۔ ہندو بیرون ہند کی علمی و ادبی شخصیتوں سے وہ صرف متعارف ہی نہیں ہیں، بلکہ ان سے ان کے گہرے علمی روابط ہیں۔ علاوہ بریں آپ دوسروں کی علمی مدد کرنے میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں برتتے ہیں۔ میرے عزیز شاگرد ڈاکٹر نورالاسلام صاحب کا نیشنل میوزیم دہلی کے ایک اہم قلمی نسخے پر تعارفی مضمون خدابخش لائبریری جرنل پٹنہ میں ان کی نظر سے گزرا تو ایک ملاقات میں مختارالدین احمد صاحب نے مجھ سے کہا کہ مشفق خواجہ صاحب کے پاس اس کا ایک مخطوطہ موجود ہے اور وہ اس کا عکس بھیجنے پر آمادہ ہیں۔ اگر نور الاسلام صاحب اسے اِڈِٹ کرکے شایع کرنا چاہتے ہوں، تو وہ عکس کراچی سے منگوادیں۔ میں نے کہا فوراً منگوادیجیے۔ مختارالدین صاحب نے اس نسخے کا عکس خواجہ صاحب سے منگواکر نور الاسلام صاحب کے حوالے کردیا۔ وہ اسے اِڈِٹ کررہے ہیں، اسے عنقریب شائع کریں گے۔

Marfat.com

ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب کی یاد داشت بھی غضب کی ہے۔ابھی حال میں میں نے ایک مقالہ ''بیاض شیر افگن'' کے عنوان سے لکھا، جو ابھی تک مکمل نہیں ہوا ہے۔ جب ان سے ذکر ہوا تو فرمانے لگے کہ اس بیاض پر میں پروفیسر سید حسن مرحوم سے ایک مقالہ لکھوا کر مجلۂ علوم اسلامیہ علی گڑھ میں شائع کر چکا ہوں۔ اس مضمون میں بیاض کے مندرج شعرا کی مکمل فہرست بھی شائع کر دی گئی ہے۔ ڈاکٹر مختار الدین احمد نے یہ اطلاع بھی دی کہ بیاض شیر افگن کا مکمل مقدمہ وہ عنقریب شائع کرنے والے ہیں۔چند دنوں کے بعد انھوں نے سید حسن مرحوم کے مضمون کا عکس بنوا کر بھیج دیا۔

پروفیسر مختار الدین احمد، جب اکتوبر ۱۹۵۳ء میں روکیفلر فاونڈیشن کی فیلو شپ پاکر اعلیٰ تعلیم کے لیے آکسفورڈ جانے لگے تو قاضی عبد الودود صاحب نے ان سے فرمایا۔ ''آپ انگلستان جا رہے ہیں، کسی تعطیل میں جرمنی جانا ہو تو برلن کے میوزیم میں فضلی کی ''دہ مجلس'' ضرور تلاش کریں جو شمالی ہند کی نثر میں سب سے قدیم کتاب سمجھی جاتی ہے اور جو سوا سو سال پہلے اشپرنگر اپنی کتابوں کے ساتھ کلکتہ سے جرمنی لے گیا تھا اور جو اب مدتوں سے مفقود ہے''۔ ڈاکٹر مختار الدین احمد کو تلاش بسیار کے بعد یہ نادر مخطوطہ برلن میں نہیں جرمنی کی ایک چھوٹی سی یونیورسٹی ٹیوبنگن میں جنوری ۱۹۵۵ میں مل گیا۔ انھوں نے اس دریافت کی خوش خبری قاضی عبد الودود صاحب اور مالک رام صاحب کے علاوہ قاضی عبد الغفار صاحب (سکریٹری انجمن ترقی اردو، ہند) اور رشید احمد صدیقی صاحب (صدر شعبۂ اردو علی گڑھ) کو بھی سنائی۔ مختار الدین صاحب جرمنی سے اس کا عکس اپنے ساتھ اپریل ۱۹۵۶ء میں لائے اور قاضی صاحب کے ایما پر انھوں نے اس کی تسوید و تبییض، تصحیح و تہذیب اور تعلیق و تحشیے کا کام شروع کر دیا۔ اب کوئی پان سو صفحہ کا مسودہ تیار ہو گیا تو اس کی اشاعت کی انھیں فکر ہوئی۔ نہ انجمن اس کی اشاعت پر آمادہ ہوئی نہ شعبۂ اردو کے پاس طباعت کے وسائل تھے۔ ایسے نازک وقت میں مالک رام صاحب جو ہر اچھے کام کے لیے آمادہ رہتے تھے اس کی اشاعت کے لیے تیار ہو گئے۔ مختار الدین احمد صاحب، قاضی عبد الودود صاحب، جناب مالک رام صاحب اور کبھی کبھی ڈاکٹر عبد الستار صدیقی سے مشورہ کرتے رہے تھے، اب کام جلد مکمل کرنے کے لیے انھیں مالک رام صاحب کا بھی ادبی تعاون حاصل ہو گیا اور انہی کی نگرانی میں دہلی میں یہ کتاب اشاعت پذیر ہوئی۔

ایک زمانہ تھا کہ مرحوم پروفیسر خواجہ احمد فاروقی اپنے کو ''ودودی'' کہتے تھے اور قاضی صاحب بھی ان کا بہت خیال رکھتے تھے۔لیکن ایک بات سے دونوں میں جو ڈرار پیدا ہوئی وہ بعد کو اور بڑھتی ہی گئی۔

Marfat.com

ہوا یہ کہ علی گڑھ تاریخ ادب اردو کے ایک جلسے میں پروفیسر مسعود حسن صاحب رضوی اور دوسرے مشاہیر کی موجودگی میں قدیم اردو نثر کا ذکر ہو رہا تھا جس پر مختار الدین احمد صاحب اور گیان چند صاحب کو ایک باب اس تاریخ کے لیے لکھنا تھا۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور اور پروفیسر نجیب اشرف ندوی نے کہا کہ قدیم ترین کتاب شمالی ہند کی ''دہ مجلس'' تو فنا ہے، اس کے بعد کی کتابوں پر لکھا جاسکتا ہے۔ مختار الدین صاحب اس جلسے میں موجود تھے انھوں نے کہا نہیں یہ کتاب فنا نہیں ایک جگہ موجود ہے۔ اس پر خواجہ احمد فاروقی صاحب نے پوچھا یہ کتاب کہاں ہے؟ وہ بولے ٹیوبنگن (جرمنی) کی لائبریری میں محفوظ ہے۔خواجہ صاحب، مختار الدین صاحب کی یورپ سے واپسی کے سال دو سال بعد یورپ گئے تو جرمنی کے دور دراز علاقے کی اس چھوٹی سی یونیورسٹی بھی پہنچے اور کربل کتھا کی مائیکرو فلم لے آئے اور دہلی پہنچ کر بڑی خاموشی سے اس کی اشاعت کی تیاری کرنے لگے۔ اپنے ایک ریسرچ اسکالر کو بھی وہ ایک ایک ورق نقل کرنے کے لیے دیتے تھے تاکہ کسی کو اس کتاب کا علم نہ ہو سکے۔ قاضی صاحب اس زمانے میں اکثر دہلی آتے جاتے رہتے تھے۔انھیں کسی طرح شعبۂ اردو کے کسی شخص سے پتا چلا کہ خواجہ صاحب یہ کتاب مرتب کررہے ہیں۔ قاضی صاحب نے ان سے جب بھی اس کے بارے میں پوچھا تو وہ ٹال گئے۔ انھوں نے بڑی خاموشی سے اس کتاب کا ایک حصہ چھپوا کر پنڈت نہرو کے ہاتھ اس کا افتتاح کرادیا۔ مقدمے میں انھوں نے اس بات کا ذکر تک نہیں کیا کہ انھیں کربل کتھا کے وجود کی اطلاع کس نے دی۔ اس حرکت پر قاضی صاحب ان سے بہت ناراض ہوئے اور ہمیشہ کے لیے ان سے انھوں نے کنارہ کشی اختیار کرلی۔ قاضی صاحب کہتے تھے کہ خواجہ صاحب کو معلوم تھا کہ مختار الدین صاحب برسوں سے اس کی ترتیب و تصحیح میں مصروف ہیں پھر بھی انھوں نے غیر علمی بات کی کہ جیسے تیسے جلد بازی سے کام لے کر انھوں نے اس کا ایک حصہ چھپوا دیا۔ مختار الدین احمد اور مالک رام کا مرتب کردہ اڈیشن، قاضی عبد الودود صاحب کے ادارۂ تحقیقات اردو پٹنہ سے ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا۔خواجہ صاحب کا مکمل اڈیشن اس کے کئی سال بعد شائع ہوا لیکن اسے قبول عام نصیب نہیں ہوا۔ ہندوستان پاکستان میں جو اڈیشن عام طور پر ملتا ہے وہ مختار الدین احمد، مالک رام ہی کا اڈیشن ہے اور اسی کو قبولیت عام حاصل ہے۔

مقام مسرت ہے کہ مختار الدین احمد صاحب کا دماغ شاداب، حافظہ مستحضر ہے اور اب بھی جب ان کی عمر ۸۰ سے متجاوز ہے وہ سرگرم عمل ہیں اور لکھنے پڑھنے مصروف ہیں ان کی صحت و عافیت کے لیے دعا گو ہوں۔

129371

Marfat.com

ڈاکٹر رفیع الدین

سابق صدر شعبۂ عربی و فارسی و اردو ناگپور، یونیورسٹی

پروفیسر ڈاکٹر مختار الدین احمد

پروفیسر ڈاکٹر مختار الدین احمد کا شمار علمی اعتبار سے ہندوستان کی مشہور و معروف شخصیتوں میں ہوتا ہے۔ آپ علوم اسلامیہ میں قدیم اور جدید کے درمیان ایک کڑی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ کا تعلق عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں سے ہے جن میں آپ کے علمی، ادبی اور تحقیقی و تنقیدی کارنامے ملتے ہیں۔ آپ کی ان خدمات کو بیان کرنے کے لیے ایک دفتر درکار ہے۔ یہاں میں اپنے بیان کے لیے ڈاکٹر صاحب کی شخصیت سے متعلق اپنے عمومی تاثرات بیان پر اکتفاء کرتا ہوں۔

اس میں شک نہیں کہ انسان کی زندگی میں قدرت الٰہی کی بے شمار نشانیاں ملتی ہیں، اگر انسان غور و فکر اور تدبر کی روشنی میں زندگی کے حالات کا جائزہ لے جب اسباب کے پردے اٹھ جاتے ہیں تو اس عالم اسباب کے پیچھے اسے ایک اور عالم نظر آتا ہے جس کے احوال اُس عالم سے جدا ہیں۔ انسان چاہتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ ہے اور وہی ہوتا ہے جس کا ہونا اس عالم غیب میں مقدر ہو جاتا ہے۔ یہاں مقدرات برملا نظر آنے لگتے ہیں۔ اب ہم اسی تناظر میں پروفیسر ڈاکٹر مختار الدین احمد کی زندگی کے حالات کا جائزہ لیں گے۔

ڈاکٹر صاحب اپنے وطن عظیم آباد سے مروجہ تعلیم اور علوم اسلامیہ کی تعلیم کی تکمیل کے بعد اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ تشریف لائے۔ یہاں آپ کو علامہ عبدالعزیز میمنی جیسی عظیم علمی و ادبی شخصیت سے فیض حاصل کرنے کا موقع ملا۔ اس کے بعد آپ نے مشہور انگریز مستشرق سر ھملٹن گب کی نگرانی میں آکسفورڈ یونیورسٹی کی ڈی۔فل کی ڈگری کے لیے کام کیا۔ انگلستان سے واپس آکر آپ نے اپنے شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی میں تدریس و تحقیق کا کام جاری رکھا۔ اسی شعبے میں آپ کو ساری ترقیاں ملیں اور یہیں سے کئی سال پروفیسر رہ کر وہ ریٹائر ہوئے۔ اس طرح موصوف کی ساری زندگی شعبۂ عربی کی خدمت میں گزری اور علی گڑھ سے ایسا لگاؤ پیدا ہوا کہ اسی کو اپنا وطن بنالیا۔ آپ نے عربی زبان و ادب اور علوم اسلامی سے ایسا تعلق جوڑ لیا کہ گھر کا سارا

Marfat.com

ماحول اسی رنگ رنگا میں گیا۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ لوگ اپنے بچوں کو ڈاکٹر یا انجینیر بنانا چاہتے ہیں مگر میں دیکھتا ہوں کہ آپ کے دو بیٹوں اور دو بیٹیوں میں سبھی نے عربی و اسلامیات کے شعبے سے رشتے جوڑے۔ چنانچہ آپ کے بڑے صاحبزادے طارق مختار نے عربی میں ام اے کیا تو اقبال احمد ملک نے اسلامیات میں۔ صاحبزادیوں میں بی بی یاسمین مختار اور بیافریدہ مختار دونوں نے ہائی اسکول، انٹر، بی اے میں عربی پڑھی اور عربی ہی میں ام۔اے کی ڈگری حاصل کی۔ گویا ان سبھوں نے اپنے اس جذبے کا عملی ثبوت بہم پہنچایا کہ

میراثِ پدر خواہی علم پدر آموز

یوں تو موصوف علمی و ادبی شہرت کی بنا پر آپ کو ہندوستان اور پاکستان میں سبھی علمی و ادبی حضرات جانتے ہیں اور ایک عرصے سے جانتے رہے ہیں، مگر مجھے شخصی طور پر آپ سے ملاقات کا شرف اس وقت حاصل ہوا جب کہ میں ۱۹۶۰ء میں استاذی پروفیسر ڈاکٹر عبدالعلیم صدیقی کا مہمان تھا۔ آپ سے موصوف کی کوٹھی پر ملاقات ہوئی اور یہ تعلق ایسا بڑھا کہ دو دلوں کا ملنا ثابت ہوا۔ پھر تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا ملاقاتوں کا دروازہ کھل گیا۔ ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں کے جلسوں میں بار بار ہمارا ساتھ رہا۔ مجھے موصوف سے ملاقات کا اشتیاق اُس وقت پیدا ہوا تھا جب کہ وہ تری پتی یونی ورسٹی میں عربی فارسی اور اردو کی مشترکہ پروفیسر شپ کی جائداد کے لیے امید واروں میں تھے اور میں بحیثیت اکسپرٹ شریک ہوا تھا۔ میٹنگ شروع ہونے سے پہلے ساری درخواستوں کا جائزہ لیا گیا جن میں آپ کے سوا اور کوئی امید وار اس جائداد کے قابل نہیں پایا گیا۔ اب امید واروں کا انٹرویو شروع ہوا، معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب موجود نہیں ہیں۔ وائس چانسلر صاحب نے فرمایا ہم تھوڑی دیر اور انتظار کرلیں گے، شاید کسی وجہ سے انہیں مدراس تک پہنچنے میں دیر ہوگئی ہو۔ کافی وقت گزر گیا اور آپ تشریف نہیں لائے تو سلکشن کمیٹی کو مایوسی ہوئی اور کسی کا تقرر نہیں ہوسکا۔ ڈاکٹر صاحب آجاتے تو تقرر ان کا طے تھا اس طرح ۱۹۶۰ہی میں وہ پروفیسر ہوجاتے لیکن انھیں مادر درسگاہ چھوڑنا گوارا نہ ہوا۔ میں نے اس کا ذکر استاذی پروفیسر ڈاکٹر عبدالعلیم مرحوم سے کیا جب آپ یونیورسٹی کے کام سے ناگپور تشریف لائے۔ موصوف نے مسکراتے ہوئے فرمایا آرزو صاحب علی گڑھ چھوڑ کر کہیں نہیں جائیں گے۔ یہی ایک ترقی کا موقع نہیں تھا جس سے آپ نے فائدہ نہیں اُٹھایا بلکہ ڈاکٹر صاحب کو کلکتہ اور الٰہ آباد کی جامعات میں ترقی کے مواقع حاصل ہوئے

Marfat.com

لیکن ان جامعات کی طرف وہ متوجہ نہیں ہوئے حالانکہ کلکتہ میں ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی اور الٰہ آباد میں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی بیحد خواہش مند تھے کہ جامعات میں ان کی چھوڑی ہوئی کرسی پر یہ بیٹھیں، لیکن دوسری جامعات کی پروفیسر شپ پر علی گڑھ کی ریڈر شپ کو انھوں نے ترجیح دی اور اپنی یونیورسٹی چھوڑ کر وہ کسی اور جگہ نہیں گئے۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا جو چیز انسان کے مقدر میں نہیں ہوتی اسباب کی موجودگی میں بھی وہ حاصل نہیں ہوتی۔ الٰہ آباد کا قصہ تو یہ ہوا کہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر لال صاحب نے ڈاکٹر عبدالستار صدیقی سے مل کر آپ کا تقرر گویا طے کرلیا تھا صرف دفتری کارروائی باقی تھی مگر جب وائس چانسلرز کانفرنس دہلی کے ایک جلسے میں مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر نواب علی یاور جنگ کو انھوں نے بتایا کہ ڈاکٹر احمد کو وہ الٰہ آباد بلا رہے ہیں تو موصوف نے اس بات کو پسند نہیں کیا کہ ڈاکٹر صاحب علی گڑھ سے چلے جائیں اور ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب کو بلا کر فرمایا ڈاکٹر احمد کو روکیے، میں ان کے لیے علی گڑھ میں U.G.C. سے پروفیسر کی ایک جائداد حاصل کرلوں گا۔ لیکن کچھ دنوں کے بعد طلبا کے ہنگامے کے نتیجے میں علی یاور جنگ مرحوم بددل ہوکر علی گڑھ سے کنارہ کش ہوکر رخصت ہوگئے۔ پھر جب ۱۹۶۸ء میں کلکتہ یونیورسٹی میں ڈاکٹر زبیر صدیقی کے ریٹائر منٹ پر آسوتوش پروفیسر شپ آف اسلامک کلچر پر کچھ رعایات کے ساتھ وہاں کے وائس چانسلر سین صاحب اور یونیورسٹی کی سنڈیکیٹ نے آپ کا تقرر منظور کرلیا اور رجسٹرار کی متعدد بار یاد دہانیاں آئیں کہ آپ آکر جلد از جلد پروفیسر شپ کا چارج لے لیں، تو پھر علی گڑھ کی محبت غالب آئی، اور آپ کا دل علی گڑھ چھوڑنے کے لیے کسی طرح راضی نہ ہوا آپ نے وائس چانسلر کو معذرت نامہ لکھ کر بھیج دیا۔ قضا و قدر کے فیصلے بھی کچھ اور تھے۔ چند ہی مہینوں کے بعد پروفیسر عبدالعلیم صاحب علی گڑھ کے وائس چانسلر ہوگئے اور ڈاکٹر مختارالدین احمد ان کی جگہ پر پہلے ادارۂ علوم اسلامیہ کے ڈائرکٹر اور پھر شعبۂ عربی کے پروفیسر اور صدر مقرر ہوگئے۔ لیکن کب کتنی مدت کے بعد؟ اگر آپ ترو پتی، یا الٰہ آباد یا کلکتہ بحیثیت پروفیسر تشریف لے جاتے تو برسوں پہلے پروفیسر ہوجاتے اور عرصے تک پروفیسر رہتے مگر علی گڑھ کی محبت یا شعبۂ عربی سے قلبی لگاؤ نے مقدر بن کر آپ کو علی گڑھ سے باہر نہیں جانے دیا۔ آپ کی عمر کا بیشتر حصہ علی گڑھ میں گزرا اور اب بھی یہیں گزر رہا ہے۔ تیس پینتیس سال آپ نے شعبہ کی خدمت کی اور یہیں اپنی ساری صلاحیتیں صرف کردیں۔ آپ بحیثیت ایک طالب علم کے ۱۹۴۳ میں

Marfat.com

علی گڑھ آئے، اب ۲۰۰۳ ہے، گویا (۶۰) سال سے آپ علی گڑھ میں فروکش ہیں، علمی و ادبی کاموں میں مصروف ہیں اور یہاں کے طلبا اور اساتذہ کو اپنے علمی فیوض سے مستفیض کررہے ہیں۔

ڈاکٹر مختار الدین احمد سے میری پہلی ملاقات علی گڑھ میں ۱۹۶۰ء میں ہوئی تھی۔ اس کے بعد موصوف سے ایسا پُرخلوص ربط قائم ہوا کہ علی گڑھ میرے لیے گھر آنگن بن گیا۔ بار بار آپ یونیورسٹی کے کسی نہ کسی کام سے مجھے علی گڑھ بلاتے رہے۔ اس وقت یونیورسٹی کا نیا مہمان خانہ تعمیر نہیں ہوا تھا اس لیے میں ہمیشہ آپ کا یا مکرمی پروفیسر نذیر احمد صاحب کا مہمان ہوتا رہا۔ اس قریبی ربط نے مجھے آپ کے گھریلو حالات کو بھی دیکھنے کا موقع دیا چنانچہ میں نے دیکھا کہ آپ کی علمی ادبی اور معاشرتی کاموں کو فروغ دینے میں آپ کی بیگم صاحبہ کا زبردست ہاتھ ہے اس معنی میں کہ انھوں نے آپ کو گھریلو فرائض سے آزاد کردیا ہے اور ساری فکروں کا بار خود اُٹھالیا ہے۔ اس طرح بیگم صاحبہ نے آپ کو سکون و عافیت سے یونیورسٹی کے فرائض کی ادائیگی اور علمی و ادبی کاموں کی انجام دہی کے لیے بہترین موقع فراہم کیے۔

ہماری معاشرتی زندگی میں عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ بیویاں تو سبھی خدمت گزار ہوتی ہیں اور اپنی سلیقہ مندی سے گھر کو سنوارتی ہیں مگر شوہروں میں عملی طور پر بیوی کے لیے احسان مندی کا جذبہ کم پایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی ازدواجی زندگی کے معاملے میں میں نے جہاں بیگم صاحبہ کو ایک مثالی بیوی پایا وہاں ڈاکٹر صاحب کو بھی بیوی کی قدردانی میں ایک مثالی شوہر کے روپ میں دیکھا، آپ کا حسن سلوک اور رفت و رحمت کا رویّہ جو بیگم صاحبہ کے ساتھ ہے وہ کم شوہروں میں دیکھا گیا۔ ڈاکٹر صاحب کو میں نے خلیق، متواضع، بردبار اور حلیم پایا، انھیں کبھی غصے کی حالت میں نہیں پایا، نہ کسی پر ناراض ہوتے ہوئے انہیں دیکھا۔ ڈاکٹر صاحب کے احباب کا حلقہ نہایت وسیع ہے اور اسی مناسبت سے آپ کے جذبۂ مہمان نوازی کی تسکین کے لیے گھر میں دسترخوان بھی وسیع ہے جس کے کھانوں کی لذت وہی جانتے ہیں جنہوں نے ان سے فائدہ اٹھایا ہے۔

سادگی اور خاکساری کا یہ عالم ہے کہ ان کے رویہ میں کبھی علمی برتری کا اظہار نہیں پایا گیا۔ بارہا پی ایچ۔ ڈی کے زبانی امتحان کے موقع پر عاجز بھی موصوف کے ساتھ رہا مگر جب رپورٹ لکھنے کا موقع آیا تو کاغذ میری طرف بڑھادیا کہ آپ سینیر ہیں اور رپورٹ اس

Marfat.com

وقت تک نہیں لکھی جب تک میری طرف سے اصرار نہ ہوا۔ سلکشن کمیٹی کی میٹنگ میں بھی وہ مجھ سے رائے پہلے پوچھتے تھے اور ہمیشہ میری رایوں کا احترام کرتے تھے۔

ناگواریوں کو برداشت کرنا اور بڑے نقصان کے جواب میں صبر وسکون سے کام لینا ڈاکٹر صاحب کا بڑا وصف ہے جسے حضرت شاہ ولی اللہؒ نے سماحت قرار دیا ہے اور اسے فطرت انسانی کی چار بنیادی صفات میں شامل کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو کبھی کسی سے کسی معاملے میں اختلاف بھی ہوا تو موصوف کی یہی کوشش رہی کہ یہ اختلاف باہمی تعلقات پر اثر انداز نہ ہو اور خوش دلی کی فضا قائم رہے۔

جب میں ڈاکٹر صاحب کی متانت، سنجیدگی، حلم و برد باری، مروت اور صبر و سکون کو دیکھتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ یا اللہ تو نے اپنے اس بندے کو کتنی صفاتِ حسنہ سے نوازا ہے۔ یہ ہیں وہ صفات جن سے موصوف کی شخصیت کی تعمیر ہوئی ہے۔

مختار الدین احمد کا مسلک صلحِ کل ہے۔ یہی وہ سبق ہے جو میں نے اپنے استاد علامۂ جلیل مولانا سید سلیمان اشرفؒ کی صحبت میں چھ سال رہ کر سیکھا ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے ڈاکٹر صاحب کا تعلق شعبۂ عربی سے نہایت قدیم ہے اور ان کے معاصرین میں کوئی ایسا نہیں ہے جو شعبہ کے حالات موصوف سے زیادہ جانتا ہو۔ آپ کی اعلیٰ تعلیم یہیں ہوئی، پھر استاد بن کر یہیں رہے۔ یہیں ترقی کے سارے زینے طے کیے اور آخر پروفیسر اور صدر شعبہ بن کر ریٹائر ہوئے۔ اس عرصے میں شعبۂ عربی نے آپ کو ایسا گرویدہ کرلیا تھا کہ اسے چھوڑ کر کہیں جانا آپ نے پسند نہیں کیا حالانکہ آپ کو ترقی کے متعدد اور بہترین مواقع ملے۔

میں نے علی گڑھ کے شعبۂ عربی کے تین دور دیکھے ہیں، ایک تو استاذی المحترم العلامۃ الجلیل عبدالعزیز المیمنی کا دور ہے۔ دوسرا استاذی المحترم ڈاکٹر عبدالعلیم صدیقی کا ہے جو ہر طرح شعبے کے لیے مبارک ثابت ہوا اور اسی دور میں اس کی ترقی کا آغاز ہوا۔ اب جو تیسرا دور آیا اس کا تعلق پروفیسر ڈاکٹر مختار الدین احمد سے ہے جن کی پہلو دار شخصیت نے اپنے رفقاء کے تعاون سے شعبے کی ترقی کی رفتار تیز تر کردی۔

ڈاکٹر صاحب نے جہاں العلامۃ الاستاذ الجلیل المیمنی کی صحبت سے فائدہ اٹھایا وہیں آکسفورڈ یونی ورسٹی میں Sir Hamilton Gibb جیسے مشہور مستشرق کی صحبت میں رہ کر نئی بصیرت حاصل کی۔ گویا آپ قدیم اور جدید کے درمیان ایک کڑی بن کر شعبہ میں

Marfat.com

رہے اور اسی کی خدمت میں اپنا قیمتی وقت گزارا۔ میرے پاس اعداد وشمار نہیں ہیں کہ میں ایک ایک کر کے شعبے کی ترقیوں کو گناؤں البتہ میں اپنے مشاہدے کی بناء پر یہ ضرور کہوں گا کہ اب بی اے، ام اے کے طلباء اور ریسرچ اسکالروں کی تعداد میں جو زبردست اضافہ ہوا ہے وہ اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا گیا۔ ہندوستان کے گوشے گوشے سے طلباء جوق در جوق عربی تعلیم اور ریسرچ کے لیے جمع ہونے لگے ہیں اور ام اے کی سطح پر تو خانگی طلباء کی تعداد اتنی بڑھی ہے کہ زبانی امتحان لینے میں کبھی دو تین دن صرف ہوجاتے ہیں۔ اس کے علاوہ تحقیقی کام کرنے والوں کا آئے دن اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ خود ڈاکٹر مختار الدین احمد کی نگرانی میں چالیس سے زیادہ امید واروں نے تحقیقی مقالے لکھے اور انھیں ام اے۔ ام فل اور پی ایچ۔ ڈی کی ڈگریاں تفویض ہوئیں۔

اس طرح تحقیقی کام کی رفتار تیز سے تیز تر ہونی جارہی ہے غیر ممالک سے بھی یہاں ریسرچ کے لیے طلبا آنے لگے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی نگرانی میں کام کرنے کے لیے ڈھاکا، تہران، مشہد، اصفہان، بغداد، دمشق وغیرہ سے درخواستیں آتی رہتی ہیں۔ متعدد اسکالرز یہاں علی گڑھ آئے، آپ کی اور شعبے کے دوسرے اساتذہ کی نگرانی میں کام کیا اور وہ ڈاکٹریٹ لے کر یہاں سے واپس ہوئے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ ڈاکٹر صاحب کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ جناب سید حامد صاحب سابق وائس چانسلر کے دور میں علوم شرقیہ کے امتحانات پاس کرنے والوں کے لیے ام۔ اے میں داخلے کے لیے دروازے کھول دیے گئے۔

یہ ہے شعبۂ عربی کی ترقی کی مختصر کیفیت جو یہاں بیان کی گئی۔ جہاں تک تصنیف و تالیف کا سوال ہے وہ اس شعبہ کی ترقی کا نیا باب ہے۔ اس خصوص میں بھی ڈاکٹر صاحب کی خدمات منفرد ہیں اور اسی وجہ سے علامہ المیمنی کے شاگردوں میں آپ کا مقام منفرد ہے کیونکہ علامہ کے جتنے بھی شاگرد ہیں وہ موصوف سے فیض یافتہ ضرور ہیں مگر ان میں تاحال ایک بھی ایسا نہیں ہے جس نے استاد کے احسان اور شفقت و محبت کا بدلہ اس درجے میں دیا ہو جس درجے کے استاد گرامی مستحق تھے سوائے ان کے شاگرد رشید ڈاکٹر مختار الدین احمد کے جنہوں نے اپنے استاد کی عظمت کو یاد دلانے، نئی نسل کو ان سے روشناس کرنے کے لیے مجلة المجمع العلمي الهندي کا ہزار صفحوں میں خاص المیمنی نمبر شائع کر کے یہ سعادت حاصل کی۔ اس کے لیے ڈاکٹر صاحب نے ان تھک

Marfat.com

محنت کی اور وہ کام کیا جو ہندوستان پاکستان میں کسی اور سے نہ ہوسکا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ ایسا کام ہے جس کے لیے دنیائے اسلام اور خصوصیت سے دنیائے عرب آپ کی ممنون احسان ہے۔ مجھے اس تعلق سے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے مشہور و معروف پروفیسر ڈاکٹر ہادی حسن کی وہ تقریر یاد آتی ہے جو آپ نے فردوسی کے جشن میں شرکت کے بعد ایران سے واپس آ کر کی تھی۔ آپ نے فرمایا تھا "میں نے شاہ ایران اعلحضرت رضا شاہ پہلوی کو مخاطب کر کے کہا" اس میں شک نہیں کہ فردوسی نے ایران کو زندہ کیا مگر یہ حقیقت بھی اظہر من الشمس ہے کہ آپ نے فردوسی کو زندہ کیا اور بھولی ہوئی عظیم شخصیت سے دنیا کو روشناس کرایا۔ یہی قول علامہ المیمنی پر شائع ہونے والے مجلۃ المجمع العلمی الھندی کے العدد الممتاز عن العلامۃ الاستاذ المیمنی پر صادق آتا ہے کہ ڈاکٹر مختار الدین احمد نے اپنے استاد کے حالات وکوائف اور ان کے آثار و تصانیف پر گراں قدر قیمتی مقالات عرب و عجم کے مشاہیر سے لکھوا کر انھیں مرتب کر کے کتابی شکل میں محفوظ کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ عظیم کارنامہ کبھی بھلایا نہیں جاسکتا جس کے لیے دنیائے علم و ادب موصوف کی ممنون احسان ہے۔

شعبۂ عربی کے اساتذہ کے تعلق سے ہم دیکھتے ہیں کہ پہلے یہاں شعبہ میں پروفیسر اور صدر شعبہ صرف یورپ کا مستشرق ہی ہوا کرتا تھا اور یہ سلسلہ میری طالب علمی کے عہد ۱۹۳۶ تک جاری رہا۔ جب جرمن مستشرق ڈاکٹر آٹو اشپیز یہاں سے چلے گئے تو ان کی جگہ شعبے کے صدر علامہ المیمنی مقرر ہوئے مگر ان کو پروفیسری کا درجہ افسوس ہے بہت بعد کو ملا۔ البتہ ڈاکٹر عبد العلیم اور ان کے بعد ڈاکٹر مختار الدین احمد دونوں اس عہدے پر بہت دیر تک فائز رہے اور پروفیسر اور صدر شعبہ کی حیثیت سے کئی سال تک مفید خدمات انجام دیتے رہے۔ جہاں تک مجھے یاد آتا ہے استاذی ڈاکٹر عبد العلیم صاحب ۱۳ سال تک شعبے کے پروفیسر اور ۱۷ سال تک صدر شعبہ رہے، ان کے بعد ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب نے ان کی نیابت کی۔ وہ ۱۷ سال (۱۱ رمئی ۱۹۶۸۔۱۴ نومبر ۱۹۸۴) تک صدر شعبہ رہے اور تقریباً ۳۴ سال (۱۹۵۳۔۱۹۸۷) تک اس شعبے میں استاد کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے۔ شعبے کی تاریخ میں ایم اے او کالج سے اب تک شعبۂ عربی کے کسی استاد کو اتنی طویل مدت تک خدمت کا موقع نہیں ملا۔

Marfat.com

شعبۂ عربی کی خدمت کی صلاحیت کے لیے محض زبان و ادب کا جان لینا کافی نہیں ہے اگر چہ یہ ایک بنیادی ضرورت ہے، اس کی گونا گوں خدمات کے لیے ایک ایسی پہلو دار شخصیت کی ضرورت ہے جو علم و ادب سے گہری واقفیت کے علاوہ انتظامی صلاحیت کا بھی مالک ہو۔ خوش قسمتی سے اس کام کے لیے شعبہ کو پروفیسر ڈاکٹر مختار الدین احمد کی خدمات حاصل ہوئیں جو نہ صرف اس کے اہل تھے بلکہ وہ اپنی اس صلاحیت کو خوب پہچانتے تھے اس کے علاوہ وہ اپنی اس قابلیت کو صحیح طور پر برتنے کا فن بھی جانتے تھے۔ پروفیسر ڈاکٹر عبدالعلیم صدیقی کو آپ کی ان گونا گوں صلاحیتوں پر کامل اعتماد تھا۔ شعبے کے معاملات میں باوجود وائس چانسلر ہونے کے انہوں نے کبھی اپنی مرضی کو دخل انداز نہیں ہونے دیا۔ انہوں نے ہمیشہ اس خصوص میں اپنی رائے پر صدر شعبہ کی رائے کو ترجیح دی۔ یہ ضرور ہے کہ اس میں ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب کی فراخ دلی کا بھی ثبوت ملتا ہے مگر اس کے ساتھ یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وائس چانسلر کو ڈاکٹر مختار الدین احمد کی صلاحیت پر کتنا زبردست اعتماد تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی فراست کی بڑی دلیل یہ ہے کہ انہوں نے اپنے اطراف ایسے اساتذہ جمع کرنے کی کوشش کی جو شعبے کے کاموں میں بجا طور پر ان کے معین و مددگار ہوں۔ علامہ ایمنی کی طرح آپ نے بھی اپنے باصلاحیت شاگردوں کو آگے بڑھانے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا۔ ان کی کوشش ہمیشہ یہی رہی کہ کسی طرح ان کے شرکائے کار ان سے خوش رہیں اور شعبے میں خلوص و محبت کا ماحول قائم رہے۔ آج ہم جو شعبۂ عربی میں یک دلی، محبت اور خلوص کا ماحول دیکھتے ہیں شاید وہ موصوف ہی کی چھوڑی ہوئی روایت ہے۔

یہ ہیں محترم ڈاکٹر مختار الدین احمد کی شخصیت سے متعلق اس عاجز کے کچھ تأثرات جو مختصراً بیان میں آئے۔ جانتا ہوں کہ بیان کا حق ادا نہ ہوسکا مگر اتنا تو ضرور ہوا کہ جو ماضی تھا حال بن کر سامنے آ گیا اور پرانی یادیں تازہ ہوگئیں۔ خوش بخت ہیں وہ نفوس جن کو اس زندگی میں کچھ نہ کچھ کرنے کا موقع مل گیا مگر اس سے بڑھ کر خوش نصیبی اور کیا ہوگی کہ ساری عمر عربی زبان و ادب کی خدمت میں گزر جائے۔ یہ ہے وہ سعادت جو بارگاہ ایزدی سے ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب کو عطا ہوئی ہے۔

☆☆☆

Marfat.com

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ

سابق وزیر تعلیمات حکومتِ سندھ، کراچی

میرے عزیز استاد بھائی

(ڈاکٹر مختار الدین احمد)

ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو صاحب میرے محسن و کرم فرما ہیں۔ مجھے یہ بھی شرف حاصل ہے کہ میں ان کے استاذ محترم پروفیسر علامہ عبد العزیز المیمنی کا شاگرد ہوں۔ البتہ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے طلبہ کی اصطلاح میں، میں ان کا سینیر ہوں، اس لیے کہ میں ۱۹۴۱ء میں علی گڑھ آیا اور شعبۂ عربی کے ایم، اے کلاس میں داخل ہوا اور آرزو صاحب ۱۹۴۳ء میں آئے اور انھوں نے انٹرمیڈیٹ میں داخلہ لیا۔ تاہم سینیر، علی گڑھ میں عرصۂ دراز گزارنے کے اعتبار سے سینیر ہوا کرتے تھے نہ کہ علم و فضل کے اعتبار سے، الا ماشاء اللہ۔ عربی دانی کے اعتبار سے آرزو صاحب حقیقی معنی میں عربی زبان کے عالم ہیں اور میں محض اتنی صلاحیت کا حامل ہوں کہ عربی مآخذ تک پہنچ سکوں اور مطلوبہ عبارت سمجھ سکوں۔ پی ایچ، ڈی کے لیے میرا منتخب موضوع تاریخی نوعیت کا تھا یعنی "السند تحت سیطرۃ العرب" جس کی وجہ سے مجھے عربی زبان اور ادب میں تخصص کا موقع نہ مل سکا۔ آرزو صاحب نے تاریخ کے بجائے اپنا تحقیقی موضوع عربی ادب منتخب کیا اور ساتویں صدی ہجری کے ادیب صدر الدین علی بن ابی الفرج البصری کے مرتب کردہ شعری مجموعہ الحماسة البصرية، کی تصحیح و تہذیب اور اس پر قابل تحسین کام کر کے ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے ساتھ ساتھ عربی زبان و ادب میں اعلیٰ درجے کی صلاحیت حاصل کر لی۔

دو آخری سال (نصف ۱۹۴۳ تا نصف ۱۹۴۵ء) جب میں مسلم یونیورسٹی میں تھا آرزو صاحب بھی وہاں تھے لیکن کبھی ان سے ملاقات کا موقع نہ ملا۔ مجھے ان سے ملنے کا اتفاق پندرہ سال گذرنے کے بعد ۱۹۶۰ء میں علی گڑھ میں ہوا، جب میں پاکستانی وفد میں انڈیا، پاکستان کلچرل کانفرنس میں شرکت کے لیے دہلی گیا۔ ایک دن فارغ ملا جس کو غنیمت جان کر میں وہاں سے مادر علمی کی زیارت کے لیے علی گڑھ پہنچا۔ استاذ المیمنی تو علی گڑھ چھوڑ چکے تھے لیکن میں شعبۂ عربی میں گیا اور ڈاکٹر عبد العلیم صاحب صدر شعبہ سے ملا۔ آرزو صاحب بھی شعبے میں تشریف رکھتے تھے، اور ان سے پہلی ملاقات وہیں ہوئی۔ یہ جان کر مسرت ہوئی کہ وہ استاذ المیمنی کے تلمیذ رشید ہیں اور میرے استاد بھائی ہیں۔ تھوڑا

Marfat.com

سا فراغت کا جو وقت تھا آرزو صاحب کی ہی صحبت میں گذرا اور مجھے ان کی بے شمار کامیابیوں کا علم ہوا۔ ۱۹۵۲ء میں انھوں نے استاذ میمنی کی رہنمائی میں پی، ایچ ڈی کی ڈگری لی اور سر ہملٹن گب کی نگرانی میں ۱۹۵۶ء میں انھوں نے آکسفورڈ یونیورسٹی سے ڈی۔فل کیا، اور ۱۹۵۸ء میں مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اسلامک اسٹڈیز میں ریڈر ہوئے۔ اس مختصر صحبت میں انھوں نے اپنی تواضع ومحبت سے مجھے اپنا گرویدہ بنالیا۔

مختارالدین احمد صاحبؒ سے بعد میں ملاقاتیں تب ہوئیں جب وہ پاکستان تشریف لائے۔ پہلی بار جب وہ کراچی آئے تو وہاں سے چالیس میل دور بنبھور کے مقام پر سندھ کے تاریخی شہر و بندرگاہ ''دیبل'' کے محل وقوع، پر سیمنار میں تشریف لائے اور ان سے مل کر بیحد خوشی ہوئی لیکن اس موقع پر میں ان کی کوئی خدمت نہ کرسکا۔دوسری بار ۱۹۸۴ء میں شرق اوسط کا علمی سفر کرتے ہوئے اسلام آباد آئے اور میری دعوت قبول فرما کر میرے غریب خانے پر تشریف لائے اور ہم نے رات دیر تک بیٹھ کر علی گڑھ اور اپنے استاذ میمن صاحب مرحوم کے علم وفضل پر باتیں کیں۔ میرے پاس میمن صاحب کے سلسلے میں کچھ یادداشتیں تھیں جو آرزو صاحب کو پیش کیں۔ اس کے بعد ۱۹۸۹ء میں وہ شرق اردن سے اسلام آباد تشریف لائے اور کرم فرما کر ہجرہ کونسل کے دفتر میں مجھ سے ملنے آئے۔ ہمارے سکریٹری ڈاکٹر محمد معزالدینؒ نے ان کے اعزاز میں ان کی دعوت کی اور میں دیر تک آرزو صاحب کے علم وفضل سے استفادہ کرتا رہا۔اس دعوت میں ڈاکٹر جمیل جالبی اور ڈاکٹر قدرت اللہ فاطمی بھی مدعو تھے یہ اچھی علمی صحبت رہی۔ اس کے بعد وہ ۱۹۹۳ء میں کراچی کی ایک علمی کانفرنس میں مہمان خصوصی بن کر تشریف لائے جب کہ میں اسلام آباد چھوڑ چکا تھا اور کراچی میں صوبائی نگران حکومت میں تعلیم کا وزیر تھا۔ حکیم محمد سعید مرحوم ہمارے گورنر تھے۔ ۱۰ راگست کو حضرت شاہ عبداللطیف کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کیے ایک مجلس منعقد ہوئی اور میری گذارش پر حکیم صاحب نے اس جلسے کی صدارت فرمائی۔ آرزو صاحب بھی اس محفل میں تشریف لائے اور ان سے مل کر ہم لوگوں کو بے حد مسرت ہوئی۔ وہ ادارہ ''نیپا'' میں مقیم تھے جہاں پر جا کر میں ان سے ملنے والا تھا لیکن اس دن وزارت میں کسی اہم میٹنگ کی وجہ سے وعدہ پورا نہ کرسکا جس کا مجھے ابھی تک افسوس ہے۔ خیال تھا کہ میں اس کی تلافی اس طرح کروں گا کہ علی گڑھ جا کر آرزو صاحب سے ملوں گا اور ان سے معافی مانگ لونگا۔

ابھی تک مجھے اس سفر کے اختیار کرنے کی تمنا باقی ہے تا کہ آرزو صاحب اور

Marfat.com

وہاں کے دوسرے فضلاء خصوصاً ڈاکٹر نذیر احمد صاحب سے ملوں اور مادرِ علمی کی بھی زیارت کرلوں۔ واللہ یجمع بیننا وبینکم ان شاء اللہ۔

۱۹۹۳ء میں آرزو صاحب سے کراچی میں آخری ملاقات ہوئی مگر بعد میں بھی غائبانہ طور ان کے علم وفضل کی کرنیں یہاں حیدرآباد سندھ تک ہماری علمی محفلوں کو روشن کرتی رہیں۔ اس کا سہرا ہمارے محبوب معاصر ڈاکٹر نجم الاسلام (مرحوم) کے سر پر رہا۔ انھوں نے شعبہ اردو سندھ یونی ورسٹی سے ایک مثالی مجلّہ اسم بامسمیٰ ''تحقیق'' کا اجرا کیا جس میں ملک بھر کے محققوں کے مضامین شایع ہونے لگے۔ علی گڑھ کے ناطے، ڈاکٹر مختار الدین احمد اور ڈاکٹر نذیر احمد کی فاضلانہ تحاریر دیکھ کر مجھے دلی مسرت ہوئی۔ ۱۹۹۴ء کے شمارے میں دونوں کے عالمانہ خطوط بنام ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں چھپے جو بڑی دلچسپی سے پڑھے گئے۔ اس شمارے میں آرزو صاحب کا مضمون بعنوان ''مآثر غالب'' شایع ہوا اور ایک نیا مآخذ سامنے آیا۔ بعد کے شماروں (۸۔۹ اور ۱۳۔۱۴) میں ان کا پیش کیا ہوا مزید علمی مواد شامل تھا جس سے میرے علم میں اضافہ ہوا۔ ڈاکٹر نجم الاسلام مرحوم کے ایما پر آرزو صاحب نے کمالِ مہربانی فرما کر شمارہ ۱۰۔۱۱ کے 'گوشۂ بلوچ' کے لیے مجھ پر اور میری حقیر علمی کوششوں پر بہت پُر معلومات مقالہ لکھا۔ شمارہ ۱۲۔۱۳ میں ڈاکٹر نجم الاسلام مرحوم نے 'گوشۂ مختار الدین احمد' شائع کیا جس سے آرزو صاحب کے بہت سے محاسن سامنے آئے۔ آرزو صاحب اور راقم کے درمیان حقیقی معنوں میں صلۃ الوصل ہمارے استاد مکرم المیمنی ہیں ہم نے ان کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی اور بھائی آرزو سبقت لے گئے۔ وہ عربی ادب میں استاذ مرحوم کے صحیح معنوں میں جانشین ہیں اور میں کسی حد تک خوشہ چین۔ یہ آرزو صاحب کی ہمت عالی ہے کہ ۱۹۷۶ سے مجلة المجمع العلمی (دمشق) کا ہم پلہ مجلة المجمع العلمی الهندی علی گڑھ سے انھوں نے اپنی ادارت میں شائع کرنا شروع کیا۔ جس کے دو شماروں میں انھوں نے استاذ محترم کی سوانح وعلمی فتوحات کو تفصیل سے شایع کر کے استاد کو کماحقہ اپنا خراج عقیدت پیش کیا۔

کچھ دن ہوئے جناب فخرالدین علی احمد مرحوم کے قائم کردہ غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی سے اس ادارے کے نائب صدر ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کا مراسلہ پہنچا کہ میں آرزو صاحب کے بارے میں اپنے کچھ تأثرات قلم بند کر کے بھیج دوں، ان کے حکم کی تعمیل میں قلم برداشتہ یہ دو صفحے لکھ دیے ہیں کہ جو کتاب برادر گرامی اور میرے خواجہ تاش پروفیسر مختارالدین احمد کو بھارت کے علماء وادبا پیش کر رہے ہیں اس میں اس دور افتادہ کی بھی شرکت ہوجائے۔

☆☆☆

Marfat.com

پروفیسر مسعود حسین

سابق وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

پروفیسر مختار الدین احمد آرزو

نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو

مجھے قطعی یاد نہیں تھا کہ مختار الدین احمد صاحب سے دیارِ سرسید میں میری پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی تھی۔ دورانِ گفتگو 'حال میں' انھوں نے مجھے بتایا کہ یہ واقعہ ۱۹۴۳ء کا ہے جب میں شعبۂ اردو میں لکچرر کی حیثیت سے کام کررہا تھا، ساتھ ہی ساتھ پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری کے لیے تیاری بھی۔ میرا قیام امین ہاسٹل میں ریزیڈنٹ وارڈن کی حیثیت سے تھا۔ یہ ہوسٹل نوتعمیر شدہ تھا، لیکن خستہ حال تھا اور وارڈن کے لیے ایک وِنگ کے صرف تین کمرے مختص تھے۔ ان میں سے دو کمرے 'صرف خاص' کے لیے اور ایک کمرے میں میرا مختصر سا باورچی خانہ تھا جس میں میرے ملازم کی رہائش بھی تھی۔ ملازم میرا ہم وطن تھا، بڑا کاری گر انسان جو پکانا اور کھانا خوب جانتا تھا۔ چائے پینے اور پلانے میں مہارتِ تامہ رکھتا تھا، چنانچہ آنے والوں میں میرے یہاں کی چائے مشہور تھی۔ مختارالدین صاحب کا کہنا ہے کہ وہ آکر اکثر اس چائے سے لطف اندوز ہوتے تھے، اور یہیں سے میرے ان کے تعلقات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ اس وقت (اور اب تک) میرے لیے وہ صرف آرزو تھے یعنی اپنے تخلص سے جانے جاتے تھے۔ ملاقاتوں کا یہ سلسلہ انجینیرنگ کالج کوارٹر نمبر۴ تک جاری رہا جہاں اچانک شادی کرنے کے بعد میں ۱۹۴۸ء کے اوائل میں منتقل ہوگیا تھا۔ پاس ہی کے کوارٹر میں اختر انصاری اپنے میوزیم نما ڈرائنگ روم کے ساتھ رہتے تھے، کبھی کبھی ہماری ان کی بیٹھک یہاں بھی ہوجاتی تھی۔ بیشتر وقت ان کے تبسم زیرلب دیکھنے میں گزر جاتا، باقی بقول جگر ''نقش و نگار پردہ در'' کو دیکھنے میں۔

آرزو صاحب سے ملاقات کا دوسرا اڈا مسلم یونیورسٹی کا شعبۂ اردو تھا جہاں پروفیسر رشید احمد صدیقی کی ذات حلقہ گیر تھی۔ وہ خود ایک مینڈک چیر پر دراز رہتے۔ درمیان میں ایک فل سائز آفس ٹیبل تھی جو عام طور پر ظہیرالدین علوی مرحوم کی داب میں

Marfat.com

رہتی ۔ چاروں دیواروں سے لگی ہوئی مزید مینڈک چیرز دیگر اساتذہ کے لیے رکھی رہتیں جس پر بلاتخصیص ہم لوگ براجمان رہتے۔ جس کسی کو مرشد (رشید احمد صدیقی صاحب) کے ساتھ کوئی خاص بات کرنی ہوتی وہ ان کے پاس رکھی ہوئی فالتو کرسی پر جا بیٹھتا، اور وہاں سے ان کے فقروں کی تاب نہ لا کر بہت جلد کرسی خالی کر دیتا۔ میں نے اکثر آرزو صاحب کو نیاز مندانہ انداز میں رشید صاحب کے پاس بیٹھے دیکھا، کہ رشید صاحب ہی باہر سے آنے والوں کا ہدف رہتے تھے ۔ شعبۂ اردو میں اُس دن چہل پہل ہوتی تھی جب باہر سے کوئی ادیب یا شاعر آتا یا کسی موضوع پر کوئی سیمنار منعقد ہوتا یا شعبہ کی دو انجمنوں اردوئے معلیٰ یا حدیقۃ الشعر کا جلسہ ہوتا۔ اِن اجتماعات میں آرزو صاحب اکثر نظر آتے۔ لیکن چوں کہ اسوقت تک شاعری سے تائب ہو چکے تھے (ایسے کہ کم از کم مجھے اسوقت تک یہ علم بھی نہ تھا کہ وہ شاعر رہ چکے ہیں) ہاں ان کا تخلص آرزو ان کے نام کے ساتھ اس طرح چپکا ہوا تھا کہ بہت کم لوگوں کو معلوم تھا کہ وہ دراصل مختار الدین احمد ہیں۔ آرزو تخلص میرے لیے خاص کشش کا باعث تھا۔ اس قدر پسند تھا کہ ۱۹۴۳ء کے قریب میں نے جب شاعری شروع کی ہر کوئی ہم پیشہ و ہمدم میری توجہ اس طرف مبذول کر دیتا تو میں سپاٹ نام مسعود پر (جو اکثر ارکان) پر ٹھیک بیٹھتا بھی نہیں ہے) ''آرزو'' کو یقیناً ترجیح دیتا۔ البتہ آرزو کا تخلص مجھے نامور محقق اور استاد شاعر سراج الدین علی خاں کے نام کے ساتھ ہمیشہ اوٹ پٹانگ سا لگا۔ تاریخ شعر میں آگے بڑھ کر اس کی تلافی آرزو لکھنوی نے کر دی، اس لیے کہ وہ آرزوئے مجسم تھے اور کیا بحیثیت غزل گو یا بحیثیت گیت نگار، لکھنوی دبستان کے ایک باکمال شاعر تھے۔

کس نے بھیگے ہوئے بالوں سے یہ جھٹکا پانی جھوم کے آئی گھٹا، ٹوٹ کے برسا پانی

آرزو صاحب پر جب ناقدانہ نظر ڈالی تو وہ سراج الدین علی خاں کے قریب معلوم ہوئے سخن ور کم اور سخن داں زیادہ۔ شاعر کم (سابق شاعر) اور محقق زیادہ۔ اسی لیے میں نے انھیں گرم جستجو لکھا ہے۔

علی گڑھ میں پیر جماتے ہی ان کی شخصیت کا یہ پہلو نمایاں ہونے لگا۔ اور بہت جلد وہ محقق کی حیثیت کے پہچانے جانے لگے۔ خاص طور پر جب علی گڑھ میگزین کے ایڈیٹر کی حیثیت انھوں نے اس کا ایک معیاری شمارہ جو بہت قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا اور پھر غالب پر خصوصی شمارہ جو ۴۹۔۴۸ میں شائع ہوا تو ہم سب کی توجہ اُن کی محققانہ دیدہ ریزی اور مؤلفانہ صلاحیت کی جانب اٹھنے لگی اور سب نے پروفیسر رشید احمد صدیقی (جو

Marfat.com

میگزین کے نگراں تھے) کی نظر انتخاب کی داد دی ۔ یوں تو آرزو صاحب علم دوستی ورثے میں لائے تھے اور اپنے والد ماجد مولانا ظفرالدین صاحب قادری کی کڑی تربیت اور مدرسۂ اسلامیہ شمس الہدیٰ کے اساتذہ کی شفقت نے انھیں عربی اور اسلامیات سے کما حقہ واقف کرادیا تھا لیکن اردو میں تحقیق اور جستجو کا چسکہ انھیں علی گڑھ آ کر پڑا اور پھر علی گڑھ میگزین کے ''غالب نمبر'' اور پھر'' اجوال غالب'' (۱۹۵۲ء) اور نقد غالب (۱۹۵۶ء) نے ان کی مؤلفانہ اور محققانہ صلاحیتوں کو مستحکم بنادیا ۔ چنانچہ جب وہ (۱۹۵۳ء) میں راک فیلر فاونڈیشن کی ایک فیلوشپ پر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے آکسفورڈ یونیورسٹی کے لیے عازم سفر ہوئے تو وہ علیگڑھ کے اردو حلقوں کی ایک جانی مانی شخصیت تھے ۔ میں نے اس شخصیت کو سنجیدگی کے ساتھ اسی زمانے میں سمجھا ، مگر افسوس کہ ۱۹۵۰ء میں خود تعلیمی رخصت لے کر دیار فرنگ جانکلا پہلے لندن اور بعد کو پیرس جہاں سے بالآخر میں نے تحقیق کی اعلیٰ سند حاصل کی۔ اس زمانے میں آرزو صاحب سے میں بے تعلق رہا ۔ اسوقت آرزو صاحب آکسفورڈ میں تھے جہاں سے وہ اپریل ۱۹۵۶ء میں واپس آئے ۔ اس طرح ہمارا ربط ضبط ۱۹۵۰ء تا ۱۹۵۶ء یعنی چھے سال منقطع رہا۔

آکسفورڈ پہنچ کر اور پروفیسر گب جیسے جلیل القدر استاد عربی کی نگرانی میں ریسرچ کرنے کے بعد عربی کے حلقوں میں ان کی علمی صلاحیتوں کی دھاک بیٹھتی چلی گئی ۔ لیکن مجھے ان کی عربی میں فتوحات کے سلسلے میں اس وقت کچھ نہیں کہنا (کہہ بھی نہیں سکتا)۔ ان کی گرمی جستجو کے جو نتائج اردو فتوحات کی شکل میں برآمد ہوئے صرف وہ معرض بحث میں ہیں ۔ ان کی سب سے بڑی علمی کامیابی شمالی ہند کی قدیم ترین نثر کے شاہ کار فضل علی فضلی کی ''کربل کتھا'' کی دریافت (۱۹۵۵ء) اور بعد کو مالک رام صاحب کے اشتراک سے اس کی تدوین اور اشاعت (۱۹۶۵) ہے۔ اس بے مثل تدوین میں آرزو صاحب کا بڑا حصہ ہے ۔ نادر متون کی دریافت کا سلسلہ کربل کتھا ہی پر ختم نہیں ہوجاتا ۔ دوران قیام انگلستان انھوں نے بوڈلین لائبریری ، آکسفورڈ میں حیدر بخش حیدری کا تذکرہ گلشن ہند ڈھونڈ نکالا اور ہندوستان آ کر شائع کیا۔ اسی طرح ان ایک کارنامہ مفتی صدرالدین آزردہ کے تذکرہ شعرا کی کیمبرج میں دریافت اور دہلی میں اس کی اشاعت (۱۹۷۰) ہے۔ جستجو کی گرمی میں وہ اہم اور غیر اہم میں تمیز کرنا بھی ضروری نہیں سمجھتے ہیں چنانچہ بہت سے غیر اہم مصنفین کی تصانیف یا ان کا کلام وہ اسی قدر اہتمام اور دقتِ نظر کے ساتھ مرتب کر چکے ہیں جن کی تاریخ ادب اردو میں کوئی خاص اہمیت نہیں (مثلاً دیوانِ حضور عظیم آبادی) ۔

Marfat.com

میں ان کی اس پر اکثر زیرلب اعتراض کرتا رہتا ہوں۔ وہ آج کل قاضی عبد الودود کے سینکڑوں بلکہ ہزاروں خطوط کی ترتیب اور تدوین میں لگے ہوئے ہیں۔ چونکہ قاضی صاحب ان کے پیرومرشد ہیں کھل کر تو نہیں کہتا لیکن اشارۃً کئی بار کہہ چکا ہوں کہ قاضی صاحب کا ہر پرزہ لائق اعتنا نہیں۔ اگر کسی خط میں کوئی تحقیقی نکتہ ہے یا علمی انکشاف ہے تو وہ ضرور محفوظ کرلیا جائے، یا وہ خط محفوظ کیا جائے جس میں انشا یا اسلوب کا حسن ہو (حالانکہ اس اعتبار سے قاضی صاحب کے بہت کم خطوط معیار پر اترتے ہیں)۔ اور'' خطوط کی کلیات''صرف ان لوگوں کی شائع کی جائے جو ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک ہیں (جیسے گاندھی جی)۔ باقی حضرات کے خطوط کے صرف انتخابات شائع ہونے چاہئیں۔ اردو میں یوں بھی شائع کرنے والے ادارے کمیاب ہیں اس لیے یہ طومار کیوں تیار کیا جائے اور اس پر وہ دیدہ ریزی کیوں کی جائے جو آرزو صاحب کی تحقیق کا خاصا ہے۔ کاش وہ اپنی تحقیق کی بے پناہ صلاحیتوں اور توانائی کربل کتھا ہی جیسی ایک دو تصانیف پر صرف کرتے تو علمی غوّاصی کی بدولت وہ اور دُرِ بیش بہا قعر گمنامی سے باہر لا سکتے۔

چونکہ آرزو صاحب کی'' گرم دم جستجو''شخصیت کا یہ پہلو میرے اس پرچے کے موضوع سے باہر ہے، اس لیے ان کی تحقیقی بے پناہ صلاحیت اور اس کے نتائج کے بارے میں ان عام مشاہدات کے ساتھ میں اس بحث کو ختم کرتا ہوں۔

جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ میرا اور آرزو صاحب کا قرب فاصلے کا قرب رہا ہے۔ یعنی پہلے دور ۱۹۴۳ تا ۱۹۵۰ میں صرف واقفیت، ایک دوسرے کی جانب کشش، شعبۂ اردو کی ادبی مجالس میں ساتھ اور رشید صاحب سے عقیدت میں اشتراک، اس کے بعد ۱۹۵۰ء تا ۱۹۵۶ ہم دونوں کا دورِ جدائی۔ میں پیرس میں اور وہ آکسفورڈ میں۔اس زمانے میں ان کا اپنی عربی ریسرچ کے انہماک اور میرا لسانیات کی تعلیم میں استغراق۔ ۱۹۵۶ء تک ہم دونوں پھر دیار سرسید میں یکجا تھے۔ یہ سلسلہ ۱۹۶۳ء پر ختم ہوتا ہے۔ جب میں جامعۂ عثمانیہ کے شعبۂ اردو کی صدارت قبول کر لیتا ہوں۔ وہاں سے علی گڑھ واپسی ۱۹۶۸ء میں ہوتی ہے لیکن ایک نئے شعبے لسانیات کے صدر شعبہ کی حیثیت سے۔ اس وقت تک آرزو صاحب یونیورسٹی کے شعبۂ عربی اپنی پوزیشن مستحکم کر چکے تھے میں اردو سے نکل کر لسانیات کے چکر میں آچکا تھا۔ آرزو صاحب اس علم سے اسی قدر دور تھے جس قدر میں ان کی عربی کی فتوحات سے۔ یہ اب سنگ ساتھ صرف کانفرنسوں اور جلسوں تک محدود رہ گیا یعنی حضر سے زیادہ سفر کا۔ میں نے ۹۱ء میں ان کے ساتھ ایک سفر عمان/اردن تک

Marfat.com

کیا جہاں وہ بالذات عربی کے اسکالر کی حیثیت سے مدعو تھے اور میں صرف اپنے دوست ڈاکٹر احسان رشید کی دلچسپی کی بدولت جو وہاں اسوقت پاکستان کے سفیر کی حیثیت سے متعین تھے۔ وہاں مجھے اندازہ ہوا کہ عربی زبان میں کم گوئی کے باوجود عربی کے اسکالروں کی نظر میں وہ کس قدر محترم تھے۔ یہ ان کے عربی میں ان کارناموں کی بدولت جو انھوں علی گڑھ میں سرانجام دیے اور اُن مجلّات و رسائل کی بدولت جس کے وہ مدیر تھے اور عرب دنیا کے تمام اسکالر جن کے قدرداں تھے۔ ان تمام غیر ملکی اسفار میں ان کی بیگم ہمدم و دمساز ان کے ہمراہ ہوتی تھیں ۔ رفتہ رفتہ ہم دونوں کی اردو سے دلچسپی کم ہوتی گئی ۔ میں لسانیات کے کوچے میں چلا گیا ۱۹۶۸ء میں مجھے مسلم یونیورسٹی میں ایک نئے شعبہ لسانیات کی بنیاد رکھنی پڑی ۔ آرزو صاحب پر اسلامک اسٹڈیز کے نئے شعبہ کی سربراہی کرنے کی ذمہ داری آپڑی ۔ تاہم میرے، کہ میں' پیشہ ور' اردو والا تھا، مضامین اور تدوین متون کا سلسلہ جاری رہا۔

آرزو صاحب سے علمی دوری کے باوجود جب بھی آمنا سامنا ہوجاتا تو میرا ایمان راسخ ہوجاتا کہ ہندوستان کے ایک ایسے خطے سے جو اپنے شور شرابے اور غل غپاڑے کے لیے مشہور ہے کیسے ایک ایسا عالم اُٹھ سکتا ہے جو ہمہ وقت مدہم سروں میں بات کرتا ہو، انکسار جس کی سرشت ہو، مرنجا مرنجی جس کا عقیدہ ہو، اور ایک خفیف مسکراہٹ جس کے لبوں پر کھیلتی رہتی ہو جو دوسرے میں اعتماد پیدا کرتی ہو ۔ جس کو کسی سے کبھی ٹکراتے نہ دیکھا ہو ۔ جو اپنے اردگرد انسانیت کی خوشبو اور مہک رکھتا ہو غرضیکہ جس سے مل کر ہمیشہ دل خوش ہوتا ہو۔

☆☆☆

Marfat.com

پروفیسر داؤد رہبر

سابق استادعلومِ ثقافت و ادان، بوسٹن یونیورسٹی، امریکہ

اِظہارِ نیازمندی

بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم نے جم کر شعر گوئی اختیار نہیں کی ایک مصرع البتہ کہا جس کا آہنگ کہاوتوں کا سا ہے ع

سب سے بڑا معلّم، زمانہ
سب سے بہتر دوست، کتاب

کتاب تو سب سے دوستی کرنے کو تیار رہتی ہے، کتاب سے دوستی کرنے والے سب نہیں ہوتے، پروفیسر مختارالدین احمد صاحب نے عمر بھر کتاب سے محبت کی اور کتاب نے ان سے۔ ہر اچھی کتاب کی اپنی شخصیت اور اپنی سیرت ہوتی ہے، کتاب ہم سے بات کرتی ہے،

چین کی پرانی تہذیب میں یادِ اجداد کی رسم کیسی اچّھی تھی! ہر گھر میں اجداد کے تبرکات محفوظ رکھے جاتے تھے اور وقتاً فوقتاً ان میں سے کوئی تبرک صندوق سے نکال کر چند روز سامنے رکھتے تھے کہ اس پر نظر پڑتی رہے، بعض تبرک تحریروں کی صورت میں ہوتے تھے، مثلاً کسی بزرگ کا کوئی فرمودہ۔

یورپ، ایشااور افریقہ کی سینکڑوں لائبریریوں میں ہمارے اسلاف کے بے شمار تبرکات چُپ چاپ پڑے ہیں اس انتظار میں کہ عالم ارواح کا کوئی سیّاح آ کر انہیں دریافت کرے اور ان سے دل بستہ ہوکر لگن کے ساتھ ان کا تعارف اپنے معاصرین سے کرائے، ان تبرکات سے میری مراد مخطوطات ہیں۔

علی گڑھ میں پروفیسر مختارالدین احمد صاحب کی پہلی ملازمت لٹن لائبریری کے شعبۂ مخطوطات کے سربراہ کی حیثیت سے تھی، میرا قیاس ہے کہ مخطوطات کے مطالعہ کا چسکا انہیں وہیں سے لگا ہوگا۔

حافظ محمود خاں شیرانی مرحوم کے محققانہ مشاغل کا آغاز بھی مخطوطات کے تعلق سے شروع ہوا تھا۔ مرحوم انگلستان وکالت کی تعلیم کے لیے گئے تھے، وہاں پہنچے تو چند مہینے

Marfat.com

بعد ان کے والد بزرگوار کے انتقال کی خبر انہیں پہنچی ، وطن سے روپیہ آنا بند ہوگیا، اللہ کے فضل سے کسبِ معاش کا وسیلہ میسر آیا، لندن میں کتابوں کی مشہور دکان لیوزک اینڈ سنز میں انہیں اس کام کے لیے رکھ لیا گیا کہ عربی اور فارسی کے مخطوطات جو دکان میں فروخت کے لیے آئیں ان کو تفحص کے ساتھ دیکھ کر ان کی قدر و قیمت پر رائے زنی کریں، ساتھ آٹھ برس مرحوم اس کام میں لگے رہے، مخطوطات شناسی میں انہیں کمال اسی ملازمت سے حاصل ہوا، اس کے ساتھ ہی اسلامی لٹریچر کی انواع سے بے مثال آگاہی بھی حاصل ہوئی۔

مخطوطات سے جیسا شوق شیرانی صاحب کے ہاں تھا ویسا ہی شوق پروفیسر مختارالدین احمد صاحب کے ہاں پایا گیا۔

نئی نسل کے طلبہ اس شوق کو کیا جانیں، ٹائپ رائٹر ایجاد ہوا تو قلم کا استعمال جاتا رہا، اب ای۔میل چالو ہوئی ہے تو مکتوب نویسی متروک ہوئی، جس قلم سے میں یہ سطور لکھ رہا ہوں یہ مدوّر نوک والا ہے اور بے آواز ہے، مخطوطات کا زمانہ چھاپے کی ایجاد سے پہلے کا زمانہ تھا، وہ صریر خامہ کا زمانہ تھا، قلمی نسخے اس عہد میں کلک اور روشنائی سے تیار ہوتے تھے اور سرآنکھوں پر رکھے جاتے تھے، کلک کا وطن بھی وہی ہے جو بانسری کا ہے، یعنی نیستاں۔

مخطوطات کی تلاش اور دریافت ہی سے یورپ میں رینا سانس کی بادِ بہاری چلی تھی۔ مسیحی مبلغین نے مدتوں رومائے قدیم کی تہذیب کے شاہکاروں پر اپنے کٹّر پن کے باعث لعنت بھیجی تھی، علم و ادب کے ہزاروں قدیم شاہکار تلف کر دیے گئے تھے، لیکن کچھ بچ بھی گئے تھے، بارہویں صدی میں پرانی تہذیب کی عظمت کا احساس بیدار ہوا تو ان شاہکاروں کی تلاش ہونے لگی، ان کی تدوین اور ان کے تراجم کی سرگرمی نے یورپ کے خون میں نئی روح پھونک دی،

کسی قلمی نسخے کے متن کی تحقیق و تدوین یا اس کا ترجمہ کرتے ہوئے اس کے مصنف اور اس کے خطاط، دونوں کی روحوں سے گہرا رابطہ میسر آتا ہے، اس کی مثال میرے سامنے ہے، یہ ابوالعباس محمد بن یزید المبرّد (متوفی ۲۸۵ھ) کا ایک طویل مکتوب احمدبن الواثق العباسی کے نام ہے جو پروفیسر مختارالدین احمد صاحب نے جرمنی کی ایک لائبریری سے ڈھونڈ نکالا اور ایڈٹ کر کے قلمی نسخے کے عکس سمیت ۱۹۶۸ء میں دہلی سے شائع کیا، اس کا تعارف خود پروفیسر صاحب کے قلم سے ملاحظہ ہو:۔

Marfat.com

"۱۹۵۴ء کے اواخر اور ۱۹۵۵ء کے اوائل میں میرا قیام چند ے ہالینڈ کے مشہور شہر لائیڈن میں رہا، جو یورپ میں مشرقی علوم وفنون کا بہت بڑا مرکز رہا ہے۔ اسی زمانے میں ایک دن کسی کام سے میونک اسٹیٹ لائبریری کی مطبوعہ فہرستِ مخطوطات دیکھ رہا تھا کہ ایک عربی رسالے کے قلمی نسخے کے اندراجات پر نظر پڑی، جس کے متعلق لکھا تھا کہ رسالے کا مصنف محمد یزید الشمالی ہے اور کاتبِ مخطوطہ علی بن ھلیل، اور یہ کہ ہر صفحے میں پانچ سطریں ہیں۔ میرے لیے یہی اہمیت کیا کم تھی کہ یہ چوتھی صدی ہجری کے مشہور نحوی اور مصنف المبرّد کی تصنیف ہے اور ایسی تصنیف جو آج تک لوگوں کی نظر سے پوشیدہ رہی ہے؛ اس پر مستزاد یہ کہ پورا رسالہ علی بن ھلیل کے قلم کا لکھا ہوا ہے۔ چونکہ ہر صفحے پر پانچ سطریں تھیں، اس سے اس بات کا یقین ہوگیا کہ مخطوطہ بہت خوشخط لکھا ہوا ہوگا اور "علی بن ھلیل" کے نام سے خیال گزرا کہ ہو نہ ہو یہ خوشنویس علی بن ھلال معروف بابن البوّاب ہے، اس لیے کہ قدماء کے یہاں ھلال کو "ھلل"، "ھلیل" (اسی طرح ابوالقاسم کو "ابوالقسم") لکھنے کا رواج تھا۔ لیکن جرمن فہرست نگار کو یہ اندازہ نہیں ہوسکا تھا کہ علی بن ھلیل کون شخص ہے اور مخطوطے کی کیا اہمیت ہے۔

میں نے فہرست کے اندراجات پڑھتے ہی لائیڈن یونیورسٹی کے کتاب خانے کے شعبۂ مشرقیات کے ناظم ڈاکٹر پی، فور ہوفے سے درخواست کی کہ مجھے اس مخطوطے کا عکس منگوادیں: وسط نومبر ۱۹۵۴ء میں جرمنی سے اس کا عکس آ گیا اور میں جہاں مخطوطے کے حسن سے متاثر ہوا، وہیں المبرّد کے قلم کے اعجاز کا بھی قائل ہوا کہ اس نے اس مختصر سے رسالے میں کس طرح موضوع کے ساتھ پورا انصاف کیا ہے اور کس قدر خوبصورت نثر لکھی ہے۔ اس رسالے کی اہمیت کے پیش نظر میرے دل میں اسکی ترتیب و اشاعت کا خیال پیدا ہوا اور لائیڈن، جرمنی، فرانس اور انگلستان کے کتاب خانوں میں جہاں کہیں بھی میں گیا، ابن البوّاب کی لکھی ہوئی تحریریں تلاش کرتا رہا اور ساتھ ہی ساتھ المبرّد کے اس نایاب رسالے کے کسی دوسرے نسخے کے جستجو میں بھی رہا۔ آخر جرمنی کے شاہی کتابخانہ برلین میں اس رسالے کے ابتدائی تین صفحے ملے، جو بعد کے زمانے کے لکھے ہوئے تھے۔ کاتب (جس کا نام معلوم نہیں) کے سامنے رسالۂ مبرّد کا نسخۂ ابن البواب کے علاوہ کوئی اور نسخہ تھا۔ کاتب کسی وجہ سے صرف تین صفحے نقل کرسکا، یا ممکن ہے اس نے پورا رسالہ نقل کیا ہو، لیکن دستبردِ زمانہ سے صرف یہی تین صفحے محفوظ رہ گئے ہوں۔

۱۹۵۵ء میں مصوری اور دوسرے اسلامی فنون کے ماہر D.S. Rice سے

Marfat.com

اوکسفرڈ میں ملاقات ہوئی ۔ باڈلین لائبریری کے شعبۂ مشرقیات کے ناظم پروفیسر ا، ف، ل، بیسٹن نے (جو بعد کو پروفیسر ہملٹن گب کی جگہ شعبۂ عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے) مجھے بتایا تھا کہ انھوں نے ابن البوّاب پر تحقیقی کام کیا ہے اور ان کی کتاب اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس میں زیرطبع ہے۔ اب ان سے ملاقات ہوئی تو میں نے ڈاکٹر رائیس سے اس موضوع پر گفتگو کی۔ معلوم ہوا کہ انھوں نے ابن البوّاب کے لکھے ہوئے قرآن کے ایک نسخے کے تنقیدی تجزیے کے علاوہ دنیا بھر میں ابن البوّاب کے مکتوبہ نسخوں کو تلاش کرکے اپنی کتاب میں ان کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ لیکن ان کے دریافت کردہ نسخوں میں میونک کے مشارٌ الیہ نسخے کا ذکر نہیں تھا۔ میں نے جب ان سے اس نسخے کا ذکر کیا اور اس کی کچھ تفصیلات بتائیں، تو انھوں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ یہ دیکھ کر مجھے ایک گونہ خوشی ہوئی کہ جو نسخہ میں نے دریافت کیا ہے ابن البوّاب کے سب سے بڑے ماہر کو بھی اس کے وجود کی اطلاع نہیں ہے۔ کچھ دنوں کے بعد جب ڈاکٹر رائیس کی کتاب[1] چھپ کر بازار میں آئی تو دیکھا کہ یہ کتاب واقعی نسخۂ میونک کے ذکر سے خالی ہے۔ میرا خیال تھا کہ انھوں نے اب میرے دریافت کردہ نسخے کا اپنی کتاب میں اضافہ کردیا ہوگا لیکن غالباً طباعت کی آخری منزل پر انھیں اس کا موقع نہیں مل سکا اور کتاب اس کے بغیر شائع ہوگئی۔"

اسی موضوع پر ڈاکٹر سہیل انور مدیرِ معہدِ تاریخ الطب، جامعۂ استانبول نے ترکی زبان میں ایک کتاب[2] لکھی ہے، جس کا عربی ترجمہ بغداد سے شائع ہوا ہے۔ اس میں ابن البوّاب کے متعدد مکتوبہ نسخوں کا ذکر ہے، لیکن میونک کے نسخے کا اس میں بھی ذکر نہیں ہے نہ اصل کتاب میں اور نہ الاستاذ محمد بہجۃ الاثری کے تحقیقی تعلیقات و اضافات میں، جو ۹۰ صفحات کو محیط ہیں۔ یہ دیکھ کر کہ المبرّد کے قدیم سوانح نگار بھی اس رسالے کا ذکر نہیں کرتے اور یورپ اور ترکیا اور عراق کے فضلاء جنھوں نے اپنی عمریں ابن البوّاب کی تحقیق پر صرف کی ہیں، اس کے تحریر کردہ یا اس کی طرف منسوب اس رسالے سے واقف نہیں، مجھے اس کی اشاعت کا خیال پیدا ہوا۔ یہاں المبرّد کے رسالے کا متن، جرمنی کے خوبصورت مخطوطے کے عکس کے ساتھ شائع کیا جارہا ہے۔"

1- D.s. Rice, The unique Ibnal-Bawwab Manuscript in the Chester Beatty Library (Dublin, 1955)

۲۔ الخطاط البغدادی علی بن المشہور بابن البواب، ترجمہ و تعلیق: محمد بہجۃ الاثری، عزیز سامی، مطبعۃ المجمع العلمی العربی العراقی، بغداد۔۱۹۵۸م

Marfat.com

مبرّد کا یہ رسالہ مجھے حد عزیز ہے، اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ پروفیسر مختارالدین احمد صاحب نے اپنے دستخط سے مزیّن فرما کر اس کا ایک نسخہ مجھے بھیجا، دوسری وجہ یہ ہے کہ مبرّد کی مشہور ترین تصنیف" الکامل" کا ایک حصّہ ہمارے ایم۔ اے (عربی) کے نصاب میں شامل تھا، مبرّد کا اسلوب اس کتاب میں گفتگو کا اسلوب ہے، اور خوب ہے، اور مجھے مرغوب ہے۔

ہر عالم کا علمی کام اس کے مزاج کا پتہ دیتا ہے، مثلاً مولوی نذیر احمد نے عربی اچھی طرح سیکھی تھی اور آپ نے قرآن کریم کا ترجمہ کیا، اُدھر اوپر تلے کئی ناول بھی لکھ ڈالے، ان کے شاگرد مولانا عبدالعزیز میمن صاحب سے اگر کوئی کہتا آپ بھی ناول لکھیے تو بی تکی بات ہوتی۔ مولانا میمن کا اپنا جما ہوا مورّخانہ مزاج تھا، پھر یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ مولانا میمن کلام اور فقہ کے مؤرّخ نہ تھے، صرف ادب کے محقق تھے، مسائل دینی کی بحثوں والے موضوع ان کی تحقیقات کے موضوع نہ تھے۔

دوسری مثال مولانا شبلی کے مزاج کی ہے، عربی ان کی بھی مضبوط تھی لیکن دینی مسائل سے ان کی دلچسپی گہری تھی، اپنی حنفیت کا اعلان انہیں مطلوب تھا، مؤرّخانہ فکر سے کام لے کر انھوں نے علم الکلام لکھی۔ ان کا مزاج صرف مؤرّخانہ نہ تھا متکلمانہ بھی تھا، چنانچہ علم الکلام کے بعد انھوں نے الکلام لکھی جس کا مقصد یہ بتانا تھا کہ ٹھیک اسلام کسے کہتے ہیں،

ان کے دو بڑے استاد مولانا محمد فاروق چریا کوٹی اور مولانا فیض الحسن سہارنپوری دونوں ادبی ذوق رکھتے تھے اس کا اثر مولانا شبلی پر کیا ہوا ان کی شعرالعجم سے ظاہر ہے،

ارباب ندوہ نے شبلیّت اختیار کی تو مولانا عبدالسلام ندوی نے شعرالہند لکھی اور مولانا عبدالحی نے گلِ رعنا،

پروفیسر مختارالدین احمد صاحب نے صحاحِ ستّہ کا درس بھی لیا تھا لیکن مولانا میمن کے زیر اثر انھوں نے جو کام کیا ادب ہی سے متعلق ہے، کلام اور فقہ سے متعلق نہیں، البتہ ایک بڑا فرق یہ ہے کہ مولانا میمن کا تمامتر کام عربی ادب سے وابستہ ہے، پروفیسر مختارالدین احمد صاحب نے فارسی اور اردو ادبیات پر بھی کچھ لکھا، دونوں بزرگوں میں جو بات مشترک ہے وہ ہے ٹھکا ہوا مؤرّخانہ مزاج۔

پروفیسر صاحب کی خوش بختی ہے کہ علی گڑھ میں ان کی طالب علمی کے زمانے

Marfat.com

سے پہلے مولانا میمن لاہور کے اورینٹل کالج کی ملازمت چھوڑ کر علی گڑھ منتقل ہو گئے تھے، اورینٹل کالج میں مولانا کا تقرر اپریل ۱۹۲۱ء میں ہوا تھا اور وہاں سے آپ علی گڑھ ۱۹۲۵ء کے آخر میں گئے۔

راقم السطور کے والد مرحوم پروفیسر محمد اقبال، کیمبرج سے فارغ التحصیل ہو کر ۱۹۲۲ء میں اورینٹل کالج کے شعبۂ فارسی کے صدر نشیں ہوئے، اس کالج میں مولانا میمن سے ان کی رفاقتِ کار چار برس رہی۔

والد مرحوم نے چھ سال (۱۹۱۱ء تا ۱۹۱۷ء) علی گڑھ میں تعلیم پائی تھی، عربی میں ایم۔ اے کی سند وہیں سے حاصل کی تھی، ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد کی مہربانی سے آپ برسوں علی گڑھ یونیورسٹی کورٹ کے ممبر بھی رہے، کورٹ کی میٹنگ کے لیے اور بحیثیت ممتحن آپ علی گڑھ جاتے رہتے تھے، مولانا میمن سے ان کی ملاقاتیں وہاں بھی ہوتی تھیں اور دیگر مقامات پر کانفرنسوں میں بھی۔

مولانا، اورینٹل کالج چھوڑ کر علی گڑھ کیوں گئے، اس کی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ اس کالج میں ان کے تقرر سے تین برس پہلے شعبۂ عربی کی صدر کرسی پر مولوی محمد شفیع صاحب متمکن تھے، یہ بڑی شان کے آدمی تھے، ایم۔ اے انہوں نے پنجاب یونیورسٹی سے انگریزی میں پاس کیا تھا، بہت ستھری انگریزی بولتے اور لکھتے تھے، جرمن اور فرنچ بھی سہولت سے پڑھ سکتے تھے، لیکن انہیں معلوم تھا کہ عربی میں ان کی لیاقت مولانا میمن کی لیاقت سے کہیں کم ہے، اس لیے مولانا سے آنکھ ملا کر بات کرنا ان کے لیے مشکل تھا، مولوی شفیع صاحب کی طبیعت میں خشونت بھی تھی اور وہ سخت گیر آدمی تھے۔

عربی متون کی تحقیق و تدوین کا جو حوصلہ مولانا میمن میں تھا شفیع صاحب کے ہاں نہ تھا، چنانچہ شفیع صاحب نے فارسی متون پر کام کیا، تین مخطوطات ایڈٹ کر کے شائع کیے:

(۱) مکاتیب رشید الدین فضل اللہ

(۲) مطلع السعدین مصنفہ عبد الرزاق سمرقندی

(۳) فارسی شعراء کا تذکرہ میخانہ مصنفہ ملا عبد النبی

انہیں کیمبرج سے ایم۔ اے کی ڈگری جس کام پر ملی تھی وہ ہے العقد الفرید کا

Marfat.com

تجزیاتی انڈکس، مولانا میمن نے ایک روز مجھ سے کہا شفیع صاحب نے العقد کے انڈکس بنانے میں اتنی محنت کی، بہتر ہوتا اگر آپ اس کا متن ایڈٹ کر کے شائع کرتے۔

مولانا نے احتیاط سے کام لیا، بس اتنا ہی کہا، یہ نہیں کہا کہ عربی کی اس کتاب کا متن ایڈٹ کرنے کے لیے جو استعداد چاہیے وہ شفیع صاحب کو نصیب نہ تھی۔

ایسی لیاقت مولانا میمن کا حصہ تھی، اور ایسی لیاقت پروفیسر مختارالدین احمد صاحب کو بھی ارزانی ہوئی ہے۔

مولانا عربی میں روانی سے گفتگو کرتے تھے، ایک روز جب آپ ہمارے گھر میں آ کر ٹھہرے ہوئے تھے ان کی آمد کی خبر سن کر آسٹریا کے نومسلم سکالر لیو پولڈ محمد اسد صاحب (جو ان دنوں حیدرآباد (دکن) کے رسالہ اسلامک کلچر کے ایڈیٹر تھے) ان سے ملنے آئے۔ گھنٹہ بھر دونوں کی گفتگو عربی میں ہوتی رہی، میں پاس بیٹھا سنتا رہا۔

آل انڈیا اورینٹل کانفرنس کے اجلاس منعقدہ بنارس (۱۹۴۳ء) میں والد مرحوم مجھے بھی ساتھ لے گئے تھے، وہاں ایک روز مولانا میمن، ڈاکٹر برکت علی قریشی اور والد مرحوم اِکّے پر سوار ہو کر بنارس کی مسجد دیکھنے گئے، میں بھی ساتھ تھا، اس عظیم الشان مسجد کو شکستہ حال میں دیکھ کر سب کو افسوس ہوا، ہم لوگ کاشی کے مسلمان یاتری تھے، مسجد کو دیکھنے کے بعد اشتہا نے زور کیا، والد مرحوم بولے اب نان کباب کھانے چاہئیں، جلد ہی ایک کبابیے کی دکان دکھائی دی، کباب کھا کر ہم اِکّے پر سوار ہو کر واپس بنارس یونیورسٹی کی طرف روانہ ہوئے جہاں میزبانوں کی رسوئی میں کباب شامل نہ تھا۔

پروفیسر مختارالدین احمد صاحب کا ذکر خیر کرتے ہوئے ان کے استادِ بزرگ کی باتیں یاد آئیں تو قلم چلتا ہی گیا، اُمید ہے پروفیسر صاحب کے اور ان کے اُستادِ بزرگ کے ارادت مند ان یادوں کی برجستگی سے خوش ہوں گے۔

راقم السطور اپریل ۱۹۴۹ء میں تعلیم کے لیے لاہور سے انگلستان گیا، ۱۹۵۳ء میں فارغ التحصیل ہو کر لاہور پہنچا، وہاں سے ۱۹۵۴ء میں تدریس کے لیے کینیڈا جا پہنچا، دو سال وہاں رہ کر انقرہ گیا تین سال انقرہ یونیورسٹی میں اُردو پڑھائی، وہاں سے ۱۹۵۹ء میں امریکہ چلا آیا اور یہاں کی یونیورسٹیوں میں جبڑا ہلا کر روزی کمائی۔

اس آوارگی کے باعث پروفیسر مختار الدین احمد صاحب کی ملاقات سے محروم

Marfat.com

رہا۔ انہوں نے اپنی چند مطبوعہ نگارشات مجھے عطا فرمائیں ، ان میں ایک کا عنوان ہے ''پھول کھلے ہیں گلشن گلشن'' اسے پڑھ کر معلوم ہوا کہ آکسفورڈ میں ان کی دوستی میرے بڑے بھائی محمد یعقوب مرحوم سے ہوئی جو آکسفورڈ میں فزکس کی ڈی۔فل کے لیے ریسرچ میں مشغول تھے۔

۱۹۹۱ء میں میں بوسٹن یونیورسٹی سے ریٹائرڈ ہو کر خلوت گزیں ہوا تو مجھے اُردو میں مضمون نگاری کے لیے فراغت میسر آئی ، میری کچھ تحریریں کراچی سے مشفق خواجہ صاحب نے پروفیسر صاحب کو بھیجیں ، ان سے متعارف ہو کر پروفیسر صاحب نے مجھے ایک خط لکھا ، اس کے بعد کئی عنایت نامے موصول ہوئے۔

مجھے پنڈت کیفی کا مسدّس ''بھارت درپن'' دیکھنے کا اشتیاق تھا، پاکستان کے مہربانوں کو خط لکھے، وہاں یہ مسدّس دستیاب نہ ہوا تو میں نے پروفیسر صاحب کے در پر سائلانہ صدا لگائی ، آپ نے فوراً علی گڑھ کی لائبریری سے بھارت درپن کی فوٹو کاپی بنوا کر مجھے بھیج دی،

(۲)

نذرِ مختار (مؤلفہ جناب مالک رام) کے مطالعہ سے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ پروفیسر مختار الدین احمد صاحب عمر میں مجھ سے تقریباً ڈیڑھ برس بڑے ہیں ، ان کی تاریخِ ولادت ۱۴ر نومبر ۱۹۲۴ء ہے اور میری ۶ر مئی ۱۹۲۶ء مجھے خُرد کہلانے کا شوق ہمیشہ رہا، یہ تو ہوا خوشی کا سبب ، افسوس اس کا ہے کہ مختار صاحب سے میری ملاقات آج تک نہ ہو سکی ، آپ ریسرچ کے لیے ۱۹۵۳ء میں آکسفورڈ پہنچے اور راقم السطور اسی سال کے آغاز میں کیمبرج سے اپنی طالبعلمی بھگتا کر لاہور چلا گیا، پاکستان کی علمی کانفرنسوں میں ان کی شرکت بہت ہی کم رہی، یہ محرومی کیسے دور ہو، یا میں علی گڑھ پہنچوں یا ان کی امریکہ میں تشریف آوری ہو، ایسا تبھی ہو کہ قسمت کی یاوری ہو۔

البتہ شکر ہے کہ '' نذرِ مختار'' کے شروع میں آپ کا ایک نہایت اچھا فوٹو شامل کر لیا گیا ہے، خاموش فوٹو نہیں ، بولتا ہوا فوٹو ، صاف گو فوٹو، اسے دیکھ کر معلوم ہوا کہ آپ کے مزاج میں قدیم اور جدید کا امتزاج ہے، لباس مغربی ہے ، چہرہ کلین شیو والا نہیں، خشخشی ڈاڑھی اور مونچھوں کی قطع میں ایک ایسا بناؤ ہے جس نے شخصیت کو مولانا پن سے بچا رکھا ہے، آنکھوں کے لطیف تبسم سے بصیرت ، اطمینان ، موانست ، مہربانی اور صاف دلی کا

Marfat.com

پتہ ملتا ہے، قیافے سے اندازہ ہوتا ہے کہ پروفیسر صاحب اچھا لطیفہ سن کر پورا لطف اٹھائیں گے اور تبسم کھِل کر خندۂ فرخندہ میں مبدّل ہوجائے گا، چہرہ خلوص کا آئینہ ہے، اس میں نہ بناوٹی انکسار ہے نہ کوئی شائبہ استکبار، یہ ایک حنیف انسان کا چہرہ ہے۔

اسلامی جمالیات کی خاص نمائندگی خطاطی سے ہوئی ہے، یہ مضمون میں نے خطاطی ہی کے ذکر سے شروع کیا تھا، مہذّب انسان زبان سے دو رشتے درست رکھتا ہے، خوش کلامی اور خوش خطی، ان دونوں کی طرف آج کل درسگاہوں کی توجہ برائے نام بھی نہیں، مدت ہوئی میں نے ایک رباعی کہی تھی:۔

بچپن میں جو لکھی تھی وہ میں نے تختی
تھی سب سے بڑی وہیں میری خوش بختی
تحریر میں آئی سوچ، شُستہ ہوئی سوچ
لکھ کر عنوان ''زندگی کی سختی''

پروفیسر مختارالدین صاحب نے اپنے ایک خط میں میری مکتوب نویسی اور میری خوش خطی کو نہایت فراخدلی کے ساتھ سراہا، اس داد پر انہیں آداب عرض کہہ کر ان کا یہ مکتوب یہاں نقل کرتا ہوں:۔

علی گڑھ

۱۱ر جنوری ۲۰۰۳ء

مکرم ومحترم ڈاکٹر داؤد رہبر صاحب، السلام علیکم

گرامی نامہ مورخہ ۲۹ر دسمبر یہاں ۷ر جنوری کو پہنچا، آپ کی اچھی اور شگفتہ تحریر پڑھ کر دل خوشی سے جھوم اُٹھا۔

''آمد کی ضرورت صرف سخن گوئی کو نہیں ہوتی،
مکتوب نویسی کو بھی ہوتی ہے، طبیعت ترنگ میں ہو تو خط میں
بہلاوا آتا ہے، طبیعت موج میں ہو تو نئی تان سوجھتی ہے۔''

کیسی دلکش اور ٹھکی ہوئی نثر لکھتے ہیں آپ!

Marfat.com

آپ کا ''خط'' بھی دلکش اور بہت خوبصورت ہے۔ کچھ لوگ ہیں جن کی شانِ تحریر مجھے پسند ہے، ان میں اب آپ بھی شامل ہیں۔ ذاکر صاحب کا خط بہت اچھا تھا، مسعود حسین خاں اور احسان رشید نے ان کی پیروی کی اور کامیاب رہے، رشید صاحب کے خط کا بھی اپنا جداگانہ انداز تھا، ایک دوسرا گروپ خواجہ احمد فاروقی اور ان کے تلامذہ کا ہے، خواجہ صاحب کا خط واضح اور خوبصورت تھا، گوپی چند نارنگ اور نثار احمد فاروقی نے ان کی ایسی تقلید کی کہ حرف سے حرف ملا دیا، مجھے ان تینوں کی تحریریں پسند ہیں، آپ کی نظر سے بھی گزری ہوں گی، لیکن خط میں پیروی و اتباع کی بہترین مثال آپ مجھ سے طلب کریں تو میں عندلیب شادانی اور ان کے (باغی) شاگرد نظیر صدیقی کے ہاتھوں کی لکھی ہوئی تحریریں پیش کروں گا۔ میرے پاس ان دونوں کی تحریریں ہیں۔ ایک دوسرے سے بے حد مشابہ ہیں۔ لطف اس وقت آیا جب نظیر صدیقی نے ایک بار مجھے شادانی مرحوم کے خطوط اپنے قلم سے نقل کر کے بھیجے، دونوں کی تحریروں میں ذرہ برابر فرق نہ تھا۔ یہ سارے خطوط قاضی عبدالودود صاحب کے نام ہیں جن کے خطوط میں مرتّب کر رہا ہوں۔

قاضی صاحب کو میں ''ہفت قلم'' کہتا ہوں، یہ کلمہ توصیفی نہیں، میرے پاس ان کے پان سات سو خط تو ضرور ہوں گے، بیشتر بدخطی کی اچھی مثال ہیں، کچھ کم بدخط ہیں، کچھ غنیمت ہیں، لیکن کیمبرج کی تعلیم کے دوران ۱۹۲۳ء میں اور بعد کو بھی جو خطوط انہوں نے ۱۹۵۰ء سے پہلے لکھے ہیں نگاہ کو فرحت بخشتے ہیں، تو ہفت قلم ہوئے نا وہ! ان کے قلم کی اچھی اچھی تحریریں بھی ملتی ہیں اور بُری سے بُری بھی کہ پڑھنا مشکل ہوتا ہے۔

ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کی شانِ تحریر کا کیا کہنا! ان کے چھوٹے صاحبزادے اور میرے دوست مسلم صدیقی مرحوم نے اپنا خط ان کے خط سے ایسا ملا دیا تھا کہ دونوں کے خطوں میں تمیز مشکل ہے، آخر میں مولوی عبدالحق صاحب کی تحریر کا ذکر کرنا ضرور ہے جن کے خط میں حُسن اور پختگی ہے، حیدرآباد کے قیام کے دوران لکھے ہوئے خطوط اور ان خطوط میں جو انہوں نے بہت بعد کو کراچی سے لکھے ہیں مجھے ذرہ برابر فرق نظر نہیں آتا۔

میں نے آپ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی لاہور اور کیمبرج کے زمانہ قیام کی کوئی تحریر نہیں دیکھی، لیکن میرا قیاس ہے کہ مولوی صاحب کی طرح آپ کے عنفوانِ شباب کی تحریریں بھی ویسی ہی دلکش ہوں گی جیسی اب ہیں۔

یہ جملۂ معترضہ کچھ طویل ہوگیا، معذرت چاہتا ہوں لیکن یہ لکھے بغیر نہیں رہ سکتا

Marfat.com

کہ اگر کسی خوش نصیب کے پاس آپ کے پچاس ساٹھ خط بھی جمع ہوں تو اس پر لازم ہے کہ وہ ان کا عکسی ایڈیشن شائع کر کے آپ کے دوستوں کو نہال کرے۔

تو آخر تین سوا تین مہینے کے بعد ہی سہی میرا مرسلہ پیکٹ آپ کو مل گیا، آپ کو وہ تحریرات پسند آئیں، یہ جان کر خوشی ہوئی، علی گڑھ سے متعلق کچھ اور کتب و رسائل بھی بھیجوں گا، ممکن ہے کسی میں آپ کو کام کی کوئی چیز مل جائے۔ پروفیسر نورالحسن نقوی کی علی گڑھ کے موضوع پر ایک انگریزی مصوّر کتاب شائع ہونے والی ہے۔ لاکھ دو لاکھ کا خرچ ہے لیکن انتظام ہو رہا ہے۔ اِن شاء اللہ کتاب چھپتے ہی آپ کو بھیجی جائے گی۔ آپ پسند کریں گے۔

آپ کی موسیقی والی کتاب میں نے اپنے دوست کے یہاں سے واپس منگوالی تھی اور مطالعہ کر کے اپنی پسندیدہ کتابوں کے شلف پر رکھوادی ہے، کتاب بہت پسند آئی اور میرے معلومات میں اضافہ ہوا۔ خدا آپ کو خوش رکھے کہ کیسے کیسے موضوعات پر لکھ کر آپ قارئین کے دماغ کو روشن اور دل کو مسرور کرتے ہیں۔

ہاں سوادِ خط ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کا بھی خوب ہے، میں ان پر رشک کرتا ہوں، ان کے شانِ خط پر بھی اور ان کی علمی کاوشوں پر بھی، ان میں بڑی خوبی یہ ہے کہ اپنے خیالات بہت تیزی سے کاغذ پر منتقل کر لیتے ہیں۔ انہوں نے ہزار سے زیادہ مضامین لکھے ہوں گے، متعدد تصانیف ان پر مستزاد، ان کی عمر اب ۹۱ سال کی ہوگی پھر بھی ان کا قلم رواں دواں ہے اور دماغ شاداب، حافظہ مضبوط اور معلومات مستحضر، افسوس کی بات یہ ہے کہ ان کی بصارت اب کمزور ہوگئی ہے، دہلی کے ماہرین چشم سے انھوں نے مشورہ کیا، بے سود، کہتے ہیں اخباروں کی سُرخیاں پڑھ سکتا ہوں۔ چند سطریں لکھنی مشکل ہوگئی ہیں، خدا انہیں شفا دے۔

بڑے مخلص دوست ہیں، اس طرف تین دنوں میں دو بار ملنے تشریف لائے، جو مجموعۂ مضامین وہ ایوانِ غالب کے لیے آج کل مرتب کر رہے ہیں اس کے بارے میں دیر تک گفتگو کرتے رہے۔ کہتے تھے معیاری مضامین لوگ عام طور پر نہیں لکھتے، صرف خانہ پری کر دیتے ہیں، وہ غالب نامہ کے ایڈیٹر ہیں اس لیے انہیں اس کا زیادہ تجربہ ہے۔ میں نے ان سے اس بات کا تذکرہ کیا کہ آپ اپنے والد صاحب پر ایک

Marfat.com

کتاب لکھنی چاہتے ہیں، وہ سُن کر خوش ہوئے، وہ آپ کے والد صاحب کی علمی کوششوں کے بڑے قدرداں ہیں اور تحقیق و تصحیح متن کے کام میں انھیں بہت اونچا مقام دیتے ہیں، ''راحۃ الصدور'' کی تصحیح و تہذیب اور تخریج کو وہ مثالی کام قرار دیتے ہیں، انہوں نے اپنے کئی مضمونوں میں پروفیسر محمد اقبال صاحب کی ''راحۃ الصدور'' کا ذکر کیا ہے، اگر آپ چاہیں گے تو وہ ایک نیا مضمون (اس حال میں بھی) پروفیسر صاحب مرحوم پر لکھ دیں گے، میں نے انہیں آمادہ کرلیا ہے۔

آپ کی مطلوبہ کتابیں (ستیارتھ پرکاش، حیاتِ بوعلی قلندر، دبستانِ مذاہب، کلیاتِ عطار، دیوانِ فیضی، دیوانِ سنائی، سیرالمتاخرین، نشترِ یاس، آیاتِ وجدانی) افسوس ہے کہ اب تک فراہم نہ ہوسکیں، دانش محل، امین آباد لکھنؤ سے خط واپس آ گیا تھا، اب میں نے ایک اور صاحب کو لکھا ہے کہ وہ خود صاحب مکتبہ سے جا کر ملیں۔

بدلتے ہوئے حالات میں آج کل کے لوگ اُردو کی نئی کتابوں کے خریدنے اور پڑھنے کا شوق نہیں رکھتے، پرانی کتابیں کون خریدے اس لیے آہستہ آہستہ نوادر اور قدیم مطبوعات بیچنے والے دُکان بڑھاتے جلے [illegible]۔ اب نہ وہ نخاس پر کی قدیم دکانیں ہیں نہ مسعود حسن رضوی جیسا کوئی شائق ہے جو گھنٹوں پُرانی کتابیں بیچنے والوں کے گھروں اور [illegible] پر بیٹھ کر اپنی پسند کی کتابیں چھانٹا کرتے تھے، نہ وہ نادر آغا اور شمس علوی ہیں جو اپنے یہاں کی کتابوں کی فہرستیں چھاپ کر بھیجتے تھے، جن سے میں اور مالک رام صاحب اور دوسرے صاحبانِ ذوق کتابیں خریدتے تھے۔ بدایوں کے مونس بُکڈپو والے لشٹم پشٹم یہ کام کیے جارہے ہیں۔ ان کی ایک شاخ علی گڑھ میں ہے، آپ کی مطلوبات انہیں بھی لکھوادی ہیں، ان کا نام مقیم الدین بدایونی ہے۔

موقع ہو تو اپنے خطوط کا دوسرا مجموعہ ضرور شائع کیجئے، اس طرح خطوط محفوظ ہوجاتے ہیں۔

آپ کو اور گیان چند صاحب کو ''مختار نامہ'' کا نسخہ بھجوایا گیا تھا، آپ کے خط میں اس کا کوئی ذکر نہیں، جین صاحب کا بھی کوئی خط نہیں آیا، عبدالوہاب سلیم صاحب نے کچھ نسخے احباب میں تقسیم کرنے کے لیے منگوائے تھے۔ کیا نجم الاسلام مرحوم (شعبہ اردو، سندھ یونیورسٹی) کا رسالہ ''تحقیق'' آپ کی نظر سے گزرتا رہا ہے؟ کچھ ایسا یاد آتا ہے کہ اس کا ''گوشہ مختار الدین احمد'' آپ کو اور سلیم صاحب کو بھیجا گیا تھا، آپ کو نہ ملا ہو تو ان سے کبھی پوچھیے گا۔

Marfat.com

خط کی طوالت اور نظر خراشی کی معذرت چاہتا ہوں ، اُمید ہے آپ بخیر ہوں گے اور ٹھنڈک اور سرد ہواؤں کا لطف اُٹھا رہے ہوں گے۔

والسلام

خیر طلب

مختار الدین احمد

(۳)

میں اِن دنوں اپنے والد مرحوم پروفیسر شیخ محمد اقبال (اُستادِ ادبیاتِ فارسی، اورینٹل کالج، لاہور) کی سوانح عمری لکھنے میں مشغول ہوں۔ مرحوم نے چھ برس (۱۹۱۱تا ۱۹۱۷ء) علی گڑھ کے مدرسۃ العلوم میں تعلیم پائی اور ۱۹۱۷ء میں وہاں سے عربی میں ایم اے پاس کیا، اس شش سالہ قیام کی سوچ لگی تو رہ رہ کر یہ سوال ذہن میں آیا کہ علی گڑھ میں اُن دنوں برقی روشنی آ چکی تھی یا نہیں، میں نے پروفیسر مختار الدین احمد صاحب کو یہ سوال لکھ بھیجا اُنھوں نے ایک نوازش نامہ (مؤرخہ ۲۴/اپریل ۲۰۰۳ء) میں کمال اعتنا کے ساتھ میرے سوال کا جواب لکھا جو مشفقانہ بھی ہے اور محققانہ بھی، اسے پڑھ کر چودہ طبق روشن ہوئے، اس کی اہمیت کا تقاضا ہے کہ اسے یہاں نقل کیا جائے:۔

> ''آپ جاننا چاہتے ہیں کہ علی گڑھ میں بجلی کب آئی اور یہ کہ ۱۹۱۱ء۔ ۱۹۱۷ء میں ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب مطالعہ بجلی کی روشنی میں کرتے تھے یا لالٹین کی روشنی میں یا مٹی کے دیے کی روشنی میں؟
>
> اوّل الذکر اور آخر الذکر صورت تو مسترد کیجیے کس واسطے کہ مٹی کے دیے کا زمانہ لد چکا تھا اور بجلی کی روشنی علی گڑھ میں اس وقت تک آئی نہیں تھی، لالٹین کی روشنی کا رواج گھروں میں تو تھا لیکن مدرسۃ العلوم کے مشاہیر، یوروپی اساتذہ اور اچھے منصب رکھے والے سول حکام کی کوٹھیوں میں بڑے بڑے لیمپ ہوتے تھے جس میں کبھی ایک، کبھی دو بتیاں ہوتی تھیں، اس میں ایک چمنی ہوتی تھی اور اس کے اوپر شیشے ہی کی خوبصورت ہانڈی ہوتی تھی، یہ صاف

Marfat.com

شفّاف بھی ہوتی تھی اور یہ ہانڈیاں دو دھیا رنگ کی بھی ہوتی تھیں، پہلی، پڑھنے لکھنے کے کام آتی تھیں اور دوسری دیوان خانوں کو روشن کرتی تھیں ، یہ قیمتی ہوتی تھیں اور زیادہ تر ولایت سے آتی تھیں۔

میں چند اُن اصحاب کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں جنھوں نے سرسید کی آنکھیں دیکھی تھیں، صدر یار جنگ، شیخ عبداللہ، مقتدیٰ خاں شروانی، منشی نجم الدین۔آخر الذکر پر آپ نے شاید میرا مضمون پڑھا ہو ، پہلی مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی نے ''نئی تحریریں'' (لاہور) میں چھایا تھا، ان حضرات سے سرسید کی زندگی کے بارے میں کچھ پوچھتا رہتا تھا، آخر عمر میں ان کے جو دن سرسید ہاؤس میں گزرے ان کے بارے میں استفسار پر ان میں سے بعض اصحاب نے بتایا تھا کہ شب کے وقت سرسید کی اس کوٹھی میں شیشے کے بڑے بڑے متعدد لیمپ جلتے تھے اور وہ اس کی روشنی میں اپنا نوشت و خواند کا کام کرتے تھے،.کلکتہ کے انگریز حکام اور بنگالی اُمرا اور مسلمان رئیسوں کے مکانوں میں اُسی لیمپ کا رواج تھا، یہ انگریز اپنے ساتھ لائے ہوں گے، پھر ولایت سے منگوانے لگے ہوں گے اور مدّتوں بعد ہندستان میں بھی بننے لگے ہوں گے، ۱۹ویں صدی کے اواخر ہی سے کلکتہ کے انگریز تاجروں کے سامان کی انگریزی میں فہرستیں مع قیمت شائع ہوتی رہتی تھیں۔یاد آتا ہے کہ اس میں مختلف سایز اور مختلف قیمتوں کے روشنی کے لیمپوں کے اشتہارات بھی ہوتے تھے۔کلکتہ کی نیشنل لائبریری میں یہ کیٹلاگ شاید اب بھی مل جائیں۔ان سے قیمت بھی معلوم ہوسکتی ہے۔افسوس ہے کہ یہ کیٹلاگ نہ علی گڑھ میں مل سکتے ہیں نہ فلوریڈا میں، لیکن تلاش اور کوشش تو جاری رکھنی چاہیے۔

ہاں سرسید کے ایک خط میں جوان کے مجموعۂ خطوط میں ابھی شامل نہیں ہوا ہے یہ عبارت ملی:

Marfat.com

عزیزی احمد الدین!

ہمارے ہاں سے سید حامد پُرانے لیمپ سبز رنگ کے لے گئے تھے، وہ لیمپ معمولی تیل ارنڈی یا سرسوں کے جلنے کے ہیں۔ ان لیمپوں کے دو عدد شیشہ ہوتے ہیں، ایک چمنی اور دوسری چھوٹی ہانڈی۔

میں مدرسۃ العلوم کے لیے سو لیمپ اسی طرح جس میں معمولی تیل جلے، بنوانا چاہتا ہوں ٹین کے لیمپ تو بعینہٖ اسی قطع کا اور صرف چمنی اس میں ہو۔ ہانڈی کی ضرورت نہیں، بس تم وہاں کے کاریگروں سے پوچھو کہ بنا دیں گے اور فی لیمپ کیا دام لیں گے، بغیر ہانڈی کے صرف چمنی ہوگی۔

سید احمد علی گڑھ ۵/نومبر ۱۸۸۹ء

سرسید کے مکتوب الیہ ان کے بھانجے حکیم احمد الدین ہیں جو دہلی میں مقیم تھے اور سرسید کے مکانات اور ان کی جایداد کی دیکھ بھال کرتے تھے، سید حامد، سرسید کے بڑے صاحب زادے تھے (تاریخ وفات جنوری ۱۸۹۴ء) سو لیمپ ہوسٹل کے طالبعلموں کے لیے بنوانا چاہتے ہوں گے، وہ کراسین آیل کی جگہ ارنڈی یا سرسوں کا تیل استعمال کرنا پسند کرتے ہوں گے، ہانڈی (یعنی شیشے کا سرپوش) اس لیے نہیں چاہتے ہوں گے کہ لیمپ کی قیمت زیادہ نہ ہو اور مدرسۃ العلوم کے طلبا زیر بار نہ ہوں۔

ایک عزیز، پروفیسر افتخار عالم خاں، یونیورسٹی سے متقاعد ہونے کے بعد علی گڑھ پر مفید کام کر رہے ہیں، ان کی تین کتابیں اب تک شائع ہو چکی ہیں:۔ سرسید اور سین ٹیفک سوسائٹی (مکتبۂ جامعہ جامعہ نگر دہلی ۲۰۰۰ء)، سرسید اور فنِ تعمیر (سرسید اکیڈیمی، علی گڑھ ۲۰۰۱ء) اور مسلم یونیورسٹی کی کہانی عمارتوں کی زبانی، ۱۹۲۰ء۔ ۱۹۴۷ء (عالم منزل، زہرہ باغ، علی گڑھ ۲۰۰۲ء)۔ آپ کے استفسار علی گڑھ میں بجلی کی روشنی کی آمد کے سلسلے میں، یونیورسٹی گزٹ،

Marfat.com

دوسری تصانیف اور کچھ حال کی چھپی ہوئی کتابوں کا مطالعہ کررہا تھا کہ ۱۸۷۸ء میں فرسٹ کلاس بورڈروں کے اخراجات کے سلسلے میں یہ اطلاع ملی کہ کمرے کی شطرنجی پچیس روپے کو، نواڑ کی پلنگ دس روپے کو، دو کرسیاں اور ایک میز بیس روپے میں اور ایک لیمپ کم سے کم پانچ روپے میں بازار سے خریدا جاتا تھا۔ میں نے افتخار عالم صاحب سے مزید معلومات اس سلسلے میں چاہیں تو انہوں نے لکھا ''فرسٹ کلاس بورڈر جو لیمپ استعمال کرتے تھے وہ اُن کو خریدنا پڑتا تھا جس کی قیمت پانچ روپے ہوتی تھی (جو میرے خیال میں بہت گراں تھی، یعنی ہماری سرسری اندازے کے مطابق یہ رقم آج کے تقریباً سات سو روپے کے برابر)۔ اس وجہ سے یہ قیاس کیا جاسکتا ہے۔ کہ یہ لیمپ بہت عمدہ کوالٹی کے غالباً امپورٹڈ ہوتے تھے۔''

میرا بھی یہی خیال ہے کہ یہ لیمپ انگلستان یا بیلجیم کے بنے ہوں گے۔ بیلجیم، شیشے کے ظروف کے لیے مشہور ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ لیمپ انگلستان میں بنتے ہوں اور اس کی چمنی اور گلوب بیلجیم کے ہوں اور انگریز تاجر ہندوستان بھیجتے ہوں۔ سرسید کا خط بنام احمد الدین ۱۸۸۹ء کا لکھا ہوا ہے۔ اب سرسید کو جو مدرسۃ العلوم کی چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال رکھتے تھے احساس ہوا ہوگا کہ یہ ولایتی لیمپ گراں ہیں۔ دہلی میں مقامی طور پر بنوائے جائیں تو طالب علموں کو آسانی ہوگی۔۔

لیکن اب تک کی معلومات سے جو پیش کی گئیں آپ کا مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ آپ کی موجودہ دلچسپی تو یہ جاننے میں ہے کہ علی گڑھ میں ۱۹۱۱ء۔ ۱۹۱۷ء میں ہوسٹلوں میں بجلی کے بلب روشن تھے یا لالٹین اور لیمپ وغیرہ تو اس کے لیے میں افتخار عالم صاحب کی کتاب ''سرسید اور فن تعمیر'' کے دو صفحوں کا عکس بھیجتا ہوں جس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۱۶ء میں کچی بارک یعنی سید محمود کورٹ میں بجلی کی روشنی کا ''واجبی'' سا انتظام کردیا گیا تھا۔

Marfat.com

۱۵ر اکتوبر ۱۹۱۷ء میں باقاعدہ برقی روشنی کا انتظام صرف سرسید کورٹ یعنی پکی بارک میں کیا گیا اور اس کا افتتاح بدست آنریری سیکرٹری عمل میں آیا۔ مجھے معلوم نہیں آپ کے والد مرحوم کا قیام کچی بارک میں تھا یا پکی بارک میں۔ میرا خیال ہے کہ ۱۹۱۱ء میں وہ وہاں داخل ہوئے تو ان کے کمرے میں لیمپ جلتا ہوگا لیکن علی گڑھ سے ان کے رخصت ہونے سے پہلے ان کے ہاسٹل میں بجلی کی روشنی آ گئی ہوگئی۔ میرا یہ بھی خیال ہے کہ ۱۸۸۹ء میں لیمپ میں سرسوں یا ارنڈی کا تیل ڈالا جاتا ہوگا لیکن ۱۹۱۱ء اور اس کے بعد کیروسین آئل یعنی مٹی کا تیل استعمال کیا جاتا ہوگا۔"

ڈاکٹر مختارالدین احمد خط بڑے التفات کے ساتھ جی لگا کر لکھتے ہیں، آپ کا حلقۂ احباب بہت بڑا ہے، تین برادریوں سے آپ کا رشتہ استوار ہے، علم کی عالمی برادری، اُردو برادری اور علیگ برادری، حفظ مراسم ان کا شیوہ ہے، اسلاف کی روحوں سے بھی آپ کی محبت کی انتہا نہیں، جو سلف کی یاد منائے گا خلف اس کی یاد منائیں گے۔

☆☆☆

Marfat.com

پروفیسر اسلوب احمد انصاری

سابق صدر شعبۂ انگریزی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

نقوشِ آرزو

پروفیسر مختار الدین احمد کا شمار جائز طور پر علی گڑھ یونیورسٹی، ہند اور بیرونِ ہند خاص طور پر عربی ممالک کے بڑے مقتدر عالموں میں ہوتا ہے۔ اپنی ابتدائی تعلیم و تربیت اور اپنے علمی کیریر کے تناظر میں ان کا بیشتر سروکار عربی علم و ادب سے رہا ہے، ان کا اصل میدان تحقیق ہے اور ضمن میں انھوں نے بہت سے علمی کارنامے انجام دیے۔ ان کا علمی حلقوں میں بڑی توجہ اور فراخ دلی کے ساتھ اعتراف بھی کیا گیا اور ان کی پذیرائی بھی ہوئی۔ انھیں اس امر کا امتیاز حاصل ہوا کہ ایک طرف وہ علی گڑھ میں علامہ عبد العزیز میمن جیسے ممتاز اور جیّد عالم کے شاگرد رہے اور دوسری جانب انگلستان میں آکسفورڈ یونیورسٹی جیسی بڑی درسگاہ کے دوسرے بڑے جیّد عالم پروفیسر گب کی رہنمائی میں انھوں نے اپنے علمی اور تحقیقی کارناموں کو جاری رکھا اور اتمام کو پہنچایا اور نتیجۃً علی گڑھ یونیورسٹی سے پی ایچ۔ ڈی اور آکسفورڈ یونیورسٹی سے ڈی، فلی کی ڈگری حاصل کی۔ ایک طرح سے انھوں نے دُہرا فیضان حاصل کیا، اپنے قیام یوروپ کے دورانِ اپنے تحقیقی مقالے کے سیاق و سباق میں انھوں نے مغرب کی بہت سی لائبریریوں میں نادر مخطوطات کا بھی پتا چلایا، بہت سے نادر مخطوطات کا انھوں نے تعارف کرایا اور متعدد نادر کتابوں کو انھوں نے ایڈٹ کر کے منظر عام پر لانے کا جتن کیا جن کا کسی اور کو علم نہیں تھا۔ مثال کے طور پر انھوں نے ۱۹۵۵ میں جرمنی میں فضلی کی کربل کتھا کا مخطوطہ دریافت کیا اور ہندوستان مراجعت پر اسے بڑی دیدہ ریزی کے ساتھ ایڈٹ کیا اور اہل دانش و بینش کو اس سے روشناس کرایا۔

مختار الدین احمد صاحب قدیم نسخوں کی پرکھ اور ان کی تہذیب و تدوین کی صلاحیت بدرجہ اولیٰ رکھتے ہیں۔ اس ملک میں جو جیّد اور بلند پایہ محققین ہوئے ہیں اور آج بھی موجود ہیں جیسے قاضی عبد الودود صاحب، حافظ محمود شیرانی صاحب، پروفیسر ڈاکٹر عبد الستار صدیقی، امتیاز علی عرشی صاحب، مالک رام صاحب، پروفیسر نذیر احمد صاحب اور رشید حسن خان صاحب، ان سب کے کارنامے بہت وقیع اور قابل رشک ہیں، مختار الدین

Marfat.com

احمد صاحب کا شمار اسی نورانی حلقے میں ہوتا ہے اور وہ بھی اسی پایے کے محقق اور عالم ہیں۔ کسی مخطوطے کو صحت اور احتیاط کے ساتھ مرتب کرنا اور اس کے لیے تعلیقات کا لکھنا بڑی جگر کاوی اور محنت پژوہی کا کام ہے اور حد درجہ حسن نظم کا مطالبہ کرتا ہے۔ شروع سے ہی مختار الدین احمد صاحب کی دلچسپی اردو علم و ادب سے بھی رہی ہے اور یہ بڑی گہری بنیادوں پر قائم ہے۔ غالب کے حالات اور خطوط کے سلسلے میں ان کی کاوشیں اور دلچسپیاں اتنی متنوع اور اہم رہی ہیں کہ ان کا نام بجا طور پر دوسرے ماہرین غالبیات کے ساتھ لیا جاتا ہے، غالب پر کام کرنے والا کوئی نقاد اور محقق ، غالب کا کوئی شیدائی اور پارکھ ان کی مرتب کردہ احوال غالب اور نقد غالب اور ان کے مقالات سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔

در اصل تحقیق کی چینک مختارالدین احمد صاحب کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ یورپ کی جن جن لائبریریوں میں وہ تشریف لے جاتے تھے بہت کم وقت میں وہ یہ اندازہ لگا لیتے تھے کہ وہاں ان کے کام کا مال کسی گوشے میں پڑا ملے گا، اور وہ فوراً اپنے کام میں مصروف ہوجاتے تھے، مزید برآں انھیں نہ صرف مشاہیر کے خطوط جمع کرنے اور انھیں مرتب کر کے شائع کرنے کا برابر شوق رہا ہے بلکہ انھوں نے خود بھی دوستوں اور اہل علم کو لا تعداد خطوط لکھے ہیں، وہ ہر ہر خط بڑی تفصیل ، احتیاط اور محنت کے ساتھ لکھنے کے عادی رہے ہیں اور اس کام پر بڑا وقت صرف کرتے ہیں ۔ یہ ایک بڑا صبر آزما اور شکیب طلب کام ہے جو بڑی توجہ اور فرصت کا مطالبہ کرتا ہے ۔ مختار الدین احمد صاحب کی علمی اور تحقیقی کاوشوں اور کارناموں کا اعتراف ان کی بین الاقوامی کانفرنسوں اور سیمناروں میں شرکت سے بھی ظاہر ہوتا ہے جو اسلامی ممالک خصوصاً شام اور اُردن میں بار بار منعقد کی جاتی ہیں، اور اس تاحیات وظیفے سے بھی جو حکومت ہند کی طرف سے انھیں برابر پیش کیا جارہا ہے ۔ حکومت ہند کی طرف سے ان وظائف کا جاری کیا جانا کلاسیکی زبان بہ شمول عربی اور فارسی کے بڑی اہمیت کا حامل ہے اور ان زبانوں پر حکومت کی سرپرستی کا اظہار ہے۔

مختار الدین احمد صاحب نہ صرف ایک ذی علم انسان ہیں بلکہ بڑے مخلص دوست بھی ہیں، خلوص اور بے ریائی ان کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ راقم الحروف کا ان سے ربط و تعلق اور رشتۂ مودت و اخلاص تقریباً نصف صدی کو محیط ہے ، تعلقات کی جو سمت و رفتار اور معیار اول دن قائم ہوا تھا وہ آج تک باقی ہے، ان میں کوئی مد و جزر اور تلاطم نمودار نہیں ہوا ۔ ان تعلقات کی ابتدا اس وقت ہوئی تھی جب وہ اور راقم الحروف بالترتیب شعبۂ عربی و انگریزی میں اپنے فرائض انجام دیتے تھے اور پھر ایک ہی

Marfat.com

سال یونیورسٹی کی خدمت سے سبکدوش ہوئے۔ وہ ایک بہت ہی معتدل اور متوازن مزاج کے آدمی ہیں اور ہر طرح کے لوگوں کو انگیز کرنے اور ان سے تعلقات نبھانے کا فن جانتے ہیں ۔ راقم الحروف نے انھیں کبھی مضطرب ، بے چین اور خشمگین نہیں دیکھا، تہذیب و شائستگی، میانہ روی اور نرم گفتاری ان کی شخصیت کا جزو اعظم ہیں ، وہ مخالف رائے کو بڑی خندہ پیشانی اور صبر وسکون کے ساتھ سننے کے لیے ہمیشہ آمادہ رہتے ہیں ۔علی گڑھ کی ایک بہت ہی معروف اور اہم ادبی شخصیت کے بارے میں راقم الحروف کا تاثر یہ ہے کہ وہ بیک وقت Irritating اور Irritable ہیں مختار الدین احمد صاحب پر ان کے برعکس اس طرح کا کوئی الزام عائد نہیں کیا جاسکتا۔ راقم الحروف نے جب بھی کسی معاملے میں ان سے کسی امر میں مشورہ طلب کیا اور ان کی اعانت چاہی، انھوں نے ہمیشہ کمال فراخ دلی اور خندہ پیشانی کے ساتھ اظہار رائے بھی کیا اور صحیح سمت میں رہنمائی بھی کی ۔ان کا رویّہ مجموعی طور پر اعتدال اور میانہ روی کا رویّہ کہا جاسکتا ہے۔ وہ پڑھنے لکھنے میں اپنے معمولات کے سخت سے پابند ہیں ۔آپ کسی وقت بھی ان کے یہاں جائیں انھیں پڑھنے لکھنے میں مصروف پائیے گا ۔لیکن اس کے باوجود وہ کسی آنے جانے والے کی آمد سے کبھی آزردہ خاطر نہیں ہوتے اور نہ پہلو بدلتے ہیں ، وہ کشادہ دلی کے ساتھ دوسروں کو سننے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے ہیں ،اور اس کے لیے بڑی خوبی کی ساتھ وقت نکال لیتے ہیں۔ وہ کسی معاملے میں Partisan رویّہ نہیں رکھتے، بلکہ ہر معاملے کے مختلف پہلوؤں کو چھان پھٹک کر اپنی ترجیح کا اظہار کرتے ہیں ۔انھیں کسی طرح بھی انتہا پسند نہیں کہا جاسکتا ۔ان کا ایک معمول یہ بھی ہے کہ وہ عربی فارسی اور اردو زبانوں سے دلچسپی اور ان میں مہارت کے باوصف دیگر زبانوں اور دوسرے علوم کی تازہ مطبوعات کا خیر مقدم کرنے کیے لیے بھی ہمیشہ آمادہ اور مستعد رہتے ہیں، بلکہ انھیں حاصل کرنے کے لیے چشم براہ رہتے ہیں اور اولین فرصت میں انھیں پڑھ کر ان پر اپنی رائے قائم کر لیتے ہیں ۔ جہاں تک ذاتی مشاہدے اور تجربے کا تعلق ہے اس کی بنا پر راقم الحروف کو یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ وہ ہر شخص کے مفاد، دلچسپی اور ترجیحات کی مناسبت سے اسے صحیح مشورہ دینے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے ہیں ۔ اتنی بہت خوبیوں کا کسی ایک شخص کی ذات میں مجتمع ہوجانا محل حیرت بھی ہے اور باعث مسرت بھی ۔ان میں اعلیٰ درجے کی بھلمنساہت پائی جاتی ہے ۔ جو سو خوبیوں کی ایک خوبی ہے اور جو ہر طرح کی خوبیوں کا احاطہ کرتی ہے۔

بہت عرصہ تک مختار الدین احمد صاحب کے بارے میں جو بالعموم آرزو صاحب

Marfat.com

کے نام سے جانے پہچانے جاتے ہیں، یہ خیال رہا کہ شاید انھوں نے اپنے لیے تخلص کا انتخاب تو کرلیا تھا لیکن بہ تامل دیگر شعر گوئی سے عمداً احتراز کیا، کیونکہ ان کا کلام نہ کہیں دیکھنے میں آیا تھا اور نہ کبھی انھیں مشاعروں میں شرکت کرتے دیکھا گیا۔ لیکن ''نذر مختار'' میں جب ان کی شاعری پر مالک صاحب مرحوم جیسے صاحب نظر کا مضمون مع نمونۂ کلام دیکھنے کا اتفاق ہوا تو اسے پڑھ کر یہ انداز ہوا کہ ان کا کلام تو بہت سے مشہور و معروف اور سکّہ بند شاعروں کے کلام پر بھاری ہے۔ معلوم نہیں کہ انھوں نے ذوق شعر گوئی کو کب اور کن محرکات کے تحت ترک کیا، لیکن یہ بات دلچسپ ہے کہ انھوں نے مالک رام صاحب کے افشائے راز پر نہ تو احتجاج کیا اور نہ وہ کبھی اپنا کلام مشتہر کرنے پر مصر ہوئے۔ لیکن غالباً تحقیق سے ازلی دلچسپی نے انھیں شعر و سخن کی وادی پر خار میں زیادہ عرصے تک بھٹکنے نہیں دیا اور شعر و سخن کی دیوی سے ہمیشہ گریزاں اور دامن کشان ہی رہے۔ باوجود ایک علمی اور پروقار خانوادے سے متعلق ہونے کے آرزو صاحب کے مزاج میں قلندری نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس زندگی اور زمانے کو برتنے میں مصلحت اندیشی اور دور بینی ہے۔ لیکن اس سے کوئی منفی اور مضر اثرات ان کی شخصیت پر مرتب نہیں ہوئے۔ انھوں نے اپنی ذات کے گرد منافقت کا خول کبھی نہیں چڑھایا جو اکثر لوگوں کو کم ظرفی برتنے پر اکساتا ہے۔ اسلامی اخلاق و اقدار میں منافقت کا شمار معائب کبیرہ میں کیا جاتا ہے۔

پیرایۂ بیان بدل کر اور مثبت انداز میں یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ راقم الحروف کے اندازے کے مطابق آرزو صاحب کی ذات میں دو ایسی خوبیوں کا امتزاج ملتا ہے جو بڑی ہی قابل قدر اور نمایاں ہیں، یعنی تحمل اور کریم النفسی یعنی Benovalenle۔ دراصل صحیح معنوں میں قابل تعریف اور قابل احترام وہی شخص ہے جو اپنے آپ سے اوپر اٹھ کر اور اپنی ذات سے پرے جا کر دیکھنے کی صلاحیت رکھتا ہو اور دوسروں کو نفع اور فیض پہنچانے کے بہانے ڈھونڈتا ہو۔ مختار الدین صاحب کے مزاج میں، ٹھہراؤ، سنجیدگی اور بردباری کے پہلو بہ پہلو حِس، مزاح کی بھی ہے اور راقم الحروف کے خیال میں جس شخص کے مزاج اور شخصیت میں حسِ مزاح پایا جائے تو وہ اسکی ذہانت اور کشادہ قلبی دونوں پر دلالت کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ انھیں اپنے کاموں میں حوصلہ مندی اور خلوص و دیانت داری کے ساتھ تادیر مصروف رہنے کا موقع عطا کرے تاکہ اہلِ علم کے درمیان انھوں نے جو صالح ستھری روایت قائم کی ہے وہ باقی رہ سکے اور اس میں روز افزوں ترقی ہو۔

☆☆☆

Marfat.com

ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب
۷۳، پھول والان، بریلی

ڈاکٹر مختار الدین احمد
(چند مکاتیب کے آئینے میں)

ڈاکٹر مختارالدین احمد صاحب مکتوب نگاری کے سلسلے میں نہایت مستعد واقع ہوئے ہیں۔ اُن کے خطوط بڑی تعداد میں میرے پاس محفوظ ہیں۔ ان کے خطوط سے ان کے علمی تبحر، اُن کے ذوق وشوق تحقیق اور ان کی شخصیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر مختار الدین صاحب خطوط کے خارجی مطالعے میں بعض باتیں قابلِ ذکر ہیں۔ مثلاً ان کو پوسٹ کارڈ لکھنا ہی پسند ہے اور چونکہ ان کی تحریر بہت باریک ہے، ان کے ایک پوسٹ کارڈ میں ایک لفافے کا مضمون آ جاتا ہے۔ اُن کے خطوط کے بالائی بائیں کونے پر پتے کی مُہر لگی ہوتی ہے۔ ایسے مکتوب نگار زیادہ تعداد میں نہیں ہیں جو پتا لکھنے کے لیے مُہر استعمال کرتے ہوں، لیکن یہ طریقہ سود مند ہے۔ خط کا جواب لکھتے وقت پتا لکھنے میں آسانی ہوجاتی ہے۔ خاص طور پر مکان کا نام اور نمبر لکھنے میں غلطی نہیں ہوتی۔ ان امور کے علاوہ ڈاکٹر صاحب کی تحریر کی انفرادیت ہے جو نہ خالص نسخ ہے اور نہ خالص نستعلیق۔ دونوں خطوں کا امتزاج جیسا اور مائل بہ شکستہ۔ دیکھنے میں جاذب پڑھنے میں مشکل۔ مختصر یہ کہ ان خطوط کے مشاہدے سے ڈاکٹر صاحب کی فطری خوش سلیقگی اور ان کے جمالیاتی حس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب کے خطوط کبھی علمی استفسارات پر مشتمل ہوتے ہیں تو کبھی کسی کے جواب میں معلومات سے لبریز۔ اُن میں معلومات کو حاصل کرنے اور معلومات کو دوسروں تک پہنچانے کا جذبہ بدرجہ اتم ملتا ہے۔ ایسے مواقع پر اُن میں جزوری قطعاً نہیں ملتی۔ ان کی پیش کردہ معلومات بہت مفصل ہوتی ہیں۔ اُن سے ان معلومات پر مزید گفتگو کی جاسکتی ہے۔ ان کو جواب بھیجنے میں کبھی تکلف نہیں ہوتا اسی طرح ان کو کوئی بات معلوم کرنی ہوتی ہے تو اس کا برملا اظہار کردیتے ہیں۔ اگر اُن کو فراہم کردہ معلومات سے تسلی نہیں ہوتی تو خطوط کے ذریعۂ گفتگو جاری رکھتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں ان کو دوسروں

Marfat.com

کے لیے معلومات حاصل کرنے میں بھی گریز نہیں ہوتا جو عالی ہمتی کی بات ہے۔

میں نے اس وقت ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب کے ۱۹۹۹ء سے ۲۰۰۲ء تک کے وصول شدہ خطوط میں سے چند مکاتیب کو سامنے رکھ کر مثالیں پیش کی ہیں۔

غالب کے شاگرد مفتی سلطان حسن خاں احسن بریلوی (م۱۸۸۲ء) اور مفتی سعد اللہ مرادآبادی (م ۱۸۷۷ء) کے مابین علمی بحث کا ثبوت ملتا ہے۔ مفتی سعداللہ مرادآبادی نے مفتی سطان حسن خاں احسن کے اُستاذ مولانا فضل حق خیرآبادی (م ۱۸۶۱ء) کی تالیف ''ہدیۂ سعیدیہ'' پر اعتراضات وارد کیے تھے جس کا جواب مفتی سلطان حسن خاں احسن نے ''بنات سعد'' تالیف کرکے دیا تھا۔ (مطبوعہ شعلۂ طور کانپور۔ ۱۸۷۱ء)۔ دونوں نے ہی قصیدۂ بردہ کی شروح تحریر کیں۔ مفتی سلطان حسن خاں احسن کی شرح قصیدۂ بردہ اور'' بنات سعد''تو دستیاب نہیں ہوئیں لیکن میری دلچسپی قصیدۂ بردہ اور مفتی سعد اللہ مرادآبادی کی تالیف کردہ شرح سے ضرور بڑھ گئی۔ اس جستجو کے نتیجے میں قاضی شہاب الدین دولت آبادی (م۸۴۹ھ)، مولانا محمد عابد لاہور (م ۱۱۶۰ھ)، اوحد الدین بلگرامی اور نجف علی جھجری (م ۱۲۹۹ھ) کی شروح کا بھی علم ہوا۔ مجھے جب کوئی کتاب دستیاب نہیں ہوئی تو میں نے ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب کو خط لکھا جس کا نہایت مفصل اور معلومات سے لبریز جواب موصول ہوا۔ خط کی نقل مندرجہ ذیل ہے۔

باسمہ

ڈاکٹر مختار الدین احمد
ناظمہ منزل۔۲۸۶/۴
امیر نشاں روڈ۔ دودھ پور
علی گڑھ۔202002

علی گڑھ
۲۰۰۲/۴/۱۵ء

محبی۔ السلام علیکم

مکرمت نامہ مورخہ ۱۰/اپریل ملا۔ دو الگ الگ قصیدے ہیں، دونوں کے مصنفین علیحدہ علیحدہ ہیں گو نام دونوں کا قصیدۂ بردہ ہے۔

قصیدۂ میمیہ امن تذکر جیرانِ بذی سلمِ کے مصنف البوصیری، شرف الدین محمد (۶۰۸ء۔ ۶۹۶ ھ) ہیں۔ یہ کعب بن زُہیر کے قصیدے سے متاثر ہو کر نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی مدح میں لکھا گیا ہے، اسے قصیدہ بُردہ بھی کہتے ہیں۔

اصل اور قدیم نعتیہ قصیدہ ،قصیدہ بانت سُعاد (سعاد مجھ سے

Marfat.com

جدا ہوگئی) میں تشبیب کے اشعار کے بعد قصیدے کے دوسرے اجزا آتے ہیں ۔ یہ حضرت کعب بن زُھیر نے حضور پاک کی مدح میں لکھا ہے ۔ اس میں ۵۸ شعر ہیں ۔ اسے قصیدۃ البردہ اور قصیدۃ لامیہ بھی کہتے ہیں ۔

اسلامی تاریخ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ کعب بن زُھیر اپنی ھجوگوئی کی بناپر واجب القتل تھے، ۸ ھجری میں فتح مکہ کے بعد کعب کے بھائی بُجیر نے انھیں مشورہ دیا یا مدینہ چلے آؤ یا کہیں اور پناہ لے لو ۔ ہر طرف مایوس ہو کر کعب آخر کار مدینۂ منورہ آئے ۔ حضور نماز فجر کے بعد مسجد میں تشریف فرما تھے اور گرد صحابۂ کرام جمع تھے کہ کعب آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے ۔ عفو و تقصیر چاہی ۔ حضور نے انھیں معاف کردیا ۔ اس احسان کا شکریہ ادا کرنے کے لیے کعب نے سبھوں کے سامنے اپنا یہ مشہور قصیدہ پڑھا ۔ حضور مسرور ہوئے اور شاعر کو اُس کے صلے میں اپنی چادر مبارک (بُردہ) عطا فرمائی، اسی لیے اس قصیدے کو قصیدۃ البردہ کہتے ہیں ۔

اپنی خصوصیات کے اعتبار سے یہ قبل اسلام کے قصیدوں کے عام انداز کے مطابق ہے ۔ کعب کے والد زُھیر بن ابی سُلمٰی عرب کے مشہور شاعر تھے ۔ سبعۂ معلقہ میں ایک قصیدہ اُن کا بھی شامل ہے ۔

انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں اس قصیدے کی متعدد اشاعتوں اور تراجم کا ذکر ہے ۔ جرمن مستشرق براکلمان نے اپنی تاریخ ادب عربی میں اس کی ۳۵ شروح، ۱۲ تخمیسات اور چند تشریحات و معارضات اور فارسی و اردو تراجم کے نام درج کیے ہیں ۔

آپکی دلچسپی کی اطلاع یہ ہے کہ اس کی دو اشاعتیں ہندستان میں زیادہ مشہور ہوئیں ۔ طبع عبدالاوّل جونپوری (جون پور ۱۳۱۸ھ) مع عربی تفسیرات و تعلیقات اور طبع محمد صدرالدین (لاہور ۱۹۰۳) مع اردو و پنجابی تشریحات ۔

جن شروح کا آپ نے ذکر کیا ہے ان کا دائرۂ معارف اسلامیہ (لاہور) ۳/۱۰۱۳ کے مقالہ نگاران، شیخ عنایت اللہ اور عبدالقیوم نے ذکر نہیں کیا ہے ۔ ممکن ہے بروکلمان نے ذکر کیا ہو ۔ Muir نے لائف آف محمد میں "بانت سُعاد" کا ذکر کیا ہے ۔ نکلسن نے Translation of Eastern Poetry

Marfat.com

میں اس قصیدے کا انگریزی ترجمہ درج کیا ہے۔ لیکن آپ کی دلچسپی تو مفتی سعد اللہ کی شرح اور احسن کی تنقید سے ہے۔

ابھی بروکلمان کی تاریخ دیکھی۔ دولت آبادی کی شرح ''مصدق الفضل'' کا ذکر ہے، یہ حیدرآباد میں ۱۹۰۵ میں چھپی ہے۔ ایک شرح احمد بن محمد الشروانی نے بھی کی ہے، یہ کلکتہ میں ۱۲۵۱ھ میں چھپی ہے۔ امید ہے اتنے معلومات سے آپ کا کام چل جائے گا۔

والسلام

مختار الدین احمد

میں نے ڈاکٹر صاحب کے اس پوسٹ کارڈ کو اپنی ڈائری میں بھی نقل کرلیا تا کہ معلومات محفوظ ہوجائیں اور جب بھی ضرورت پڑے رجوع کرنے میں آسانی ہو۔ ڈاکٹر صاحب نے مزید کرم فرمایا کہ قصیدۂ بانت سُعاد کا ایک مطبوعہ نسخہ (مرتبہ ومترجمہ علی محسن صدیقی۔ مکتبہ اسحاقیہ۔ جونا مارکیٹ۔ پھول چوک کراچی۔ نومبر ۱۹۶۸ء) مجھے بھیجدیا جس کا میں نے دلچسپی سے بالاستیعاب مطالعہ کیا۔

اب دوسری مثال ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب کے استفسار کی ہے۔ مشفق خواجہ صاحب کو حکیم غلام غوث بریلوی کے متعلق کچھ معلومات درکار تھیں۔ ڈاکٹر صاحب نے بریلی کے متعدد اصحاب سے استفسار کیا۔ انھوں نے اپنے ۶ رمارچ ۲۰۰۱ء کے خط میں دیگر باتوں کے علاوہ، مجھے تحریر کیا:

> ''ابو عزیز حکیم غلام غوث (۱۸۸۳ء۔۱۹۴۴ء) کے حالات مطلوب ہیں۔ یاد آتا ہے کہ ڈاکٹر عبد النعیم عزیزی بریلوی نے کسی رسالے میں اُن کے حالات لکھے تھے۔ بہرحال آپ کو جو کچھ معلوم ہو وہ براہ کرم لکھ بھیجئے۔ کیا ان کی کنیت ابو عزیز تھی؟ ان کی اولاد میں کچھ لوگ باقی ہوں تو اُن کے بارے میں کچھ لکھیے۔ تصانیف و مقالات کا ذکر خاص طور پر۔ ''مہملات غالب'' کے عنوان سے اُن کا ایک مضمون ماہنامہ شباب اردو لاہور کی اشاعت مئی ۱۹۴۱ء میں چھپا تھا جسے مشفق خواجہ صاحب نے دوبارہ شائع کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ وہی بریلی کے حکیم غلام غوث صاحب ہیں جو ریاضی اور توقیت میں اعلیٰحضرتؒ کے شاگرد اور والد مرحوم کے ہم سبقوں اور دوستوں میں تھے۔ اسی موضوع پر ایک مضمون ابوالوفا

Marfat.com

عامل الہ آبادی کا بھی شائع ہوا ہے اسے بھی خواجہ صاحب نے اپنے رسالہ ''غالب'' (کراچی) میں شائع کیا ہے۔ میں موَخرالذکر سے واقف نہیں۔ آپ کچھ اُن کے بارے میں جانتے ہیں؟ الہ آباد میں ڈاکٹر عبد الستار صدیقی زندہ ہوتے تو وہ شاید بتاتے۔ اب کس سے پوچھوں!''

میں نے ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں فوراً جواب بھیج دیا۔ انھوں نے اپنے ۱۴/اپریل ۲۰۰۱ء کے خط میں تحریر کیا:

''مورخہ ۳/۳۰ آج دوپہر کو ملا۔ مجھے حکیم سید عزیز غوث بریلوی اور حکیم سید غلام غوث بریلوی میں التباس ہوا لیکن میری دلچسپی دونوں میں ہے اور میں چاہتا ہوں کہ دونوں کے بارے میں جو بھی معلومات آپ کو مستحضر ہوں لکھ کر بھیج دیں۔ بہت زیادہ تلاش وجستجو کی ضرورت نہیں۔

حکیم سید عزیز غوث سے دلچسپی اس لئے ہے کہ وہ اعلیٰ حضرتؒ کے شاگرد تھے اور والد مرحوم کے دوستوں میں تھے۔ میں نے ان کا مطب دیکھا تھا اور میری اُن سے ملاقات ۱۹۴۳ء کے آخر میں وہیں ہوئی تھی والد مرحوم کی معیت میں۔ حکیم سید غلام غوث سے میری دلچسپی اُس لئے ہے کہ ۱۹۲۱ء کی ایک فراموش شدہ علمی بحث ''مہملات غالب'' میں انھوں نے حصہ لیا تھا۔ ان کے بارے میں خاصی تفصیلات ڈاکٹر عزیز ی نے شعرائے بریلی پر آپ کی اور دوسرے مصنفین کی کتابوں سے لکھ کر بھیجی ہیں۔ مجھے خیال ہوتا ہے کہ وہ سید شاہ فضل غوث اور حکیم سید عزیز غوث کو باپ بیٹا سمجھتے ہیں۔ بہرحال آپ جو کچھ لکھیں گے وہ ہر طرح مستند ہونگا۔ آپ مختصر طور پر دونوں کے بارے میں لکھ بھیجے۔

''مہملات غالب'' ۴۷ صفحات کو محیط ہے۔ اس کا عکس بنوا کر بھیج دوں یا کسی معتبر آدمی کے ذریعہ پونے پانچ سو صفحوں کا پورا رسالہ بھیج دوں آپ کے مطالعے کے لیے۔ اس کے کئی مضامین آپ کی دلچسپی کے ہیں۔''

دراصل بریلی کے اس مشہور حکیم خاندان کے افراد کے اسماء میں لفظ غوث مشترک ہونے کی وجہ سے التباس ہو جاتا ہے۔ التباس کا دوسرا سبب یہ تھا کہ مذکورہ بالا مضمون ''مہملات غالب'' کے مصنف کا نام سید غلام غوث تھا۔ لیکن ان کو شہرت حکیم عبد الصمد سرشار کے نام اور تخلص سے ملی۔ سید غلام غوث، حضرت سید شاہ فضل غوث سائیؒ (م ۱۳۰۷ھ) کے فرزند تھے۔ ان کو تاریخ گوئی میں زبردست مہارت حاصل تھی، طبیب حاذق اور فارسی و اردو

Marfat.com

کے صاحب دیوان شاعر تھے۔ان کے یہاں علمی وادبی کتب کا بڑا ذخیرہ تھا اور نایاب خطی نسخے بھی تھے۔ سید عزیز غوث، حکیم سید غلام غوث (حکیم عبدالصمد سرشار) کے بھائی سید محمد غوث کے فرزند تھے۔اس رشتے سے حکیم سید عزیز غوث حکیم سید غلام غوث کے بھتیجے تھے۔تقسیم وطن کے بعد یہ خاندان بکھر گیا۔ بہر حال میں نے ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب کو باردیگر مفصل جواب بھیجا جس سے وہ مطمئن ہوگئے۔ انہوں نے اپنے خط مورخہ ۱۶/۱ پریل ۲۰۰۱ء میں مجھے تحریر کیا۔

''مورخہ ۱۰ رموصول ہوا۔آپ نے کرم فرمایا۔جس دن آپ کو خط لکھا تھا اسی دن ڈاکٹر عزیزی صاحب سے بھی ان امور کے بارے میں استفسارات کئے تھے۔ ان کا خط آ گیا تھا اور رو ہلکھنڈ کے دونوں تذکروں کے اقتباسات کے کچھ عکس بنوا کر، کچھ نقل کر کے انھوں نے بھیج دیے تھے۔ پھر ماشاء اللہ آپ کا مفصل ومبسوط خط آیا۔ اس بہانے آپ کے مرتب کردہ تذکرۂ شعرائے بریلی کی بھی زیارت ہوگئی۔

میری قدیم دلچسپی حکیم سید عزیز غوث مرحوم میں ہے جو اعلحضرتؒ کے شاگرد والد صاحب کے رفیق و دوست اور ہیئت وریاضی میں ہم سبق تھے۔ ۱۹۴۳ء کے اواخر میں والد صاحب، اعلحضرتؒ کی تصانیف کے مسودات کی ترتیب وتبییض اور کتب خانۂ خاص کی تہذیب کے لیے بریلی تشریف لائے تھے تو میں علی گڑھ سے اُن کی پابوسی کے لئے حاضر ہوا تھا۔شہر میں جہاں جہاں وہ ملنے تشریف لے جاتے تھے میں ہم رکاب ہوتا تھا۔ایک صبح وہ حکیم عزیز غوث کے یہاں تشریف لے گئے۔ میں نے ان کے اُس مکان میں جس کا آپ نے اپنے خط میں ذکر کیا ہے، ان کی زیارت کی تھی۔ان کی شکل اب بھی یاد آتی ہے۔کسی زمانے میں میں ان پر مضمون لکھنا چاہتا تھا پھر خیال ہوا کہ ڈاکٹر عبدالنعیم عزیزی مجھ سے اچھا مضمون لکھ سکیں گے، مضمون لکھنے کا خیال ترک کردیا۔ والد صاحبؒ کی مفصل سوانح حیات لکھی تو اس میں ان کا ذکر ان کے احباب کے ذیل میں کروں گا۔

حکیم غلام غوث مرحوم سے دلچسپی ایک مہینہ ہوا اس لئے پیدا ہوئی کہ مشفق خواجہ صاحب نے ان کا ایک مضمون 'مہملات غالب' چھاپتے ہوئے

Marfat.com

لکھا ہے کہ ان کے حالات معلوم نہ ہو سکے۔ اب میں ان پر ۸۔۱۰ سطروں
کا ایک سوانحی نوٹ تیار کر کے انھیں بھیج دوں گا۔''

اب تیسری مثال یعنی ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب دوسروں کے کام میں اتنی ہی دلچسپی لیتے ہیں جتنی کہ اپنے کام میں۔ انھوں نے ایک خط میں حضرت سید شاہ حمزہؒ مارہروی کے حالات طلب کیے۔ میں نے ان کی فرمائش پوری کردی اور کتاب ''مسمّٰی تاریخ خاندان برکات'' مولفہ اولاد رسول محمد میاں قادری برکاتی سے حضرت شاہ حمزہؒ (م ۱۱۹۸ھ) کے حالات نقل کر کے بھیج دیئے۔ جب ان کا خط مورخہ ۲۸ ستمبر ۲۰۰۱ء موصول ہوا تو مجھے معلوم ہوا کہ انھوں نے حضرت سید شاہ حمزہؒ کے حالات ڈاکٹر شریف حسین قاسمی صاحب کے لیے حاصل کیے تھے جو اس زمانے میں کتخانۂ رام پور کے لیے ایک فارسی تذکرہ مرتب کر رہے تھے۔ وہ اپنے خط میں تحریر کرتے ہیں:

''مطلوبہ معلومات حضرت شاہ حمزہ مارہروی پر مل گئے تھے۔ ڈاکٹر شریف حسین صاحب کو بھیج دیے گئے۔ آپ کو رسید بھیج دی تھی، اب مل گئی ہوگی۔ شاہ حمزہ کے حالات سید شاہ محمد امین صاحب مارہروی (شعبۂ اردو علی گڑھ) سے بھی مل گئے تھے۔

اسی طرح دیگر اہل علم کی معاونت کے لئے ان کو سفارشی خط بھیجنے میں بھی تکلف نہیں ہوتا۔

ڈاکٹر نذیر احمد صاحب ''دیوان مہندس'' اڈٹ کر رہے تھے۔ انھوں نے ایک دن ڈاکٹر مختار الدین احمد سے ذکر کیا کہ اس کا نسخہ ایک خیر پور سندھ میں ہے لیکن وہاں سے عکس منگوانا بہت مشکل ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے وعدہ کیا کہ میں کوشش کرتا ہوں۔ انھوں نے ۲۸ دسمبر ۱۹۸۸ کو پروفیسر غلام مصطفےٰ خاں صاحب کی خدمت میں خط بھیجا:

''خیر پور کتب خانۂ عمومی میں لطف اللہ مہندس کا ایک نسخہ قرن سیزدہم کا لکھا ہوا خط نستعلیق شکستہ آمیز میں محفوظ ہے۔ یہ مختصر دیوان ۶۶ صفحات پر مشتمل ہے اس کی اشد ضرورت ہے، ڈاکٹر نذیر احمد صاحب اسے مرتب کر رہے ہیں۔ یافعی کے نسخہ کراچی کی نقل انھیں مل گئی ہے۔ اگر آپ توجہ فرمائیں تو شاید نسخۂ خیر پور کی زیروکس کاپی بھی فراہم ہو جائے۔ زحمت دہی کے لیے عفوخواہ ہوں'' (یادگار خطوط ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں کے نام، مرتبہ خالد محمود ص ۶۲۷ (کراچی ۱۹۹۸)

پروفیسر صاحب کا جواب آیا کہ عکس کے لیے ایک صاحب کو لکھ دیا ہے۔ ڈاکٹر

Marfat.com

صاحب کچھ مطمئن نہیں ہوئے۔وہ ۱۰ ستمبر کے خط میں تحریر کرتے ہیں:

دیوان مہندس کے عکس کے لیے آپ کو شاید ایک سے زاید اصحاب کو خط لکھنا پڑے۔ میرا تو تجربہ کچھ ایسا ہی ہے۔ خدا کرے آپ کے مکتوب الیہ، اور اصحاب سے مختلف ہوں"

پروفیسر صاحب کے مکتوب الیہ ، یقیناً عام اصحاب سے مختلف تھے، آخر وہ پروفیسر غلام مصطفٰے خاں صاحب محترم کے مکتوب الیہ تھے۔ وسط ستمبر میں دیوان کا عکس ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب کی کوششوں سے خیر پور سے علی گڑھ پہنچ گیا۔ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب نے دیوان مہندس" مرتب کر کے ناشر کے والے کر دیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب ہی کے نام ایک اور سفارشی خط کا ایک اقتباس:

رسالہ "مخدوم جہاں" سے اس کے موضوع کی وجہ سے میری دلچسپی ہے ۔ یہ میرے ایک عزیز کمال جعفری نے شائع کرنا شروع کیا ہے محض اپنے علمی و دینی شوق کی بنا پر ۔ ابھی ابتدائی مراحل سے یہ رسالہ گزر رہا ہے ۔ اس لائق تو نہیں کہ آپ کے قیمتی مقالات اس میں شائع ہوں لیکن ممکن ہے آپ کے تبرکات شائع کرنے کے بعد اس کی اشاعت میں اضافہ ہو جائے ۔"

وہ تین ہفتے کے بعد انھیں پھر لکھتے ہیں:

"رسالہ" مخدوم جہاں" کے لیے آپ کے مضمون کا انتظار ہے۔ کمال جعفری صاحب اس کا تازہ شمارہ بھیج رہے ہیں" (یادگار خطوط ص ۲۳۳)

پروفیسر صاحب جو ڈاکٹر صاحب سے بے حد محبت کرتے ہیں اس پیرانہ سالی و علالت کی حالت میں ایک طویل اور قیمتی مضمون چند دنوں میں لکھ کر انھیں بھیج دیتے ہیں ڈاکٹر صاحب ۶ رفروری ۱۹۸۹ کو انھیں لکھتے ہیں:

"مضمون موصول ہوا۔ بہت اچھا مضمون ہے اور اس قدر وقیع کہ مجھے رسالہ" مخدوم جہاں" کو بھیجنے میں تامل تھا۔ بہر حال اس رسالے کی خوش نصیبی ہے کہ اس میں یہ قیمتی مضمون شائع ہو رہا ہے" (یادگار خطوط ص ۲۳۴)

ڈاکٹر مختار الدین احمد نے ۲۹ ردسمبر ۱۹۹۹ء کے خط میں مجھے تحریر کیا۔

"مالک رام کے تلامذہ غالب پر اپنا مضمون ابھی کہیں بھیجنا طے نہ کیا ہو تو ڈاکٹر سید حسن عباس مدیر "ادراک" کو بھیج دیجئے ..... انہوں نے ایک

Marfat.com

علمی ادارہ 'مرکز تحقیقات اردو وفارسی' قائم کیا ہے یہ اس کا علمی سہ ماہی
رسالہ ہے ..... میں بھی اس کے لیے کچھ لکھ رہا ہوں اور ڈاکٹر نذیر احمد
صاحب بھی لکھیں گے۔ اُن کا پتا خط کی پیشانی پر لکھ رہا ہوں۔"

میں نے ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب کے خطوط میں ایک عمدہ بات دیکھی کہ انہوں نے جب بھی استفسار کیا تو صرف دریافت طلب بات نہیں لکھی بلکہ خود اُن کو جن باتوں کا علم تھا وہ بھی تحریر کر دیں۔ اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ استفسار کا جواب دیتے وقت یہ ذہن میں رہا کہ مستفسر کی اپنی معلومات کیا ہیں اور جواب کس حد تک بھیجنا ہے۔ مثال میں جب ڈاکٹر صاحب کو میر زین الدین عشق پر معلومات کی ضرورت پڑی انہوں نے مشارٌ الیہ سے اپنی واقفیت کا اظہار کرتے ہوئے ۲۴ر مئی ۱۹۹۹ء کے خط میں تحریر کیا:

"میر زین الدین عشق کے جو حالات اور اشعار مسرت افزا، تذکرۂ شورش
تذکرۂ عقد ثریا، تذکرۂ ریاض الفصحاء میں ہیں، وہ میرے پیش نظر ہیں۔
تذکرۂ آفتاب عالمتاب (قاضی محمد صادق اختر) پیش نظر نہیں .....
نشترِ عشق، مجمع النفائس میں ترجمہ و اشعار کے لئے رامپور اور پٹنہ خطوط لکھے
ہیں۔ یاد دہانی بھی کرائی گئی، اب تک کامیابی نہیں ہوئی۔ کاش رامپور میں
کوئی ایسا آدمی ہوتا جو فوراً نقل کر کے بھیج دیتا۔

۲۔ کاظم جنگ خاں؟ شیدا بریلی کی استدعا پر بھی مرزا زین الدین عشق
نے ایک غزل لکھی ہے۔ دلبر رخاور اس کے قوافی ہیں
دوسری غزل ضیائے عارض رلقائے عارض بھی کلماتِ عشق ص ۳۸۸ پر مل گئی۔
یہ شیدا بریلوی، اگر اردو کے بھی شاعر ہیں تو آپ کی کتاب میں ان کا
ذکر ضرور ہوگا۔ ان سے آپ واقف ہوں تو تحریر فرمایئے۔

۳۔ مرزا زین الدین عشق، نواب محبت خاں سے ایک بار پیلی بھیت میں
اور دوسری بار بریلی میں ملے تھے جیسا کہ کلیات عشق کے حسب ذیل
اندراج سے معلوم ہوتا ہے:

۱) "غزل در بحر مضارع مسبع۔ مفاعلن فعلان مفاعلن فعلان در پیلی بھیت
حسب الاستدعائے نواب محبت خاں بہادر نزول یافتہ" یہ نو شعروں کی
غزل ہے، مطلع یہ ہے:

Marfat.com

چہ حاجتست بدیوانہ کے مرا زنجیر
کہ ہر قدم شدہ جوں موج نقش پا زنجیر ص۳۵۹

۲) غزل پرکار در صحبت نواب محبت خاں بہادر در بریلی ورود یافتہ ۱۱۸۵ھ ۱۷۷۱ء

.....جاناں گاہ ہست و گاہ نیست

.....نمایاں گاہ ہست و گاہ نیست" (۱۱شعر)

نواب محبت خاں محبتؔ (م ۱۸۰۹ء) پسر نواب حافظ رحمت خاں (م ۱۷۷۴ء) کی مجلس میں جو شعرا بریلی میں جمع ہوئے ان کا مجھے علم تھا لیکن ڈاکٹر صاحب کے مندرجہ بالا مکتوب سے پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ میر زین الدین عشقؔ بھی بریلی اور پیلی بھیت میں ان کے پاس حاضر ہوئے تھے۔

ڈاکٹر صاحب کا کرب ختم نہیں ہوا۔ بات میں بات نکلتی چلی گئی۔ ان کی نظر بالواسطہ منابع پر بھی مرکوز ہوئی۔ انھوں نے خط مورخہ ۱۰ جون ۱۹۹۹ء میں مجھے تحریر کیا:

"مورخہ ۴ رجون ملا۔ رامپور سے آج خط آیا ہے کہ نشتر عشق اور مجمع النفائس میں مرزا زین الدین کا ترجمہ نہیں۔ مجمع النفائس تو خیر، نشتر عشق میں ان کا عدم شمول حیرت ناک ہے۔

نشتر عشق سے محمد پناہ قابل کشمیری کے حالات آ گئے ہیں۔ کوئی خاص بات نہیں لیکن اس سے ان کا سال وفات ۱۱۷۰ھ معلوم ہوا اور یہ کہ ان کا قیام دہلی اور لاہور میں رہا ہے۔

لائبریری کے اصحاب کو بالاستیعاب کتابیں دیکھنے کا کہاں موقع۔ آپ نے جن اہلِ قلم کو متوجہ کیا ہے کاش انھیں اس عہد کے دوسرے تذکرے دیکھنے کا موقع مل جائے۔

ایک بات اور تحقیق طلب ہے۔ ابوالعلائیوں کی آپ کے پاس کوئی مفصل تاریخ ہو تو اس میں مرزا زین الدین عشقؔ کے ایک معاصر شاہ اعزّ الدین کا حال تلاش کیجئے۔ یہ شاعر بھی تھے اور بہت اچھے خوش نویس بھی۔ حضرت مخدوم شاہ منعم پاکؒ (م ۱۱۸۵ھ) کے مرید اور تربیت یافتہ تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا "الہامات منعمی" کا خوش خط نسخہ کتب خانۂ خدا بخش میں محفوظ ہے۔ مجھے ان کے ہاتھ کے

Marfat.com

لکھے ہوئے اور نسخوں کی تلاش ہے۔ افسوس کہ آج تک کسی نے کاتبوں، نقل نویسوں اور خوش خطوں کا کوئی اشاریہ نہیں تیار کیا، ورنہ ایک منٹ میں پتا چل جاتا کہ شاہ اعزّ الدین کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کتنی کتابیں ہیں اور کہاں کہاں محفوظ ہیں۔ میں نے ایک زمانے میں ایک مختصر تذکرۂ خطاطین مرتب کرنا شروع کیا تھا لیکن یورپ چلا گیا اور کوئی تین سال کے بعد واپس آیا تو دوسرے موضوعات سامنے تھے، حالانکہ حق ان کا بھی ادا نہ کرسکا۔'' مجلّہ علوم اسلامیہ'' کی ترتیب میں بڑا وقت خرچ ہوا، بارہ سال کا بیشتر حصّہ۔ پتا نہیں آپ کی نظر سے یہ رسالہ کبھی گزرا یا نہیں؟''

بہرحال کافی جستجو کے بعد ڈاکٹر صاحب نے یہ مضمون مکمل کرلیا جو بعنوان ''مرزا زین الدین عشق دہلوی اور کلیات عشق'' یا دگارنامۂ قاضی عبدالودود غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی ۲۰۰۰ء میں شائع بھی ہوگیا۔ انہوں نے اپنے ۸/اگست ۲۰۰۰ء کے خط میں مجھے تحریر کیا۔

''قاضی صاحب پر میرا ترمیم شدہ مضمون یادگار نامہ میں آپ نے پڑھا اور پسند کیا خوشی ہوئی۔ دوسرا مضمون ابھی نہیں دیکھا ہوگا۔ اس دہلوی شاعر کے بارے میں ایک صفحے کا مضمون بھی آج تک کسی نے نہیں لکھا تھا۔''

میں نے مرزا زین الدین عشق پر مضمون پڑھ لیا تھا۔ یہ بات صحیح ہے کہ عشق اور اس کے کلیات پر کسی نے ایک صفحہ بھی نہیں لکھا تھا اور اس کے متعلق معلومات بعض تذکروں تک محدود تھیں دیوان کے وجود کا کسی کو علم نہ تھا۔ ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب نے بڑا کام کیا کہ اس پر ایک مفصل مضمون تحریر کردیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسے مضامین تالیف کرنے کے لئے جس علم وفضل، ذوق وشوق، تحقیق اور جگر سوزی کی ضرورت ہے وہ ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے۔

☆☆☆

Marfat.com

عبدالعلیم قدوائی

سابق ڈائریکٹر وزارتِ صنعت حکومت ہند، نئی دہلی

پروفیسر مختار الدین احمد

(ذاتی تاثرات)

محبِ گرامی پروفیسر ڈاکٹر مختارالدین احمد صاحب عربی اور اردو ادب کے نامور محقق ، دانشور اور ادیب کی حیثیت سے کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ متعدد عالمی اداروں نے ان کی علمی خدمات کو سراہا ہے اور بڑی خوشی کی بات ہے کہ مسلم یونیورسٹی سے سبکدوش ہونے کے بعد بھی ماشاء اللہ وہ پورے طور پر علمی و ادبی سرگرمیوں میں منہمک ہیں۔ ان کی علمی اور تحقیقی خدمات کے بارے میں یہ کم سواد کم علم کچھ عرض کرنے کی نہ تو اہلیت رکھتا ہے اور نہ استحقاق ۔صرف ان کی دلآویز شخصیت جس نے راقم السطور کو بڑا متاثر کیا ہے کے سلسلہ میں چند ذاتی تاثرات پیش کرتا ہوں۔

آرزو صاحب سے اس ناچیز کا تعارف آج سے ۵۰ ۔ ۵۵ سال قبل عم محترم مولانا عبد الماجد دریابادی کے ذریعہ ہوا، جو ان کے ذوق علمی اور تحقیقی صلاحیتوں کی تعریف زبانی اور اپنے ہفتہ وار ''صدق جدید'' میں کرتے رہتے تھے ۔ان کے مرتبہ علی گڑھ میگزین کے ''غالب نمبر'' کی داد انہوں نے موصوف کو ذاتی خط لکھ کر دی تھی اور ''صدق جدید'' میں بہت اچھا تبصرہ لکھا تھا۔اس کے بعد بھی وہ غالب کے متعلق ان کی خدمات کی تعریف کرکے ان کی برابر ہمت افزائی کرتے رہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ ایک دفعہ مرحوم نے ایک نجی نشست ہی یہ فرمایا تھا کہ'' آرزو صاحب صحیح معنوں میں ریسرچ اسکالر یا محقق ہیں اور غالب شناسوں میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں ۔''یونیورسٹی کے عام ریسرچ اسکالرس کے بارے میں مولانا مرحوم کچھ اچھی رائے نہیں رکھتے تھے اس لیے ان کی یہ توصیفی سند خاص اہمیت رکھتی ہے ۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے مرحوم کو خاص تعلق تھا وہاں یونیورسٹی کورٹ اور شعبۂ اسلامیات کے جلسوں میں پابندی سے شرکت کے لیے جاتے تھے اور جب بھی آرزو صاحب سے ملاقات ہوتی ان کا ذکر تعریفی کلمات ہی سے کرتے تھے ۔ غالباً ۱۹۷۴ء میں مولانائے مرحوم کی ذاتی لائبریری کو دیکھنے کے لیے مسلم

Marfat.com

یونیورسٹی کی چند اہم شخصیات :الحاج مولوی عبیدالرحمٰن خاں شروانی ، پروفیسر سید انوار الحق حقی ڈین فیکلٹی آف سوشل سائنس، سید محمد حسن رضوی لائبریرین مولانا آزاد لائبریری دریا باد تشریف لائیں ان میں پروفیسر مختار الدین احمد بھی تھے ، جو اس وقت فیکلٹی آف آرٹس کے دین اور مسلم یونیورسٹی کی اگزکٹو کونسل اور مسلم یونیورسٹی کورٹ کے ممبر بھی تھے۔اتفاق سے یہ خاکسار بھی وہاں موجود تھا ۔ مجھے خوب یاد ہے کہ مولانائے مرحوم، آرزو صاحب کی طرف خصوصی توجہ فرماتے رہے۔ٹرین کے لیٹ ہوجانے کی وجہ سے ان کا قیام چند ہی گھنٹوں کا ہو پایا مگر اس دوران میں آرزو صاحب برابر کتب خانے کی بعض نادر کتابوں کی ورق گردانی کرتے رہے اور ان کی اہمیت کے بارے میں مرحوم سے نیز برادر محترم حکیم عبدالقوی صاحب مرحوم سے گفتگو کرتے رہے ۔ ان لوگوں کے رخصت ہو جانے کے بعد عم مرحوم نے ہم لوگوں سے ان کا ذکر تعریف کے لہجے میں کرتے ہوئے کہا کہ آرزو صاحب نے باتیں خالص علمی رنگ کی کیں، اور اس سے ان کے اسکالر ہونے کی تصدیق ہوتی ہے ۔ خود آرزو صاحب بھی مولانا مرحوم کے علم و فضل کے قائل تھے اور ان سے خط و کتابت کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ جب وہ اعلیٰ تعلیم اور ریسرچ کی غرض سے انگلستان اور یورپ کے بعض ممالک گئے تو وہ وہاں کے حالات اور اپنے علمی تاثرات خطوط کی شکل میں ان کو لکھ کر بھیجتے رہے اور مولانا مرحوم ان کے خطوط پسند کرتے رہے اور انھیں ''مکتوب فرنگ'' کے نام سے ''صدق جدید''میں شائع کرتے رہے ۔ مولانا کے انتقال کے بعد ''صدق جدید'' کی ادارت میرے بڑے بھائی حکیم عبدالقوی صاحب مرحوم نے سنبھالی ۔ ان سے بھی آرزو صاحب کے گہرے تعلقات تھے، وہ جب بھی علی گڑھ جاتے تو ان سے ضرور ملتے۔ وہ بھی آرزو صاحب سے خط و کتابت کرتے رہتے تھے ۔ آرزو صاحب ''صدق جدید'' کے بڑے قدرداں تھے اور اس کا اظہار اب بھی برابر کرتے رہتے ہیں۔

سرکاری ملازمت سے سبک دوشی کے کچھ عرصہ کے بعد میرا قیام زیادہ تر علی گڑھ میں رہنے لگا اور موصوف سے تعلقات بڑھے ان سے متعدد ملاقاتیں ہوتی رہیں اور ہر ملاقات کے بعد ان کی شرافت طبع ، حسن اخلاق، وضع داری اور علمیت کا نقش گہرا ہوتا گیا۔ ان کے ذوق مطالعہ و تحقیق ، قابلِ رشک انضباط، وقت کے اہتمام اور مشرقی اقدار کی پاسداری میں مجھے عم مرحوم مولانا عبد الماجد دریابادیؒ کی زندگی کی جھلک نظر آتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ میں آرزو صاحب کی شخصیت سے متاثر ہوں اور ان سے ایک خاص قسم

Marfat.com

کا انس اور گہرا تعلق محسوس کرتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ موصوف کے علم و فضل اور علمی درجہ کے مقابلے میں یہ ناچیز ہر لحاظ سے کم تر ہے مگر موصوف کی شفقت ہے کہ ہمیشہ ہمت افزائی فرماتے ہیں اور معتبر لفظوں میں ناچیز کی کاوشوں کی داد دیتے ہیں ۔ تین چار سال ہوئے جناب عابد رضا بیدار صاحب جو اس زمانہ میں خدابخش لائبریری پٹنہ کے ڈائرکٹر تھے کی فرمائش کی تعمیل میں میں نے عم مرحوم کے ہفتہ وار اخبارات ''سچ'' ''صدق'' اور'' صدق جدید'' کے تجزیاتی اشاریئے مرتب کرنے کا دشوار کام اپنی نااہلی کے باوجود کرنا شروع کیا۔ موصوف سے اس کا ذکر کیا تو انہوں نے بڑی ہمت افزائی فرمائی اور بڑے کارآمد مشورے دیے اور کام سے بڑی دلچسپی کا اظہار فرمایا۔'' سچ'' کا اشاریہ جب چھپ کر آیا تو اس کی تحسین اس طرح فرمائی جس نے مجھے شرمندہ کیا۔ خدابخش لائبریری کی فرمائش پر موصوف نے ۱۹۹۹ء میں ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کے خطوط بنام مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم بڑے قیمتی اور مفصل حواشی کے ساتھ مرتب کیے۔ اس سلسلے میں انھوں نے مولانا نے مرحوم کے حالات زندگی لکھنے کی فرمائش خاکسار سے کی اور خطوط میں بعض اشخاص کے بارے میں استفسارت بھی فرمائے۔

ان تمام باتوں سے موصوف کی شفقت اور ذوق تحقیق کا پتہ چلتا ہے۔ اس ناچیز کو موصوف سے متعدد موضوعات پر گفتگو کا اتفاق ہوا اور یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہو کہ موصوف علم و تحقیق کے مرد میدان ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت متواضع، خلیق، ملنسار، سنجیدہ اور متوازن مزاج کے مالک ہیں۔ وہ ہر قسم کی سیاست اور غیر علمی تحریکات سے الگ تھلگ ایک صاف ستھری زندگی بسر کرتے ہیں ۔ لکھنا پڑھنا ان کا اوڑھنا بچھونا ہے اور ہمہ وقت تحقیق و جستجو کے نئے نئے گوشوں کی تلاش میں لگے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی عمر اور صحت میں برکت عطا فرمائے کہ ایسے معتبر دانشور، مخطوطہ شناس اور محقق کی اردو ادب کو بڑی ضرورت ہے۔ یقین ہے کہ ان کے علمی کارناموں سے آگے چل کر نہایت مفید کاموں کا دروازہ کھلے گا۔ موصوف خط لکھنے اور خط کے جواب دینے کا خاص اہتمام کرتے ہیں اور اس سے بڑھ کر یہ کہ اپنے پاس آنے والے خطوط کو بڑے سلیقہ اور ترتیب سے محفوظ کرتے جاتے ہیں ۔ دوسروں کی علمی اعانت اپنا فرض سمجھتے ہیں اور اس کے لیے وقت نکالتے ہیں اور ہر قسم کی محنت گوارا کرتے ہیں ۔ حوالوں کی تحقیق اور تلاش ان کا محبوب مشغلہ ہے اور ان کی مدد سے ان کی تصانیف اوران کے مقالات کا معیار تحقیق اعلیٰ درجہ کا ہوتا ہے۔ آپ کی علمی و تحقیقی خدمات کے اعتراف میں جو مختلف اعزازات دیے گئے

Marfat.com

ہیں مثلاً صدر جمہوریہ ہند کی طرف سے عربی زبان و ادب کی سند اعزازی، غالب ایوارڈ' میر ایوارڈ وغیرہ وہ درحقیقت کم ہیں کیوں کہ آپ کے کارنامے ان سے کہیں زیادہ وقیع اور باوقار ہیں جن کو جتنا بھی سراہا جائے کم ہے۔

ضرورت ہے کہ آپ کے وہ مقالات اور علمی کارنامے جو ابھی تک شائع نہیں ہوئے ہیں ان کو کوئی علمی ادارہ مثلاً خدابخش لائبریری شائع کرے تاکہ ان سے علم و ادب کے شائقین پورا فائدہ اٹھا سکیں۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے محقق اور فاضل اجل کی خدمات کو قبول فرمائے اور ہم سب کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق دے۔

☆☆☆

Marfat.com

پروفیسر ریاض الرحمٰن شروانی
سابق صدر شعبۂ عربی و اسلامیات، کشمیر یونیورسٹی

ہم عصر شخصیّات

(پروفیسر مختار الدین احمد کی نظر میں)

پروفیسر مختارالدین احمد اصلاً عربی کے اِسکالر اور محقق ہیں اور شعبۂ عربی اور ادارۂ علومِ اِسلامیہ، علیگڑھ مُسلم یونیورسٹی سے برسوں منسلک رہے ہیں ۔ وہ اِدارۂ علوم اِسلامیہ کے ڈائرکٹر رہے ہیں اور شعبۂ عربی کے صدر۔ اُنھوں نے عربی ادب میں پروفیسر عبدالعزیز میمن کی نگرانی میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کیا ہے اور سر ہملٹن گب کی نگرانی میں آکسفورڈ یونیورسٹی سے ڈی ،فل ۔ جب وہ اِدارۂ علومِ اسلامیہ سے وابستہ رہے تب مجلۂ علومِ اسلامیہ کی اِدارت کرتے رہے اور جب شعبۂ عربی کے صدر ہوئے تب انھوں نے المجمع العلمی الھندی کی تاسیس فرمائی اور اس کا عربی ترجمان مجلة المجمع العلمی الھندی شائع کرنا شروع کیا۔ اِن دونوں مجلوں نے اُردو اور عربی میں اعلیٰ صحافت کا نمونہ پیش کیا۔ پروفیسر احمد نے جتنی توجہ اور محنت سے یہ دونوں مجلّے شائع کیے اور جس قابلیت کا ثبوت دیا اس کی بہت کم مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں ۔ لیکن یہ پروفیسر احمد کی علمی اور ادبی شخصیت کا صِرف ایک پہلو ہے، ان کی اُردو ادب سے دِل چسپی اور اس میں دستگاہ بھی اِسی درجے کی ہے ۔ وہ اُردو محقق کی حیثیت سے بھی اُتنے ہی ممتاز اور معروف ہیں جتنے عربی کے محقق کی حیثیت سے ہیں ۔ اِن دونوں زبانوں میں ان کی تصانیف اور مضامین مختلف موضوعات پر کثیر تعداد میں شائع ہو چکے ہیں ۔ اِس وقت اُن کی اِن سب خدمات کا جائزہ لینا مقصود نہیں ہے بلکہ ان کے تصنیفی کارناموں کے صِرف ایک پہلو یعنی ہم عصر شخصیات سے مُتعلق اِن کی تحریروں کے بارے میں کچھ عرض کرنا مقصود ہے ۔

جیسا کہ عرض کیا گیا ، پروفیسر مختارالدین احمد کی تصانیف کا دائرہ مختلف

Marfat.com

موضوعات پر حاوی ہے لیکن وہ بنیادی طور پر محقق ہیں ۔ چاہے انھوں نے شخصیات پر مضامین لکھے ہوں ، یادداشتیں، روزنامچے اور سفر نامے سپرد قلم کیے ہوں یا اردو ادب کی تاریخ پر ان کے مضامین ہوں، غالبیات پر ان کا کام ہو یا سرسید اور علی گڑھ تحریک پر، ان سب میں ان کی محققانہ شخصیت ہر جگہ نمایاں نظر آتی ہے ۔ متنی تنقید اور کتب خانوں اور مخطوطات کے تعارف کا تعلق تو خیر براہِ راست تحقیق ہی سے ہے۔ جہاں تک شخصیات کا سوال ہے ، اور جو اِس وقت ہمارے اِس مضمون کا اصلی موضوع ہے، ان میں ماضی کی شخصیات بھی شامل ہیں اور ہم عصر شخصیات بھی ، ہندوستان اور پاکستان کے عالم و ادیب بھی شامل ہیں اور مستشرقین بھی۔ چوں کہ ہم نے اپنے اِس مضمون کو ہم عصر شخصیات تک محدود رکھا ہے، اِس لیے ان پر ایک نظر ڈالنے سے محسوس ہوجاتا ہے کہ ان میں کتنا تنوع ہے ۔ اِس محفل میں آپ کو مختارالدین احمد صاحب کے احباب بھی نظر آئیں گے اور ان کے خواجہ تاس یعنی پروفیسر عبدالعزیز میمن کے شاگرد بھی، ان سے زیادہ عمر کے لوگوں کے بارے میں ان کے تاثرات بھی ملیں گے اور ان کے ہم عمروں کے بارے میں بھی ۔ یہاں مشرقی علوم کے ماہرین کے دوش بدوش آپ کی ملاقات سائنس دانوں سے بھی ہوگی اور انگریزی ادب کے اُستادوں سے بھی، یہاں آپ سے کالم نگار بھی ملیں گے اور صحافی بھی۔ اگر چہ مختارالدین احمد صاحب نے اپنا دامن سیاست اور سیاست دانوں سے بچانے کی بہت کوشش کی ہے تاہم، یہاں آپ کی ملاقات بعض سیاست دانوں سے بھی ہوجائے گی اور ظاہر ہے کہ ادیب اور شاعر تو خود مختارالدین احمد صاحب کی برادری کے لوگ ہیں ، اِس لیے اِس محفل میں ان کی سب سے زیادہ جلوہ نمائی قدرتی بات ہے ۔

اگر چہ ہم نے اِس مضمون کا دائرہ بہت محدود رکھنے کی کوشش کی ہے، پھر بھی اسکا دسیوں شخصیتوں تک وسیع ہونا ناگزیر ہے ۔ اس لیے ہمیں اِنتخاب در اِنتخاب سے کام لینا پڑے گا ۔

پروفیسر مختار الدین احمد نے جن بزرگوں پر قلم اُٹھایا ہے ان میں سر ضیاء الدین احمد ، مولوی عبدالحق ، شیخ عبدالحق ، بروفیسر عبدالعزیز میمن، ڈاکٹر معظم حسین ، پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب، مولانا علی احسن مارہروی، قاضی عبدالودود، پروفیسر آل احمد سرور، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، جناب مالک رام خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں ۔ پروفسر عبدالعزیز میمن کی

Marfat.com

نگرانی میں صرف تین اِسکالرس نے پی ایچ ۔ ڈی کی تکمیل کی تھی۔ ان میں خود مختار الدین احمد صاحب کے علاوہ ڈاکٹر سید محمد یوسف اور ڈاکٹر خورشید احمد فارق شامل تھے ۔ اِن دونوں پر تو مُختار الدین احمد صاحب نے مضامین لکھے ہی ہیں ، اِن کے علاوہ میمن صاحب کے ایک اور مُمتاز شاگرد ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کے کارناموں پر بھی تفصیل سے انہوں نے اظہار خیال کیا ہے۔ اپنے خصوصی احباب میں انھوں نے پروفیسر مسعود حسن، جناب احد فاطمی اور جناب قیوم قائد سے ہمیں مُتعارف کرایا ہے ۔ ان میں اگر مسعود حسن صاحب عربی کے عالم تھے تو ثانی الذکر دونوں سیاست سے سرو کار رکھتے تھے ۔ ہم عصر ادیبوں، شاعروں ، کالم نگاروں اور صحافیوں میں ہمیں جناب جمیل الدین عالی ، پروفیسر مسعود حُسین خاں اور جناب محمد طفیل (مدیر نقوش) سے واقفیت حاصل ہوتی ہے اور سائنس دانوں میں ڈاکٹر ذکی الدین، ڈاکٹر احمد شفیق اور انگریزی کے استاد جناب محمد احمد عثمانی ہماری توجہ مبذول کرتے ہیں۔ غیر ملکی اسکالرس میں اگر ہم ایک طرف مصر کے نام ور مصنف اور ادیب ڈاکٹر احمد امین سے شناسا ہوتے ہیں تو دوسری طرف آکسفورڈ کے مُمتاز مستشرق ڈاکٹر سیموئیل اِسٹرن، پروفیسر کاہلے، اوران کے جوانمرگ بیٹے پال سے مُتعلق فاضل مضمون نگار کے تأثرات سے ہمیں آگاہی حاصل ہوتی ہے اور اِس سب پر مُستزاد ہیں ہمارے ممدوح کی خود اپنے ماضی کی یادیں۔ یہاں ہم نے ان اشخاص کے بارے میں پروفیسر احمد کے تأثرات سے صرفِ نظر کیا ہے جن کا ذکر انھوں نے کسی اور مضمون میں ضمناً کیا ہے ۔مثلاً معصوم علی ترمذی ، عرفان حبیب ، متین الزمان زبیری ، بکر ماجیت حسرت ، محمد یعقوب ، سید عبدالعزیز ۔انھوں نے بعض حضرات کے خطوط شائع کیے ہیں اور خطوط سے قبل اپنے مزاج اور طریقۂ کار کے مطابق ان کے تفصیلی حالات درج کردیے ہیں ۔ اِن حضرات میں پروفیسر نجیب اشرف ندوی ، پروفیسر احتشام حُسین ، اختر میاں جوناگڑھی ، مولانا امتیاز علی عرشی ، انجم اعظمی ، جناب حمید احمد خاں ، ڈاکٹر ممتاز حسن ، ڈاکٹر ذاکر حسین ، پروفیسر رشید احمد صِدیقی ، ڈاکٹر سید عبداللہ ، ڈاکٹر شوکت سبزواری ، شیخ مُحمد اِکرام ، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی ، مولانا عبدالماجد دریابادی ، مولانا غلام رسول مہر ، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں پروفیسر نظیر صدیقی اور سید محمد حسنین جیسے مشاہیر شامل ہیں ۔ اِس کے علاوہ جگہ کی کمی کی وجہ سے ہم ان کے اس موضوع پر عربی میں لکھے ہوئے مضامین سے بھی صَرفِ نظر کرنے پر مجبور ہیں ۔ یہ

Marfat.com

مضامین الاستاذ محمد کرد علی ، ڈاکٹر عبدالکریم جرمانوس ، ڈاکٹر میشیل الخوری ، پروفیسر آصف علی اصغر فیضی ، پروفیسر عبدالعزیز میمن ، ڈاکٹر عبدالمعید خاں ، شیخ محمد یوسف بنّوری جیسے اساطینِ علم و ادب کے حالات پر مشتمل ہیں ۔

مُختار الدین احمد صاحب کے اِن مضامین کو اُن معنی میں خاکے یا مرقعے نہیں کہا جاسکتا جن معنی میں مثلاً مولوی عبدالحق کی ''چند ہم عصر'' یا پروفیسر رشید احمد صدیقی کی ''گنجہائے گراں مایہ'' اور ''ہم نفسانِ رفتہ'' کو کہا جاسکتا ہے ۔ ہمارے نزدیک ان کے لیے زیادہ مناسب اِصطلاح سوانحی مضامین ہوگی ۔ اِن مضامین کی اِمتیازی خصوصیت معلومات کا وہ ذخیرہ ہے جو مختار الدین احمد صاحب اپنے ممدوحین کے بارے میں قارئین کو مہیا کردیتے ہیں ۔ تاہم ان میں سے بعض مضامین میں ایک اچھے خاکے کی خصوصیات بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں ۔ اِن ضمن میں ہم قاضی عبدالودود ، محمد طفیل صاحب، جمیل الدین عالی صاحب، احد فاطمی صاحب ، قیوم قائد صاحب سید محمد حسنین صاحب اور نظیر صدیقی صاحب سے متعلق فاضل مضمون نگار کے رشحاتِ قلم کا ذکر کرسکتے ہیں ۔ ان کے قلم سے محمد طفیل صاحب کی ایک جھلک دیکھیے۔

''ایک شب طفیل صاحب نے اپنے گھر کھانے پر مدعو کیا .....

.....طفیل صاحب خود گفتگو نہ کرکے اپنی طاقت بچاتے رہے لیکن اپنی مسکراہٹ ، دل نوازی اور مختصر فقروں سے ہماری تواضع کرتے رہے ۔ رحیم گل کا ایک مضمون طفیل صاحب کے خلاف میں نے کہیں پڑھا تھا ۔ انھیں اِس بزمِ خاص میں دیکھ کر کچھ تعجب ہوا ۔ معلوم ہوا یہ بھی طفیل صاحب کی دل نوازی کا ایک کرشمہ ہے''

یا پھر عالی صاحب کے بارے میں یہ پڑھیے۔

عالی بہت بڑے سیّاح ہیں ۔ یہ اپنے عہد کے مارکو پولو اور کولمبس ہیں بلکہ اِس لحاظ سے ان سے بھی ممتاز کہ اُن بندوں نے دُنیا کے اِتنے ممالک ،اور بعض ممالک اِتنی بار ،نہیں دیکھے جتنے اور جتنی بار عالی نے دیکھیے ، پھر ان دونوں سیّاحوں نے آئس لینڈ اور ہماری دِلی کہاں دیکھی تھی ۔ عالی نے نئی دِلی بھی دیکھی اور پرانی دلی کی گلی کوچے کی سیر بھی کی

Marfat.com

ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ انھوں نے شہر دہلی، جو عروس البلاد ہے، بڑی عجلت اور کچھ بے دلی سے دیکھی اور یہاں سے وہ سرسری طور پر گزر گئے"۔

اس آئینے میں قیوم قائد کی شبیہ اِس طرح نظر آتی ہے!

"چھوٹے قد کے بڑے تن درست سے آدمی، سرخ رو اور سفید رنگ والے، آنکھیں عزم سے بھرپور، کھدر کا کُرتا پائجامہ، موسم سرما میں جواہر صدری بھی زیب تن ہوتی ہے۔ سردی زیادہ ہوئی تو گاندھی کیپ اوڑھ لیں گے، کہیں عوام میں تقریر کرنی ہو تو سبھاش چادر کا اِضافہ ہو جائے گا۔ پاؤں میں ہمیشہ پشاوری چپل، سیدھے ہاتھ میں پورٹ فولیو جس میں کاغذات کے علاوہ کبھی کبھی ایک آدھ جوڑی کپڑے کے علاوہ برش، پیسٹ، کنگھا وغیرہ بھی ہوتا ہے۔ اُلٹے ہاتھ میں کیپسٹن کا ٹن، لبوں کے ایک گوشے پر خفیف سی مُسکراہٹ، دوسرے گوشے میں سگریٹ دبی ہوئی۔ یہ یہیں سلگتی ہے اور یہیں خاکستر ہو جاتی ہے۔

اور یہ مختار الدین صاحب ہی کے نہیں، ہمارے بھی دوست تھے (اگرچہ ان کے ساتھ ہم دونوں کی دوستی کا زمانی وقفہ طویل ہے)

احد فاطمی صاحب کا جلوہ دیکھیے:

"ان کا جسم کم زور تھا اور صحت غیر مستقیم لیکن ان کی ہمّت بلند تھی اور عزم مضبوط۔ وہ بار بار اِسپتال جاتے اور چند دنوں یا ہفتوں میں تن درست اور چاق چوبند ہو کر واپس آ جاتے اور اپنے روز مرہ کے مشاغل میں بدستور لگ جاتے۔ میں مختلف مواقع پر ان کی عیادت کے لیے پٹنہ میڈیکل کالج کے اسپتال گیا، انھیں کبھی تنہا نہیں پایا۔ یا تو نرسوں سے چُہلیں ہو رہی ہیں یا مریضوں سے مزاج پُرسی۔ کبھی دیکھا کہ چوتھے گریڈ کے ملازموں سے اُن کی شکایتیں اور مطالبات سن رہے ہیں اور انھیں کارآمد مشوروں سے نواز رہے ہیں۔"

جیسا کہ پہلے عرض کیا اِن مضامین کی اِمتیازی خصوصیت صاحبِ مضمون کے تفصیلی حالات کا احاطہ ہے۔ ان میں فاضل مضمون نگار کے بزرگ اور ہم عصر دونوں شامل

Marfat.com

ہیں ۔ ہم عصر اہلِ علم و ادب ، ڈاکٹر معظم حسین ، پروفیسر مسعود حسین ، ڈاکٹر سید محمد یوسف ، ڈاکٹر خورشید احمد فارق، ڈاکٹر نبی بخش بلوچ اور پروفیسر مسعود حسن کے حالات، بالخصوص ان کے علمی و ادبی کارنامے ان سے متعلق مضامین میں مختار الدین احمد صاحب نے نہایت شرح و بسط سے جمع کر دیے ہیں۔ اگر ان میں سے کسی کا کام ادھورا رہ گیا ہے تو اس کی بھی نشاندہی کر دی ہے اور جہاں تک ممکن ہوا خاندانی حالات بھی بیان کر دیے ہیں ۔ سید محمد یوسف صاحب اور فارق صاحب ان کے خواجہ تاش تو ہیں ہی لیکن اُستاد بھی رہے ہیں۔ اِس لیے اپنے مضمونوں میں انھوں نے ان دونوں کا حفظ مراتب پوری طرح ملحوظ نظر رکھا ہے ۔سید محمد یوسف صاحب میرے بھی اُستاد رہے ہیں اور فارق صاحب میرے دوست تھے، اِس لیے ان کے بارے میں فاضل مضمون نگار نے جو کچھ لکھا ہے وہ کئی جگہ مجھے اپنا ذاتی تجربہ محسوس ہوتا ہے ۔ یہ کسی مصنف کی خوبی تحریر شمار ہوتی ہے کہ وہ قاری کو اپنے مشاہدات و تجزیات میں شامل کرے اور قاری کہہ اُٹھے : میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے ۔سید محمد یوسف صاحب کے پڑھانے کا انداز ان کا علمی اِنکسار اور ان کا ذوق علمی اِس طرح بیان ہوا ہے کہ اپنے ہی دل کی آواز کا احساس ہوتا ہے ۔ فارق صاحب کا اور میرا ساتھ ایک سال قاہرہ میں رہا تھا، مُختار الدین احمد صاحب نے اپنے مضمون میں اس کا حوالہ دیا ہے۔ اس دوران فارق صاحب کے بارے میں میرے جو تاثرات مُرتب ہوئے تھے پروفیسر احمد کے مضمون میں ان کی جھلک بہت کم ہے، شاید اِس لیے کہ پروفیسر احمد انھیں اُستاد کی نظر سے دیکھتے ہیں اور میں ایک دوست کی حیثیت سے ۔ تاہم اِس مضمون میں فارق صاحب کی تصویر کشی خوب صورت انداز میں ہوئی ہے، ملاحظہ ہو:

> ''فارق صاحب سے برسوں ملنا نہ ہوسکا ۔ وہ بہت کم آمیز تھے، گفتگو میں خود پہل نہیں کرتے تھے ۔ کسی نے کچھ پوچھا تو آنکھیں بند کر کے دو ایک جُملے میں جواب دیا اور پھر خاموش ہو گئے .....میں نے انھیں بتایا کہ علی گڈھ آنے سے پہلے پٹنہ میں مجھے معلوم ہوا تھا کہ آپ زیاد بن ابیہ پر کام کر رہے ہیں ۔ خاموش رہے ۔ نہ یہ پوچھا کہ کس نے کہا اور نہ کسی قسم کی خوشی یا دل چسپی کا انھوں نے اظہار کیا۔''

بلوچ صاحب کسی وجہ سے میمن صاحب کی نگرانی میں اپنا پی ایچ ۔ ڈی کا کام

Marfat.com

مکمل نہیں کر سکے تھے ۔ مختار الدین صاحب نے اپنے مضمون میں اس کے اسباب تو بتائے ہیں لیکن کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے ان کے علاوہ کچھ اور اسباب بھی ضرور رہے ہوں گے ورنہ علامہ میمن جیسے فاضل روز گار کی نگرانی میں ریسرچ کی تکمیل کے مقابلے میں کسی وزیر با تدبیر کے مشورے اور اِصرار پر کام چھوڑ کر ملازمت اِختیار کر لینا کم سے کم بلوچ صاحب جیسے باذوق ، سنجیدہ اور نسبتاً خوش حال طالب علم کے تناظر میں سمجھنے میں آنے والی بات نہیں ہے ۔ بلوچ، صاحب میمن صاحب کی زیر نگرانی تو اپنے کام کی تکمیل نہ کر سکے حال آں کہ اپنے علی گڑھ کے دورانِ قیام وہ میمن صاحب کے بہت قریب رہے ، تاہم انھوں نے مختار الدین صاحب کی روایت کے مطابق بعد میں کولمبیا یونیورسٹی (امریکہ) سے تعلیمات میں ڈاکٹریٹ حاصل کی اور وہ پاکستان واپس آ کر اعلیٰ عہدوں پر سرفراز رہے ۔

مختار الدین احمد صاحب نے اپنے جن بزرگ ہم عصروں پر قلم اٹھایا ہے ہم اِنھیں دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں ، ایک وہ جن کے وہ زیادہ قریب رہے ہیں، یا جنھیں انھوں نے زیادہ قریب سے دیکھا ہے اور ان سے متاثر ہوئے ہیں ۔ اِن بزرگوں میں ہمیں قاضی عبدالودود اور جناب مالک رام سب سے نمایاں نظر آتے ہیں ۔ اس میں تیسرا نام ان کے ایک سینیر معاصر جناب شرف عالم آرزو جلیلی کا لیا جا سکتا ہے ۔ قاضی صاحب سے مختار الدین صاحب کے کئی جذباتی اور ذہنی رشتے ہیں ۔ دونوں ہم وطن بھی ہیں اور ہم ذوق بھی البتہ تحقیق کے معاملے میں قاضی صاحب کی حیثیت راہ نما کی اور مختار الدین صاحب کی ایک متبع کی معلوم ہوتی ہے حال آں کہ اِن دونوں کے طریقۂ کار اور اسلوب نگارش میں ہمیں بیّن فرق نظر آتا ہے ۔ شاد عظیم آبادی کے ایک معروف شاگرد شاہ ولی الرحمٰن ولی کاکوی نے اپنے ایک مضمون مطبوعہ نقوش لاہور میں لکھا ہے کہ مختار الدین صاحب کے اسلوب تحریر میں قاضی صاحب کا نہیں، مولوی عبدالحق صاحب کا اثر پڑا ہے ۔ مجھے اس رائے سے اتفاق ہے ۔ قاضی صاحب سے متعلق مختار الدین صاحب کے دو مضمون ہمارے پیش نظر ہیں ۔ ایک میں انھوں نے قاضی صاحب کے خاندانی حالات سے بحث کی ہے اور دوسرے میں ، جو زیادہ تفصیلی ہے ، ان کی عادات و اطوار ، کردار ، علمی و ادبی احوال اور معیار تحقیق پر روشنی ڈالی ہے ۔ یہ ایک بھر پور مضمون ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ قاضی صاحب کے ساتھ بڑی حد تک اِنصاف کرتا ہے ۔ اس میں قاضی

Marfat.com

صاحب سے متعلق بعض شبہات کے بھی رد کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مالک رام صاحب عمر میں مختارالدین صاحب سے ضرور بڑے تھے اور دونوں نے ایک دوسرے کے تعاون سے بعض علمی کام بھی انجام دیے تھے لیکن ان دونوں کے باہمی روابط ہمیشہ دوستانہ رہے۔ اسی لیے پیش نظر مضمون میں اِن خوشگوار مراسم کا اثر پڑھنے والے کو صاف نظر آتا ہے۔ مالک رام صاحب سے مختارالدین صاحب کی پہلی ملاقاتِ اسکندریہ (مصر) میں ہوئی تھی۔ یہ اکتوبر ۱۹۵۳ کا واقعہ ہے جب مختار الدین صاحب اعلیٰ تعلیم کے حصول کی غرض سے یوروپ جارہے تھے، لیکن غائبانہ ملاقات اس سے کئی سال قبل سے تھی۔ ان ملاقاتوں اور روابط کا سلسلہ پچاس سال یعنی ۱۹۴۸ سے شروع ہوکر مالک رام صاحب کی وفات تک جاری رہا۔ ان کی اصلی نوعیت تو علمی و ادبی تھی لیکن انھوں نے ذاتی اور خاندانی مراسم کا رنگ بھی اِختیار کرلیا تھا۔ علمی میدان میں ان دنوں کا سب سے بڑا مشترک کا نامہ فضلی کی ''کربل کتھا'' کی اشاعت ہے۔ اس کی بازیابی، متن کی تیاری، تحشیہ نگاری کا سہرا مختار الدین احمد صاحب کے سر ہے اور اس کی تہذیب و ترتیب اور مقدمہ نویسی میں دونوں برابر کے شریک ہیں اور اگر کوی کسی سے کم زیادہ ہوتو دونوں میں سے کسی نے یہ راز فاش نہیں کیا ہے۔ مالک رام صاحب کے بارے میں مختار الدین صاحب کے بعض تاثرات ملاحظہ کیجئے:

> آدمی بڑے وضع دار ہیں اور قدیم روایت کے دل دادہ۔ بڑے مروت والے ہیں۔ علمی کام ہوں یا دوسرے، جہاں تک ان سے ممکن ہوسکتا ہے وہ دوسروں کو مدد دینے پر تیار رہتے ہیں۔ جب بھی انھیں کسی کتاب یا مخطوطے کے عکس کے لیے لکھا ہمیشہ مستعد نظر آئے۔ بعض مرتبہ عکس بھی بھجوائے اور قیمت بھی نہ لی۔''

ان کی ''نرمی'' اور ''مروّت'' کے حوالے سے مختار الدین احمد صاحب نے یہ ضرور لکھا ہے۔ ''یہی نرمی اور مروت کہیں کہیں ان کے تحقیقی مضامین بھی جھلکتی ہے، کبھی کبھی ان کی تحقیق پر ان کی فطری نرمی اور دردمندی حاوی آجاتی ہے۔'' گویا اِس معاملے میں مالک رام صاحب قاضی عبدالودود کی ضد ہیں۔

شرف عالم صاحب آرزو جلیلی اگرچہ عمر میں مختارالدین صاحب سے بڑے تھے

Marfat.com

تاہم محسوس ہوتا ہے کہ تھوڑی مدت کے بعد دونوں ایک دوسرے سے خاصے بے تکلف ہو گئے تھے۔ مختار الدین احمد صاحب کے مضمون کی روشنی میں جلیلی صاحب کا جو نقش اُبھرتا ہے اس میں سب سے چوکھا رنگ ان کے ذوقِ مطالعہ کا نظر آتا ہے۔ ان کے ساتھ مختارالدین احمد صاحب کا ایک دہلی کا سفر انجمن ترقی اردو کی کل ہند کانفرنس میں شرکت کے لیے دسمبر ۱۹۳۹ میں ہوا تھا۔ اُس وقت ثانی الذکر لڑکے تھے اور اول الذکر مسن اور ایک کالج میں سائنس کے استاد۔ لیکن یہ محسوس ہوتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے اچھے رفیق سفر ثابت ہوئے، شاید جلیلی صاحب مختار صاحب سے بھی زیادہ اچھے رفیق سفر۔ یہ تو ہم سب جانتے ہی ہیں کہ تخلص مختار الدین صاحب کا بھی ''آرزو'' ہے چنانچہ معروف جدید شاعر مظہر امام صاحب نے شرف عالم آرزو جلیلی پر جو بیش بہا کتاب تصنیف کی ہے اور جس میں اپنے ممدوح کی ہمہ دانی کو بھرپور خراج عقیدت پیش کیا ہے اسکا انتساب بجا طور پر مختار الدین احمد آرزو کے نام کیا ہے یعنی ایک آرزو کے حالاتِ زندگی کا انتساب دوسرے آرزو کے نام!

جن لوگوں کو مختار الدین احمد صاحب نے دور سے دیکھا ہے یا ان کے بارے میں ان کا علم بصری نہیں، سماعی ہے ان سے متعلق بھی ان کے بعض مشاہدات یا اِدراکات دلچسپ ہیں اور قرینِ قیاس معلوم ہوتے ہیں۔ سر ضیاء الدین احمد اگرچہ ان کے، اور راقم الحروف کے بھی، دور طالب علمی میں طویل مدت تک وائس چانسلر رہے تھے تاہم ان سے مختارالدین صاحب کی شناسائی دور ہی کی ہو سکتی تھی، عمر اور منصب دونوں کے تفاوت کی بنا پر۔ پھر بھی ضیاء الدین احمد صاحب خاصے عوامی آدمی تھے اور ان کے بارے میں علی گڈھ میں واقعات اور لطیفے بھی اِتنے مشہور تھے کہ یہاں کا ہر طالب علم، بالخصوص وہ طالب علم جو کسی لحاظ سے بھی ممتاز ہو، ان کے بارے میں کچھ نہ کچھ واقفیت حاصل ہی کر لیتا تھا۔ مختار الدین صاحب نے پیش نظر مضمون میں ان سے اپنی جن چار مختصر ملاقاتوں کا حال لکھا ہے ان سے ڈاکٹر صاحب (کہ ضیاء الدین صاحب علی گڈھ میں اِس لقب سے معروف تھے) کی علم دوستی پر اچھی روشنی پڑتی ہے نیز ان کی بعض ان خصوصیات کی بھی تصدیق ہو جاتی ہے جن کا حوالہ اوپر دیا گیا۔ سونے کے معاملے میں وہ بلا شبہ بہت بااختیار تھے لیکن یہ ضروری نہیں تھا کہ جس شخص کو وہ اِس قسم کا مشورہ دیتے وہ بھی اِتنا ہی بااختیار ہوتا۔

Marfat.com

پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب فارسی اور اردو زبانوں کے ممتاز محقق رہے ہیں اور ان کی تحقیق کا دائرہ خاصہ وسیع رہا ہے ۔ اس میں اودھ کا شاہی خاندان، تھیٹر ، قدیم اُردو شعراء کے دواوین اور تاریخ ادب اُردو کے علاوہ بعض دوسرے موضوعات شامل ہیں ،وہ اپنے علمی مرتبے کے علاوہ وہ ایک نہایت مہذب اور خوش گفتار انسان تھے اگرچہ ان کی خوش گفتاری بسا اوقات ان کی سنجیدگی اور کم گوئی میں پوشیدہ رہتی تھی ۔ مختار الدین احمد صاحب نے ان کی شخصیت کا بہت دل فریب نقش صفحۂ قرطاس پر مُرتسم کیا ہے ۔ ملاحظہ ہو:

> وہ پہلے تو خاموش اور کم آمیز معلوم ہوئے لیکن گفتگو آگے بڑھی تو ان کی بذلہ سنجی اور خوش گفتاری کا اندازہ ہوا..... دل چاہتا تھا کہ وہ بولتے رہیں اور ہم سنتے رہیں ۔ اندازہ ہوا کہ جیسی زبان لکھتے ہیں ویسی ہی صاف ستھری ، شستہ اور دھلی ہوئی زبان بولتے بھی ہیں ۔ باتیں ٹھہر ٹھہر کر کرتے ہیں جیسے بولنے سے پہلے لفظوں کو تول رہے ہوں۔ ان کے انداز میں دل کشی اور گفتگو میں لطافت و شگفتگی تھی ۔ نرم لہجے میں اور ایسی دھیمی لے سے باتیں کرتے ہیں جیسے کہیں آہستہ آہستہ ندی بہہ رہی ہو ۔ اِن کی گفتگو میں سمندر کے طوفان یا تیز دریا کے بہاؤ کا انداز نہیں ہے ۔''

اس عبارت سے جہاں ایک طرف مختار الدین صاحب کے مشاہدے کی گہرائی کا اندازہ ہوتا ہے وہاں دوسرے طرف ان کے حُسن اِنشا سے بھی لُطف اندوز ہونے کا موقع ملتا ہے ۔

پروفیسر مسعود حسین خاں پر فاضل مضمون نگار کا مضمون پڑھتے ہوئے ہم ان کی طبیعت کے ایک ایسے رُجحان سے آشنا ہوئے جو ابھی تک ہماری نظر کے سامنے نہیں آیا تھا۔ اِس مضمون سے پروفیسر احمد کے مزاج کے ناقدانہ پہلو اور ان کی قلم کی درّا کی سے ہمیں آگاہی ہوتی ہے۔

مسعود حسین صاحب سے مختار الدین صاحب کے مراسم گوناگوں نوعیت کے رہے اور ان میں برابر اِضافہ ہوتا رہا ۔ تا آں کہ وہ مسعود صاحب کی وائس چانسلری میں کئی برس تک جامعۂ اردو کے پرووائس چانسلر رہے ۔ زیرِ نظر مضمون میں جہاں ان مراسم کی داستان بیان ہوئی ہے وہاں مختارالدین صاحب کے مزاج کے مطابق مسعود صاحب کے

Marfat.com

خاندانی حالات بھی خاصی تفصیل سے بیان ہوگئے ہیں۔

مختار الدین صاحب نے مسعود حسین صاحب کی خوبیوں کا برملا اِعتراف کیا ہے، ان کی لسانیات سے اُردو ادب وشاعری کی طرف مراجعت کو فالِ نیک قرار دیا ہے اور خود لسانیات میں ان کے کارناموں کی دل کھول کر داد دی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جہاں کہیں اختلافات کا پہلو نکلتا ہے وہاں بھی مختار الدین صاحب کے قلم کی شرافت نے ان کا ساتھ نہیں چھوڑا ہے اور نہ کسی بھی درجے میں وہ دل آزاری کے مرتکب ہوئے ہیں بلکہ کہیں راست حملہ بھی نہیں کیا ہے۔ جو کچھ کہا گیا ہے بس اِشاروں کنایوں میں کہا گیا ہے۔

ڈاکٹر احمد امین کسی ایسے شخص کے لیے محتاج تعارف نہیں ہیں جسے عربی ادب سے شُدبُد بھی ہے۔ان کی کئی تصانیف بعض دوسری زبانوں (بشمولیت اردو) میں بھی شائع ہوکر دادِ تحسین حاصل کر چکی ہیں۔مسلمانوں کی ثقافتی تاریخ پر ان کا کام سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے اور ان کی خود نوشت ''حیاتی'' حقیقت نگاری اور حُسنِ انشاء دونوں لحاظ سے ممتاز ہے۔ پروفیسر مختار الدین احمد ان کی علمیت اور اس سے بھی زیادہ ان کے اسلوب نگارش کے بہت قائل اور مداح ہیں۔ انھوں نے ۱۹۵۳ میں یوروپ جاتے ہوئے قاہرہ میں ان سے ملاقاتیں کیں اور ان کے خیالات سے مستفید ہوئے۔ اس وقت احمد امین صاحب اپنی عمر کے آخری دور سے گزر رہے تھے اور بہت کم زور ہوگئے تھے۔ یہ ذکر زیر نظر مضمون میں پروفیسر احمد نے بھی کیا ہے۔تاہم اپنی دو مختصر ملاقاتوں میں انھوں نے احمد امین صاحب کے بارے میں خاصی مفید معلومات حاصل کرلیں۔ جب مختار الدین احمد صاحب نے ان سے کہا کہ ان کا یہ سفر ہوائی جہاز سے ہو رہا ہے تو انھوں نے جو جواب دیا اور اپنے ماضی کا جو تاثر بیاں کیا اس کا ذکر خوب صورتی سے پیش کیا گیا ہے: ''افسوس تم سمندر کے لطف سے محروم رہے۔ سمندر کے سفر میں جو بات ہے وہ ٹرین یا ہوائی جہاز کے سفر میں ممکن نہیں'' انھوں نے کہا ''سمندر سے مجھے بچپن سے عشق رہا ہے..... سمندر کے حسن سے پہلی بار مجھے اِسکندریہ میں شاد کام ہونے کا موقع حاصل ہوا۔ فرصت کے وقت میرا بہترین مشغلہ یہ ہوتا تھا کہ سمندر چلا جاتا اور گھنٹوں موجوں کی طغیانی دیکھتا رہتا، وہ کہتے تھے کہ موجوں کے زیر و بم کے نظارے سے بھی مجھے ایک خاص قسم سرور حاصل رہتا۔''

Marfat.com

احمد امین صاحب کا یہ مشاہدہ ان کی فطرت سے آہم ہنگی اور اس کے حُسن سے لطف اندوزی کی صلاحیت کی علامت ہے۔

ڈاکٹر سیمویل اِسٹرن پروفیسر احمد کے آکسفورڈ کے ہم عصر اور گہرے دوست اور خواجہ تاش (پروفیسر گب کے شاگرد) تھے۔ وہ اگر چہ عمر میں ان سے بڑے تھے لیکن تعلقات دوستانہ اور بے تکلفانہ تھے۔ ڈاکٹر اِسٹرن سے ان کے تعلقات آکسفورڈ سے واپسی کی بعد بھی ان کی وفات تک قائم رہے۔ انھوں نے ان کی وفات پر اپنے مختصر مضمون میں ڈاکٹر اِسٹرن کی شخصیت اور ان کے عادات و اطوار، بالخصوص ان کے علمی ذوق کی بہت اچھی اور دل فریب نقش آرائی کی ہے، اس آخر الذکر وصف میں خود مختار الدین احمد صاحب ان کے شریک و سہیم تھے۔ پروفیسر احمد کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ ''اسٹرن ھسپانوی شاعری کی تاریخ کے ہر موڑ سے واقف تھے اور اس کی وجہ ان کی عبرانیات، عربی اور رومانی ادب سے گہری واقفیت تھی جس کی وجہ سے اِس میدان میں انھوں نے نہایت اعلیٰ تحقیقات کیں اور ان کے نتائج شائع کیے۔'' اور پھر اِس ضمن میں پروفیسر احمد نے اپنی عادت کے مطابق ان کے کام کی پوری تفصیل دیدی ہے۔

مختار الدین احمد صاحب، جن لوگوں کے حالات لکھتے ہیں ان کے بارے میں تو تمام ضروری معلومات درج کر ہی دیتے ہیں لیکن جن حضرات کا ذکر ضمناً بھی آجاتا ہے ان سے بھی وہ پڑھنے والوں کی پوری واقفیت کرادیتے ہیں۔ مولانا احسن مارہروی سے مختار الدین صاحب کی پہلی ملاقات پٹنہ میں ہوئی تھی جہاں وہ درگاہ شاہ ارزاں میں ٹھہرے ہوئے تھے اور مختار الدین صاحب کے والد ماجد مولانا شاہ ظفر الدین صاحب قادری ان سے ملنے کے لیے وہاں تشریف لے گئے تھے۔ ان کے ساتھ مختار الدین صاحب بھی تھے۔ اِس مضمون میں انھوں نے احسن صاحب کا ذکر تو پوری دلجمعی اور عقیدت کے ساتھ کیا ہی ہے لیکن وہاں ان کی جن لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں ان کی تفصیلات بھی لکھ دی ہیں۔ درگاہ شاہ ارزاں کے سجادہ نشین اور احسن صاحب کے میزبان سید شاہ حامد حسین حامد تھے۔ اِن بزرگ کا کچھ احوال مختار الدین احمد صاحب کے قلم سے ملاحظہ کیجئے:

''وہ عجیب و غریب شخصیت کے مالک تھے اور بعض متضاد اوصاف سے متصف ..... ساٹھ سال کی عمر تھی اس وقت لیکن قویٰ بہت عمدہ۔ پان، حقہ، سگریٹ، چائے

Marfat.com

غرض کہ تمام مشروبات و مسکرات سے پرہیز کرتے تھے، صرف افیون کا شغل فرمالیتے تھے۔'' اب اگر یہی بات مختار الدین صاحب اِس طرح لکھتے کہ افیون کے رسیا تھے تو یہ لطف کلام کہاں پیدا ہوتا اور پھر حملہ بھی براہِ راست ہوجاتا جس سے مختار الدین صاحب اپنی عادت کے مطابق بچنا چاہتے تھے۔

جمیل الدین عالی صاحب سے متعلق مضمون میں جہاں مختار مسعود کا ذکر آ گیا ہے وہاں ان کی پوری شخصیت کا عطر چند جملوں میں کھنچ آیا ہے۔ مختار مسعود اِسکول اور یونیورسٹی میں کئی سال ہمارے ہم درس اور ساتھی رہے ہیں، اس لیے ہم یہ بات پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں۔ مختار الدین صاحب نے اپنے (اور ہمارے بھی) اُستاذ محترم پروفیسر عبدالعزیز میمن کا حقِ اُستاذی جس جس طرح ادا کیا ہے ہم پورے اعتماد کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ کوئی اور نہیں کرسکا ہے۔ بالخصوص عرب و عجم کے مشاہیر علماء و محققین کے گراں قدر مقالات پر مشتمل مجلة المجمع العلمی الهندی کے ہزار صفحات پر مشتمل دوشان دار خصوصی شمارے اُستادِ محترم پر مرتب اور شائع کر کے انھوں نے جو کارنامہ انجام دیا ہے اور ایسا کرنے میں جن دشواریوں کا سامنا انھوں نے کیا ہے اس کی تعریف کرنا محال ہے۔ جب مختار مسعود نے دوران گفتگو میمن صاحب کے اخلاق و کردار سے متعلق بعض ایسی باتیں دہرائیں جو نہ صرف علی گڈھ میں بلکہ علی گڈھ سے باہر بھی زباں زد خاص و عام تھیں تو مختار الدین صاحب نے نہایت معقولیت اور شائستگی سے ان کی تردید ضروری سمجھی۔ یہاں ہمیں اپنے فاضل دوست ڈاکٹر رشید احمد جالندھری حال ڈائرکٹر اِدارۂ ثقافت اِسلامیہ پاکستان کا آج سے کوئی ۴۵، ۴۶ سال پہلے کہا ہوا یہ قول یاد آتا ہے کہ کوئی شخص کتنا ہی بڑا عالم فاضل کیوں نہ ہو اس سے متاثر ہونے والوں کی تعداد بہرحال محدود ہوتی ہے۔ اِس کے بخلاف اِنسان کا اخلاق و کردار ہر اس شخص کو متاثر کرتا ہے جس سے اس کا واسطہ پڑتا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اگر مختار مسعود، میمن صاحب کے قریب آئے ہوتے تو ان کے اخلاق و کردار کے کئی گوشے ایسے بھی تھے جو انھیں ضرور متاثر کرتے۔ میمن صاحب کی سادگی، ان کی شفقت، ان کی بذلہ سنجی اور عام گفتگو میں بھی ان کی ذہانت اور علمیت کی جھلکیاں کسی کو بھی ان کا حلقہ بگوش اِرادت بنا دینے کے لیے کافی تھیں۔ مختار الدین احمد صاحب کی تحریروں میں بعض جگہ یہ ضرور محسوس ہوتا ہے کہ جن لوگوں کا ذکر ضمنی طور پر آ گیا ہے ان

Marfat.com

کے بارے میں معلومات کچھ زیادہ طویل ہوگئی ہیں اور اس لیے موضوع کسی قدر پسِ پشت چلا گیا ہے۔

مختار الدین احمد صاحب کی خود اپنے بارے میں تین تحریریں ہمارے سامنے ہیں: مختار الدین احمد آرزو، یادوں کے چراغ اور جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے۔ پہلے مضمون میں بچپن کی یادیں اور لڑکپن کی باتیں ہیں، ابتدائی تعلیم کا ذکر ہے اور بعض بزرگوں اور استادوں کا تذکرہ ہے۔ پٹنہ کی ادبی محفلوں کی بازیافت ہے جن میں شاعروں کا حصہ نمایاں ہے اور بعض مشاعروں کی دل چسپ داستان ہے۔ یہاں جن شعراء یا ان کے شاگردوں سے ہماری ملاقات ہوتی ہے ان میں شاد عظیم آبادی کے بعض تلامذہ، کچھ دوسرے شعرا: مبارک عظیم آبادی، ریاض حسن خاں خیالؔ، مولانا تمنا عمادی، احسن مارہروی، نوح ناروی اور نظام الدین بلخی قابل ذکر ہیں۔

''یادوں کے چراغ'' کی یادیں علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے زمانۂ طالب علمی کے اس دور سے تعلق رکھتی ہیں۔ جب وہ ۵۷۔ایس ایس ویسٹ، سرسید ہال میں مقیم تھے۔ یہ یادیں ۱۹۴۷ سے ۱۹۵۲ تک پانچ برسوں پر پھیلی ہوئی ہیں۔ ان میں مختار الدین صاحب کے بعض ہم عصر طالب علم بھی ہیں اور بعض شفیق اور ممتاز استاد بھی۔ وائس چانسلر ڈاکٹر ذاکر حسین کا جلوہ تو نمایاں ہونا ہی تھا، اُستادوں میں ان کے ذہن میں پہلا نام ایس۔ ایم شفیع صاحب کا اُبھرتا ہے جو پہلے شعبۂ معاشیات میں اُستاد تھے اور پھر شعبۂ تجارت کے بانی چیرمین ہوئے۔ وہ ایک نہایت کام یاب پراکٹر تھے اور پرووسٹ بھی بہت اچھے رہے۔ شفیع صاحب کی اِنتظامی قابلیت کی مختار الدین صاحب نے بجا طور پر بہت تعریف کی ہے۔ ان کی شفقت و محبت کے بھی وہ مداح ہیں۔ اپنے دوسرے نام ور اُستاد پروفیسر عبدالعزیز میمن کا نام تو عقیدت اور اِحترام کے ساتھ یاد آنا ناگزیر تھا۔ اس زمانے میں علی گڈھ میں جو مقامی اور بیرونی (ملکی اور غیر ملکی دونوں) مہمانان گرامی تشریف لاتے رہے ان میں سے بیشتر کا ذکر مختار الدین احمد صاحب نے کیا ہے۔ ان میں سے بعض سے ان کی ملاقات ان کے ہوسٹل کے کمرہ ۵۷ ایس ایس ویسٹ میں ہوئی جن میں ڈاکٹر رادھا کرشنن، سر ہومی مودی گورنر یو پی، ڈاکٹر سید محمود، شیخ محمد عبد اللہ (پاپا میاں)، ذاکر صاحب، ڈاکٹر عبد الستار صدیقی شامل ہیں۔ قدرتی طور پر ان یادوں کا سب سے زیادہ

Marfat.com

حصہ دوستوں اور ایس ایس ویسٹ ہوسٹل کے رفیقوں کی نذر ہوا ہے ۔ساتھی طلبہ میں مختار الدین صاحب کو سب سے پہلے شاہ حسن عطا یاد آتے ہیں جو اسٹوڈینٹس یونین کے بہت کام یاب مقرر تھے اور اس کے سکریٹری اور نائب صدر بھی رہے تھے ۔

''جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے'' کا محور زیادہ وسیع ہے ۔ یہ مضمون فاضل مضمون نگار کی اِبتدائی زندگی سے آکسفورڈ تک کی زندگی پر حاوی ہے ۔اس میں بالخصوص ان کے اساتذہ یا ان لوگوں کا ذکر خاصی تفصیل سے ملتا ہے جن سے وہ متاثر ہوئے ۔ اِس میں بعض ان باتوں کا اِعادہ بھی ہوگیا ہے جو دوسرے مضامین میں آ گئی ہیں ۔ اِس مضمون کی تمہید میں وہ رقم طراز ہیں:

> ''زندگی کڑی دھوپ کا سفر ہے ۔ اِس سفر میں ذہنی طور پر کام یابی سے ہم کنار ہونے کے لیے کسی ایسی شخصیت ، کسی ایسے اِحساس ، کسی ایسے فکری یا روحانی تحریک کا تصور ضروری ہے جو ایک شجر سایہ دار کی علامت ہو اور جسکے گھنے سائے میں زندگی کی طویل جدّ وجہد اِعتماد ، حوصلوں اور اقدار کے تصور سے ہم آہنگ رہے ۔ آیئے زندگی کے گھنے جنگل میں کچھ ایسے شجر سایہ دار کا حال آپ کو سناؤں ۔''

اور ایسا پہلا سایہ دار شجر تھے ان کے وہ بزرگ جن سے انھوں نے ''قرآن پاک کے کچھ پارے'' پڑھے ۔ یہ بزرگ ''اپنے گاؤں کے زمیں داروں میں تھے ۔ وہ دن رات دیوان خانے میں بیٹھے تلاوتِ قرآن کرتے تھے اور مصروف عبادت رہتے تھے ۔ زمین داری کس طرح چلتی تھی اللہ بہتر جانتا ہے''

اِس طرح یہ داستان حیات آگے بڑھتی ہے اور نئے نئے کرداروں سے ہماری شناسائی ہوتی جاتی ہے۔ یہ سب وہ ہیں جن سے کسی نہ کسی طور پر مختار الدین احمد صاحب مُتاثر ہوئے ہیں اور اس لیے قدرتی طور پر ان میں سے ہر ایک کی اپنی خصوصیات اور اہمیت ہے ۔ بالآخر عنفوان شباب میں مختار الدین صاحب علی گڈھ آ گئے ۔ انھیں ''یہاں کے قیام نے بہت کچھ بخشا ۔ ہند اور بیرون ہند کے لوگوں سے ملنے ملانے کے مواقع ملے ، طرح طرح کے لوگوں کو برتنے کا سلیقہ پیدا ہوا ، اساتذہ سے فیوض حاصل ہوئے ، طلبہ سے مل جل کر ان کے ساتھ زندگی گزارنے کا گُر سیکھا ۔

Marfat.com

مختلف تجربات سے گزرا، بہت کچھ سیکھا اور بہت کچھ پایا سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ علی گڑھ میں ایک ایسا پُرسکون گوشۂ عافیت ملا جہاں میں نے اس زمانے میں تھوڑے بہت علمی و ادبی کام کیے اور ڈھیر سے منصوبے بنائے۔''

علی گڑھ کے جن اساتذہ کا انھوں نے خاص طور سے ذکر کیا ہے ان میں ایس۔ ایم شفیع صاحب اور پروفیسر عبدالعزیز میمن کے نام نمایاں ہیں۔ اِن کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے، اس لیے اعادہ غیر ضروری ہے۔

دوران سفر قاہرہ میں ڈاکٹر احمد امین کا نہایت تفصیلی اور پُرخلوص ذکر ملتا ہے اور ان کے بارے میں بھی ہم اوپر مختار الدین صاحب کے تأثرات بیان کرچکے ہیں لیکن یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ قاہرہ میں وہ صرف ڈاکٹر احمد امین ہی سے ملے، انھوں نے وہاں اور بھی بہت کچھ دیکھا اور اس کا ذکر بہت کچھ دل چسپ انداز سے کیا ہے۔

آکسفورڈ میں مرکزی شخصیت تو ظاہر ہے کہ پروفیسر گب ہی کی تھی جن کی نگرانی میں کام کرکے پروفیسر احمد نے ڈی، فِل کی ڈگری حاصل کی۔ وہاں کی دوسری اہم شخصیت ڈاکٹر اِسٹرن کی تھی اور ان کا ذکر بھی اوپر گزر چکا ہے۔ پروفیسر کاہلے وہاں کی ایک اور ایسی شخصیت تھی جن سے مختار الدین صاحب بہت متأثر ہوئے۔ لیکن ان کی یاد اِتنی خوش گوار نہیں ہے جتنی سوگوار ہے۔ وہ بہت لائق وفائق آدمی تھے اور انھوں نے بہت علمی کام کیا تھا لیکن ان کا خاندان ''عجیب مصائب کا شکار'' رہا تھا۔ وہ جرمنی کے یہودی تھے اور اس لیے ان کا خاندان وہاں نازیوں کی بربریت کا نشانہ بنا تھا۔ مختار الدین صاحب کے آکسفورڈ کے زمانۂ قیام میں ان کے بیٹے پال کاہلے شدید بیمار ہوگئے، انھیں کینسر ہوگیا تھا۔ اِسی موذی بیماری میں ۲۹ / اپریل ۱۹۵۵ کو ان کا انتقال ہوگیا۔ اس وقت ان کی عمر اکتیس برس تھی۔ اس حادثے کے بعد جب مختار الدین صاحب پروفیسر کاہلے سے ملے تو اس کا حال خود ان کے قلم سے قابلِ مطالعہ ہے:

''پروفیسر کاہلے کو میں نے اِس قدر مضمحل، ایسا افسردہ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ ویسے ہی ضعیف ہیں لیکن مجھے ایسا معلوم ہوا کہ اس حادثے نے ان کی عمر میں بیک وقت دس، پندرہ سال کا اِضافہ کردیا ہے۔ پھر بھی وہ روزانہ کی طرح حسب معمول باڈلین لائبریری آئے، خاموشی سے اپنی میز پر کاغذات پر جھکے رہے اور عربی اور عبرانی کے

Marfat.com

مخطوطات دیکھتے رہے، نوٹس بناتے رہے اور آئن اسٹائن کی طرح کاغذ کے کچھ پُرزوں پر لکھتے رہے، ان میں ترمیم و اصلاح کرتے رہے اور پھر انھیں چاک کرتے رہے اور ردی کی ٹوکری میں ڈالتے رہے۔"

آکسفورڈ کے بعد مختار الدین صاحب کی زندگی کے حالات ہمیں کسی ایک جگہ تو نہیں ملتے ہیں لیکن بعض دوسرے لوگوں پر اپنے مضامین میں انھوں نے اپنے بارے میں بھی بہت کچھ لکھ دیا ہے۔ مثلاً جب مختار مسعود نے ان سے کچھ سوالات کیے تو انھوں نے ان کے جو جوابات دیے وہ مضمون میں نقل کر دیے ہیں اور ان کی پوری علمی زندگی کا اختصار قاری کی نظر سے گزر جاتا ہے۔

ضرورت ہے کہ مختار الدین احمد صاحب کے یہ مضامین اخباروں اور رسالوں کے انبار ہی میں مدفون نہ رہیں بلکہ جلد از جلد کتابی صورت میں شائع ہو کر اہلِ نظر کی آنکھوں کا سرمہ بنیں۔

☆☆☆

Marfat.com

پروفیسر نیّر مسعود

سابق صدر شعبۂ فارسی، لکھنؤ یونیورسٹی

پروفیسر مختار الدین احمد

میں پروفیسر مختار الدین احمد کے نام سے ۱۹۵۳ء میں آشنا ہوا جب ان کی مرتب کی ہوئی کتاب ''احوالِ غالب'' شائع ہوئی۔ یہ غالب کے حالات بارے میں مختلف اہلِ قلم کے مضامین کا مجموعہ ہے اور اس کا مطالعہ کیے بغیر اس کی اہمیت اور دلکشی کا اندازہ نہیں ہوسکتا۔ یہ مضامین اپنی دلچسپی اور معلومات کی فراوانی کی وجہ سے غالبیات کے سلسلے میں ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ قاضی عبد الودود، رشید احمد صدیقی، سید مسعود حسن رضوی ادیب، مالک رام، غلام رسول مہر، عبد الستار صدیقی وغیرہ نے غالب کی حیات اور تصنیفات کے مختلف گوشوں کو روشن کیا ہے اور اس کا تقریباً ہر مضمون دستاویز ی حیثیت رکھتا ہے۔ خود مختار الدین احمد صاحب کا مضمون ''مرزا غالب کی تصویریں'' بھی خاصے کی چیز ہے۔ اس مجموعے کے بعض مضامین اولاً علی گڑھ میگزین کے غالب نمبر کے طور پر شائع ہوئے تھے۔ کتابی اشاعت کے لیے اس میں کچھ نئے مضامین لکھوائے گئے، کچھ پرانے مگر بہت اہم مضامین بھی شامل کیے گئے، کچھ مضامین میں لکھنے والوں نے اضافے کرکے انھیں مزید کار آمد بنایا۔ بہت سی قیمتی تصویریں شامل کی گئیں، اور آج پچاس برس گذر جانے اور اس عرصے میں غالب کی سو سالہ اور دو سو سالہ تقریبات، اور غالبیات میں بے شمار تحریریں سامنے آجانے کے بعد بھی ''احوال غالب'' مرزا غالب پر چند اہم ترین کتابوں میں سے ایک ہے۔

''احوال غالب'' پروفیسر مختار الدین احمد کی پہلی کتاب ہے۔ اس طرح ۲۰۰۳ء اس کی اور پروفیسر مختار الدین احمد صاحب کی تصنیفی زندگی کی جوبلی کا بھی سال ہے۔ اس کے بعد انھوں نے غالبیات کے علاوہ مختلف موضوعات پر اتنے مضمون اور کتابیں لکھیں اور اردو فارسی، عربی ادب پر اتنا کام کیا ہے کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک فردِ واحد نے جس کے ذمہ لکھنے پڑھنے کے علاوہ اور بھی کام تھے، تصنیف و تالیف کے لیے اتنا وقت کس طرح نکال لیا۔

۱۹۵۲ء میں پروفیسر مختار الدین احمد نے والدِ مرحوم سید مسعود حسن رضوی ادیب

Marfat.com

کو ایک خط لکھا تھا ۔ اس وقت ان کی عمر اٹھائیس برس کی تھی۔ اس خط سے ان کی علمی حوصلہ مندی کا اندازہ ہوتا ہے، اور ان کی عام روشِ مراسلت بھی معلوم ہوتی ہے، اس لیے اس کو یہاں نقل کیا جاتا ہے:

علی گڑھ ۵۲/۴/۵

مخدومی، تسلیمات

آپ کے یگانہ چنگیزی آج کل کہاں ہیں اور ان کا پتا کیا ہے۔ انھوں نے شاید غالب کا ایک خط بہ نام والی بھوپال کہیں شائع کیا ہے۔ کیا آپ کی نظر سے یہ خط گزرا ہے؟ اس میں بڑی لجاجت ہے اور مجموعی انداز وہی ہے جو کلب علی خاں کے نام بعض خطوں میں ہے۔ اس گداگری پر یگانہ نے اعتراض کیا ہے اور ان کے اخلاقی زوال پر ماتم کیا ہے۔ مجھے اس خط کی نقل کی ضرورت ہے۔

آپ نے ذکر فرمایا تھا کہ (حاتم علی) مہر کی تصویر ڈاکٹر متین صاحب مدرسۂ نظامیہ کے پاس ہے۔ کیا اس کے عکس کے ملنے کی کوئی سبیل ہوسکتی ہے؟ اخراجات انجمنِ ترقی اردو کے ذمے ہوں گے۔

۳۔ مشتری کی نثر فارسی کی ایک کتاب ''خانۂ خیال'' یہاں ہے جو مطبعِ عالی گلزار محمدی کی چھپی ہوئی ہے۔

۴۔ ''ہندوئے، زشت خوئے، سیہ روئے'' غالب کے خط کا یہ ٹکڑا کہاں پر کا ہے، یعنی کس جملے کے بعد لکھا جائے گا۔

۵۔ یہاں ''ناجو'' واجد علی شاہ اختر کا ایک قلمی نسخہ بھی ہے۔ میں عربی کی تھیسس سے فارغ ہو چکا ہوں۔ کوئی ٹھوس اور علمی کام اردو میں بھی کرنا چاہتا ہوں۔ میں بڑا ممنون ہوں گا اگر آپ کرم فرما کر مشورہ دیں کہ کیا کام کروں۔ کسی موضوع پر بھی کام کرسکتا ہوں، اور کسی قلمی کتاب کو ایڈٹ کرنے سے بھی دل چسپی ہے۔ کوئی دیوان، تاریخ کی کتاب یا تذکرہ ایسا بتایئے جو ممکن الحصول ہو اور جس پر آپ کے مشورے سے کام کرسکوں۔ براہِ کرم ایسی کتابوں کے نام ضرور بتایئے جن پر کام کیا جاسکتا ہو۔

امید ہے مزاج گرامی قرینِ صحت و عافیت ہوگا۔ والسلام

نیاز مند مختارالدین احمد

اور ۱۹۵۵ء میں ان کو جرمنی میں فضلی کی ''کربل کتھا'' کا مخطوطہ مل گیا۔ یہ ایک

Marfat.com

اہم دریافت تھی انھوں نے پورے اہتمام کے ساتھ اس کی تدوین کی اور اپنے بسیط مقدمے اور ضروری حواشی کے ساتھ جناب مالک رام کے تعاون سے ۱۹۶۵ء میں اسے شائع کیا۔

مختار الدین احمد صاحب کا ایک بڑا کارنامہ مشاہیر کے خطوط کا تحفظ اور اشاعت ہے وہ بڑی تعداد میں خطوط شائع کر چکے ہیں اور ابھی ان کے پاس بہت بڑی تعداد میں خطوط موجود ہیں۔وہ کئی سال سے قاضی عبد الودود صاحب کے خطوط کی جمع آوری اور ترتیب میں مصروف ہیں۔ یہ ان کا ایک اور ادبی کارنامہ ہوگا ۔ اپنے نام آئے ہوئے خطوں کو بھی انھوں نے حفاظت اور خوش ترتیبی کے ساتھ جمع کر رکھا ہے ۔ ان کے کئی مجموعے تیار ہو سکتے ہیں۔خطوط کی اہمیت کی طرف ابھی ہماری توجہ کم ہے لیکن مختار الدین احمد صاحب نے اس اہمیت کو سمجھ لیا ہے۔

عربی اور فارسی کی بھی انھوں نے بہت اہم خدمات انجام دی ہیں ۔ایسے لکھنے والے کم ہیں جو ان تینوں زبانوں پر مستند کام انجام دے سکتے ہوں۔

تحقیق کے معاملات میں بعض اوقات دوسروں سے اختلاف کرنا پڑتا ہے ۔ پروفیسر مختار الدین احمد نے بھی اختلاف کیا ہے لیکن اس کا اظہار وہ اس قدر شایستہ پیرایے میں کرتے ہیں کہ اس میں برہمی یا ذاتیات کا شائبہ نہیں آنے پاتا۔

خالص علمی اور تحقیقی کام کرنے کے ساتھ مختار الدین احمد صاحب نے تخلیقی نثر بھی لکھی ہے اور معاصر ادیبوں کی طرف بھی توجہ کی ہے ۔ان کی ڈائری کے اقتباسات اور سفر نامے چھپ چکے ہیں جو بہت دل چسپ اور مفید ہیں ۔ ان میں بھی ان کا علمی مزاج جھلکتا ہے ۔تحریر کی شگفتگی اس پر مستزاد ہے۔

عمر کی آٹھویں دہائی کے آخری برسوں میں پہنچ جانے کے باوجود پروفیسر مختار الدین احمد صاحب کی ادبی فعالیت میں کمی نہیں آئی ہے ۔ان کا ذہن بھی اُسی طرح تر و تازہ ہے اور ہمیں امید ہے کہ ابھی ان سے ہم کو کئی ادبی اور علمی شاہکار ملیں گے ۔

بڑی خوشی کی بات ہے کہ غالب انسٹی ٹیوٹ پروفیسر مختار الدین احمد صاحب کی علمی خدمات کے اعتراف میں ایک جلسے کا اہتمام اور ایک کتاب کی اشاعت کر رہا ہے ۔ ہمارے اِن بزرگ ادیبوں کو اس کی پرواہ نہیں ہے، لیکن ہمارا فرض انھیں کم سے کم یہ بتانا ہے کہ ہم ان سے اور اُن کے تصنیفی کاموں سے بے خبر نہیں ہیں۔

☆☆☆

Marfat.com

ڈاکٹر خلیق انجم
سکریٹری انجمن ترقی اردو ہند

پروفیسر مختار الدین احمد: ممتاز ماہرِ غالبیات

پروفیسر مختار الدین احمد صاحب کی تعلیم کی ابتدا گھر پر ان کے والد مولانا شاہ ظفر الدین قادری کی نگرانی میں عربی اور فارسی سے ہوئی ۔ انھوں نے مولوی ، عالم اور فاضل کی تعلیم مدرسۂ اسلامیہ شمس الہدی پٹنہ کے نامور اساتذہ سے حاصل کی ۔ فاضل کے امتحان میں وہ بہار اور اڑیسہ کے تمام طلبہ میں اوّل آئے ، جس پر انھیں سرفخرالدین گولڈ میڈل سے نوازا گیا۔ سرفخرالدین اس وقت بہار اڑیسہ کے وزیر تعلیمات و معارف تھے ۔ اس کے بعد مختار صاحب نے ''فاضل حدیث'' کا دوسال کا کورس مکمل کیا اور اس بار بھی وہ پورے صوبے میں اوّل آئے اور پھر اِس وقت کے وزیر تعلیمات سید عبدالعزیز گولڈ میڈل کے مستحق قرار دیے گئے ۔ عربی اور فارسی کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد مختار صاحب نے پرائیوٹ طور پر پڑھ کر مسلم ہائی اسکول میں دسویں کلاس میں باقاعدہ داخلہ لے لیا۔ خاندان صادق پور پٹنہ سٹی کے ایک ممتاز ماہر تعلیم سید حامد جعفری اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ ان کی شخصیت سے وہ متاثر ہوئے۔وہ میٹرک کا امتحان پاس کرکے کچھ دنوں کے بعد ۱۹۴۳ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی چلے آئے ۔ جہاں سے انھوں نے اِنٹرمیجیٹ ، بی ۔اے اور پھر ایم ۔اے کیا۔ایم ۔اے (عربی) میں وہ یونیورسٹی میں اول آئے ۔ایم ۔اے کے بعد مختار صاحب نے علامہ عبدالعزیز میمن کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کے لیے داخلہ لیا ساتھ ہی ساتھ لٹن لائبریری کے شعبۂ مخطوطات کی نگرانی بھی کرتے رہے۔ اس مصروفیت کے باوجود ایک سال گیارہ مہینے کی مختصرمدت میں انھوں نے اپنا تحقیقی مقالہ مکمل کرلیا۔ان کا موضوع تھا صدرالدین علی بن ابی الفرج البصری (م ۶۵۶ھ) کی کتاب الحماسة البصرية کی تصحیح و تعلیق وتحشیہ ۔۱۹۵۲ء میں یونی ورسٹی نے انھیں پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی ۔ان کے مقالے کے ایک ممتحن مشہور جرمن مستشرق اور مخطوطہ شناس پروفیسر فرٹیس کرینکو (کیمبرج) تھے۔ان کا مقالہ علمیہ دائرۃ المعارف حیدرآباد اور پھر عالم الکتب بیروت سے شائع ہوا۔

Marfat.com

ڈاکٹریٹ کے بعد وہ یونیورسٹی لائبریری میں اسسٹنٹ لائبریرین اور جنوری ۱۹۵۳ میں شعبۂ عربی میں لکچرر مقرر ہوئے ۔اسی سال انھیں راکیفلر فاؤنڈیشن کی طرف سے ایک سال کے لیے فیلوشپ تفویض ہوئی، اور وہ عراق ، بیروت ، شام ،مصر میں قیام کرتے ہوئے اور وہاں کے علماء و محققین اور جدید مصنفین سے استفادہ کرتے ہوئے انگلستان پہنچے جہاں وہ آکسفورڈ یونی ورسٹی میں رسرچ اسکالر کی حیثیت سے داخل ہوئے اور پروفیسر سر ہملٹن گِب کی نگرانی میں فاؤنڈیشن کے تجویز کردہ موضوع Social Criticism In Modern Arabic Literature کے موضوع پر مطالعہ شروع کیا۔ وہ شرق اوسط کے ممالک کے جدید عربی نثر نگاروں کی تخلیقات کے مطالعے کے بعد، قدیم عربی ادب پر تحقیقی کام کے لیے گب صاحب کے مشورے پر مزید سال ڈیڑھ سال کے لیے رک گئے ۔گب صاحب نے اس سلسلے میں شعبہ عربی کے صدر پروفیسر عبد العلیم اور یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر ذاکر حسین کو خطوط لکھے جن کی سفارش پر یونیورسٹی نے ان کے لیے تعلیمی فرصت منظور کی۔ ساتویں صدی ہجری کے سوریا کے تف اور شاعر مسلم بن محمود الشیز ری کی اہم اور نایاب تصنیف جمهرة الاسلام ذات النثر والنظام کے تحلیلی تجزیے اور مخطوطے کے اہم مندرجات نظم ونثر کی اڈیٹنگ کا کام ان کے سپرد کیا۔ انھیں اپنی اس تحقیق کے سلسلے میں بوڈلین لائبریری (آکسفورڈ)، برٹش میوزیم اور انڈیا آفس لائبریری (لندن) کے سیکڑوں مخطوطات دیکھنے اور وسیع پیمانے پر ان کے مطالعہ کا موقع ملا۔ آکسفورڈ، کیمبرج ،لندن اور یورپ کے کتب خانوں میں عربی ادب پر انھیں وہ کتابیں پڑھنے کو ملیں جو ہندوستان نہیں پہنچی تھیں۔ ان کتب خانوں سے فارغ ہو کر انھوں نے، انگلینڈ اور اسکاٹ لینڈ کے دوسرے کتب خانوں کا رخ کیا ،وہ ہالینڈ، جرمنی اور فرانس گئے اور وہاں کی لائبریریوں سے انھوں نے بہت استفادہ کیا اور جب ان کا مقالہ مکمل ہوا تو اُن کے نگران کار پروفیسر گب اور پروفیسر بیسٹن ان کے کام سے بہت خوش ہوئے ۔ گب صاحب نے ایک خط میں ذاکر صاحب کو لکھا تھا کہ مختار الدین احمد کا علمی کام یونیورسٹی کے لیے قابل فخر ہے۔ ان کے ممتحنوں میں پروفیسر آربری (کیمبرج) اور پروفیسر بیسٹن تھے انھوں نے مقالے کی بہت تعریف کی اور سفارش کی کہ اوکسفورڈ یونیورسٹی پریس اسے شائع کرے۔

مختار صاحب بنیادی طور پر عربی کے عالم ہیں ۔انھوں نے عربی میں جو کتابیں

Marfat.com

لکھیں یا مرتب کی ہیں ان مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابوں کی فہرست مالک رام صاحب نے ''نذرِ مختار'' (دہلی ۱۹۸۸) میں دے دی ہے ان کے عربی کے مقالات کی فہرست 'مختار نامہ' مرتبہ ڈاکٹر عطا خورشید، مہر الٰہی ندیم (علی گڑھ ۲۰۰۲) میں دیکھی جاسکتی ہے۔

اردو میں مختار صاحب نے متعدد کتابیں مرتب کیں اور سیکڑوں علمی و تحقیقی مضامین لکھے۔ ان کا ایک بہت اہم کارنامہ ''کربل کتھا'' کی دریافت اور اس کی ترتیب واشاعت ہے۔ اس مخطوطے کی تلاش میں مختار صاحب نے کیا کیا معرکے سر کیے اس کی تفصیل مطبوعہ 'کربل کتھا' کے مقدمے میں بیان کی گئی ہے۔ مختصر یہ کہ تلاش بسیار کے بعد انھیں یہ مخطوطہ جرمنی کے ایک چھوٹے سے شہر ٹیوبنگن کی لا یری میں مل گیا۔ یورپ سے واپسی کے کچھ دنوں کے بعد مختار صاحب نے مالک رام صاحب کے تعاون سے اس کتاب کا ایک اعلیٰ درجے کا تنقیدی اڈیشن تیار کیا اور اسے ۱۹۶۵ میں دہلی سے شائع کر دیا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ عربی میں مختار صاحب کی ادبی زندگی کا آغاز تحقیق سے ہوا لیکن ان کی اردو ادبی زندگی شاعری، افسانہ نگاری اور ڈرامہ نویسی سے شروع ہوئی۔ انھوں نے افسانے ڈرامے لکھے لیکن کہیں چھپوائے نہیں۔ وہ شاید ان سے مطمئن نہیں تھے۔ ان کے اشعار پٹنہ کے اخبارات اتحاد (اڈیٹر سلطان احمد شہسرامی)، مسلم (اڈیٹر سید منظر علی ندوی)، الھلال (اڈیٹر سید زکریا فاطمی ندوی/عبد الاحد فاطمی)، استقلال اور آزاد (اڈیٹر مولانا عبد الباقی خاں) وغیرہ میں شائع ہوتے رہے۔ ان کی پہلی غزل امرتسر کے ایک دینی مذہبی اخبار ''اہلسنت'' (اڈیٹر حکیم معراج الدین احمد) میں شاید ۱۹۳۴ء میں شائع ہوئی۔ انھیں شاعری کا شوق اس زمانے میں اس حد تک تھا کہ شاعر کی حیثیت سے وہ دور دور جاکر مشاعروں میں شرکت کرتے تھے۔ بعض اوقات مشاعرہ گاہ پہنچنے کے لیے انھیں میلوں کا فاصلہ طے کرنا پڑتا تھا اور وہ بھی عام طور سے رات کے وقت۔ ۱۹۳۴-۱۹۳۵ میں پٹنہ کالج کی ''بزم ادب'' اور سائنس کالج کی ''بزم سخن'' کے سالانہ جلسوں کے انعامی مقابلوں میں وہ شریک ہوتے رہے اور اول انعامات حاصل کرتے رہے۔ لیکن انھوں نے ادبی رسالوں میں اپنی نظمیں اشاعت کے لیے کبھی نہیں بھیجیں۔ ان کے اشعار ایسے کم درجے بھی نہیں تھے کہ انھیں محفوظ نہ کیا جاسکتا ہو۔ اچھا ہوا کہ مالک رام صاحب نے ان کے کچھ اشعار ''نذر مختار'' میں محفوظ کر دیے۔ ان کی کچھ غزلیں جو میری نظر سے گزری ہیں، ان کے بارے میں میرا خیال ہے کہ ان کی شاعری کا معیار اُن کے ہم عمروں کی شاعری

Marfat.com

سے کسی طرح کم نہیں تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں انھوں نے تخلیقی ادب سے دلچسپی کے باوجود بعد کو شاعری سے یکسر کنارہ کشی اختیار کرلی۔ وہ یہ کہتے ہوئے ضرور سنے گئے ہیں کہ اگر آدمی جوشؔ اور فراقؔ کے اشعار جیسے بھی شعر نہ کہہ سکے تو ایسی شاعری کا کیا فائدہ! ان کی شعری سرگرمیوں کا زمانہ کوئی پانچ سال رہا ۱۹۳۵ تا ۱۹۴۰۔ پھر انھوں نے شعرگوئی اور مشاعروں میں شرکت سے کنارہ کشی اختیار کرلی اور پورے طور پر نثر کی طرف متوجہ ہوکر خود کو علمی اور تحقیقی موضوعات کے لیے وقف کردیا۔ ملحوظ رہے کہ ان پانچ سالوں میں بھی جب وہ شاعری کی طرف متوجہ تھے وہ تحقیق وتنقید کے کاموں میں لگے رہے۔ ان کے حسب ذیل اہم مضامین اسی زمانے کے لکھے ہوئے ہیں۔

مختار صاحب کے ۱۹۳۸تا۱۹۴۱کے شائع ہونے والے مضامین یہ ہیں:۔

غلام رسول حسرت عظیم آبادی تلمیذ شاد	مثنوی ''خواب حسرت پر مقدمہ''	پٹنہ	۱۹۳۸
سید الشعراء حضرت شاد عظیم آبادی	رسالہ عالمگیر	لاہور	اکتوبر ۱۹۳۸
بدیہہ گوئی	رسالہ جدید اردو	کلکتہ	سالنامہ ۱۹۳۸
چند دکنی مثنویاں	رسالہ ندیم	گیا	نومبر، دسمبر ۱۹۳۸
مصحفی نمبر کی بعض لغزشیں	نگار	لکھنؤ	اپریل ۱۹۳۹
جان گلکرسٹ کے عہد کی ایک گمنام کتاب	ندیم	گیا	اکتوبر ۱۹۳۹
تلامذۂ مصحفی	نگار لکھنؤ	اکتوبر، نومبر	دسمبر ۱۹۳۹
دیوان حافظ اور تفاؤل	رسالہ ایشیا میرٹھ		۱۹۳۹
مرزا غالب کی تاریخ گوئی	ادبی دنیا لاہور		مارچ ۱۹۴۰
عالم علی عظیم آبادی اور اس کی تصنیفات	ندیم گیا		جولائی ۱۹۴۰
کلام اشرف علی خاں فغاں	معاصر		نومبر ۱۹۴۰
شطحیات سید سلیمان ندوی *	نگار لکھنؤ		دسمبر ۱۹۴۰
تاریخ ادب اردو مصنفہ رام بابو سکسینہ	ادبی دنیا لاہور		دسمبر ۱۹۴۰
نقوش سلیمانی (تبصرہ)	جدید اردو کلکتہ		جنوری ۱۹۴۰
نتیجۂ سخن، بنگال کا ایک قدیم گلدستہ	جدید اردو کلکتہ		سالنامہ ۱۹۳۹،
غالب کے چند غیر مطبوعہ اشعار	ہمایوں لاہور		جنوری ۱۹۴۱
مرزا غالب کا کچھ نایاب کلام	ادبی دنیا لاہور		سالنامہ ۱۹۴۱
نقش سلیمانی	جدید اردو کلکتہ		مئی ۱۹۴۲

* یہ عنوان نیاز فتح پوری صاحب نے مضمون پر قائم کردیا تھا۔ مختار صاحب نے بعد کو یہ مضمون اپنے تجویز کردہ عنوان سے شائع کیا۔

Marfat.com

ان کے ابتدائی دو مضامین، سلاطین مغلیہ کی اردو نوازی اور مغل شہزادیوں کی ادب نوازی پر لاہور کے اخبار احسان (مدیر مرتضٰی احمد خاں میکش ؟) یا ''شیرازہ'' (مدیر چراغ حسن حسرت؟) میں غالباً ۱۹۳۷ء میں چھپے تھے۔ یہ مضامین اب نہ ان کے پاس ہیں نہ انھیں ان کی تفصیلات یاد ہیں۔ ۱۹۳۵۔ ۱۹۳۶ء میں بزم ادب پٹنہ کالج کے انعامی مقابلے میں حصہ لینے کے لیے شاد عظیم آبادی اور اردو صحافت کی تاریخ پر طویل مضامین انھوں نے لکھے تھے۔ بہار کی اردو نثر پر بھی مضمون اسی زمانے میں انھوں نے لکھا تھا۔ یہ تینوں مضامین شائع نہ ہو سکے اور ضائع ہو گئے۔ شاد پر مضمون کا خلاصہ عالمگیر لاہور میں چھپ گیا تھا۔ بہار میں اردو نثر والا مقالہ بہت دنوں تک بزم ادب پٹنہ کالج میں محفوظ رہا۔ پروفیسر اختر اورینوی نے اپنے مضمون میں جو ان کے ایک مجموعۂ مضامین میں چھپا ہے اس مضمون کا حوالہ دیا ہے۔

مختار صاحب نے بہت عرصہ ہوا ایک گفتگو کے دوران مجھے بتایا تھا کہ اردو میں ان کا پہلا تحقیقی مضمون 'خالق باری کے طرز کے تین بہاری مخطوطات' پر تھا جسے انھوں نے انجمن ترقی اردو (ہند) کے کل ہند اردو کانفرنس منعقدہ دہلی ۲۹، ۳۰ دسمبر ۱۹۳۹ میں پیش کیا تھا۔ اسے مولوی عبدالحق صاحب نے انجمن کے سہ ماہی رسالے ''اردو'' (جنوری ۱۹۴۳) میں شائع کیا تھا۔ مالک رام صاحب نے لکھا ہے کہ مولوی عبدالحق نے یہ مضمون اپنے ادارتی نوٹ کے ساتھ چھاپا تھا۔ اس وقت مختار صاحب بہت کم عمر تھے۔ انجمن کی روداد میں اس اجلاس کی جو تصویر انجمن کے مندوبین کی چھپی ہے (اسے راقم الحروف نے یکم دسمبر ۱۹۸۴ء کے ''ہماری زبان'' میں دوبارہ شائع کر دیا ہے) دیکھنے سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان بھر سے آئے ہوئے انجمن کے ڈیلی گیٹس میں مختار صاحب سب سے کم عمر ڈیلی گیٹ ہیں۔ انجمن کی ہر شاخ سے دو دو ڈیلی گیٹ مدعو تھے۔ شاخ بہار سے (قاضی عبدالودود صاحب اس زمانے میں علیل تھے اور اِنکی سینی ٹوریم میں داخل تھے) شرف عالم آرزو جلیلی اور مختار الدین احمد آرزو صاحب آئے تھے۔ وہ بہار کی شاخ کے فعّال کا رکن رہے ہوں گے اس سے انجمن ترقی اردو سے ان کے قدیم رابطے کا پتا چلتا ہے۔ مولوی عبدالحق کا سہ ماہی ''اردو'' میں اشاعت کے لیے یہ مقالہ منظور کرنا اور اس پر ادارتی نوٹ لکھنا اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ مختار صاحب کو بہت کم عمری ہی میں تحقیقی مضمون لکھنے کا بھر پور سلیقہ آ گیا تھا، اور مولوی عبدالحق جیسے بزرگ محقق ان کی تحریریں پسند کرنے لگے تھے۔

Marfat.com

مختار صاحب کی ابتدائی تعلیم تو عربی اور فارسی میں ہوئی تھی۔لیکن انھیں کم عمری ہی سے اردو ادب سے دلچسپی پیدا ہوگئی تھی ۔عربی، فارسی اور اردو کے کلاسیکی اور عصری ادب کے ساتھ انھوں نے غالب کا خاص طور سے مطالعہ کیا۔اپنی ادبی زندگی کی آغاز میں انھوں نے غالب پر دو ایسے اہم مضامین لکھے تھے جو کوئی ماہرِ غالبیات ہی لکھ سکتا تھا۔ غالب پر ان کا پہلا مقالہ تھا' غالب کی تاریخ گوئی' اور دوسرا'غالب کا کچھ نایاب کلام'۔ یہ دونوں مضامین ادبی دنیالاہور، میں آج سے کوئی ۶۰ سال پہلے ۱۹۴۰ اور ۱۹۴۱میں شائع ہوئے ۔اس رسالے کے مدیر ان اردو کے مشہور ادیب صلاح الدین احمد اور مشہور شاعر میرا جی تھے ۔ان دونوں سے اِن کے تعلقات اسی زمانے میں پیدا ہوئے ۔ان کے بارے میں صلاح الدین احمد مرحوم کی ایک تحریر میری نظر سے گزری ہے۔

غالب پر اعلیٰ تحقیق کرنے والوں کے نام انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں ۔غالب پر پہلی کتاب مولانا الطاف حسین حالی کی 'یادگارِ غالب' ہے ۔یہ کتاب لکھتے ہوئے حالی کا مقصد غالب پر تحقیق نہیں بلکہ ایک ایسی سوانح عمری لکھنی تھی، جس میں غالب کے حالات زندگی، ان کی اردو اور فارسی نثر و نظم کا تنقیدی تعارف ہو۔اپنے اس مقصد میں وہ بہت حد تک کامیاب ہوئے ۔لیکن حالی کے ایسے وسائل تھے کہ اگر غالب پر باقاعدہ تحقیق کرتے تو غالب کے سوانح کے بارے میں بہت سے سوال تشنۂ جواب نہ رہ جاتے اور حالی سے غالب کے واقعات بیان کرنے میں کچھ مقامات پر سہو نہ ہوجاتا ۔حالی کے بعد غالب پر عرصے تک تنقیدی کتابیں اور مضامین لکھے جاتے رہے لیکن ان کی سوانح حیات اور ان کے آثار و جستجو کے سلسلے میں محققین کا کام بعد کو شروع ہوا۔جن محققین نے اس میدان میں ممتاز مقام حاصل کیا ان میں غلام رسول مہر ،شیخ محمد اکرام، ڈاکٹر عبد الستار صدیقی، مہیش پرشاد، امتیاز علی عرشی ،مسعود حسن رضوی، مالک رام ، پروفیسر مختار الدین اور پروفیسر نذیر احمد کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔مختار صاحب نے غالب کی شخصیت ، ان کے معاصرین اور ان کے تلامذہ پر بڑی تعداد میں اہم مضامین لکھے اور ان کی متعدد نادر تحریروں اور غیر مطبوعہ مکتوبات کا انکشاف کیا اور انہیں ادبی دنیا کے سامنے پیش کیا۔تمام مضامین کی تفصیل بیان کرنا ممکن نہیں البتہ ان کے چند مضامین کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے جو غالبیات کے نقطۂ نظر سے غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں۔

Marfat.com

ڈاکٹر مختار الدین احمد ہمیشہ غالبؔ کی زندگی اور فن کے بارے میں نئے مواد کی تلاش میں رہتے ہیں ۔ اس سلسلے میں ان کا ایک مضمون ''غالبؔ کا ایک غیر مطبوعہ فارسی مکتوب'' بہت اہم ہے ۔ انھیں ایک فارسی مخطوطہ ''برہان اودھ'' میں دو فارسی خطوط ملے تھے۔ ایک خط ابن حسن خاں کا غالبؔ کے نام اور دوسرا غالبؔ کا خط جو سید ابن حسن کے خط کے جواب میں ہے ۔ ابنِ حسن نے اپنے خط میں غالبؔ سے درخواست کی ہے کہ وہ انھیں اپنا شاگرد بنالیں۔ غالبؔ نے ابن حسن کے خط کے جواب میں یہ درخواست قبول کرتے ہوئے انھیں اپنا شاگرد بنالیا ۔ غالبؔ کے سوانح پر کام کرنے والے محققین نے غالبؔ کے دہلی سے کلکتہ کے سفر پر خاصی تحقیق کی ہے اور بہت کچھ لکھا ہے ۔ لیکن کوئی بھی محقق یہ ثابت نہیں کرسکا کہ غالبؔ سفر کلکتہ کے دوران لکھنؤ کب پہنچے اور انھوں نے کتنے دن تک وہاں قیام کیا۔ مختار الدین صاحب کے دریافت کیے ہوئے فارسی خط سے پہلی مرتبہ بعض حقائق پر روشنی پڑتی ہے اور ثابت ہوتا ہے کہ غالبؔ ۱۲۴۲ھ کے لگ بھگ لکھنؤ پہنچے اور پانچ مہینے تک وہ لکھنؤ میں مقیم رہے ۔ اس مضمون میں پہلی مرتبہ غالبؔ کے ایک نئے شاگرد ابن حسن خاں کا تعارف کرایا گیا ہے اور ان کے اور غالبؔ کے غیر مطبوعہ خطوط شائع کیے گئے ہیں ۔

مختار صاحب نے ایک مضمون غالبؔ کے معاصر شمس العلماء ڈاکٹر ضیاء الدین خاں دہلوی ر دلی کالج میگزین (دہلی) کے لیے لکھا تھا جو ۱۹۵۰ میں شائع ہوا تھا، یہ مضمون بعد کو ترمیم واضافہ ونظر ثانی کے بعد نقوش لاہور (جنوری ۱۹۶۳) میں شائع ہوا۔ مختار صاحب کا ایک اہم مضمون 'غالبؔ کے خطوط ایک قدیم مجموعے میں' آج کل ، مارچ ۱۹۶۷ میں شائع ہوا تھا ۔ برطانوی حکومت کے کسی افسر کی ہدایت پر شمس العلماء مولوی ضیاء الدین خاں نے 'انشائے اردو' کے نام سے برطانوی فوج کی تعلیم کے لیے ایک نصابی کتاب تیار کی تھی جس کے دو حصے تھے ۔ پہلا حصہ ۶۰ صفحات پر مشتمل تھا۔ اس حصے میں ایسی تحریریں شامل تھیں جو افسرانِ فوج کے اعلا درجے کے امتحان کے لیے تھا۔ مولوی ضیاء الدین خاں نے غالبؔ سے اُن کی ایسی تحریروں کی فرمایش کی جنھیں اس کتاب میں شامل کیا جاسکے ۔ غالبؔ نے اپنے دو دیباچے، بارہ خطوط ، دو نظمیں ، ایک لطیفہ اور اکتیس اشعار مرتب کرکے مولوی ضیاء الدین صاحب کو بھیج دیے ۔ مختار صاحب نے اسی کمیاب انتخاب کا جو دہلی میں غالب کی زندگی میں ۱۸۶۶ء میں چھپا تھا تعارف کرایا ہے اور غالبؔ کی کمیاب تحریریں پیش کی ہیں یہ کتاب مختار صاحب کے مضمون کی اشاعت کے کوئی تیس

Marfat.com

سال بعداب اکتوبر ۱۹۹۴ء میں مکتبہ جامعہ لمیٹڈ سے شائع ہوئی۔

احوال غالب (دہلی ۱۹۵۳ء) میں مختار صاحب کے دو مفصل اور بہت اہم مضمون شائع ہوئے ہیں 'سرّ غالب در حدیث دیگراں' اس میں ریاض الدین امجد اکبر آبادی، سید فرزند احمد صفیر بلگرامی، خواجہ عزیز الدین عزیز لکھنوی اور سید غوث علی شاہ قلندر سے غالب کی ملاقاتوں کا حال مستند ترین مصادر کی بنیاد پر لکھا گیا ہے۔ ان کا دوسرے معرکے کا مضمون میرزا غالب کی تصویروں پر ہے جس میں اب تک کی دریافت شدہ غالب کی اور ان کی طرف منسوب تصویروں پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے اور مضمون کے ساتھ ان کی تقریباً ساری تصویریں شائع کی گئی ہیں۔

مختار صاحب غالب کے بارے میں ہر چھوٹی بڑی چیز کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ ان کی ایسی تحریروں کی اہمیت کا اندازہ غالب پر کام کرنے والوں ہی کو ہوسکتا ہے۔ ان کا ایک مقالہ ہے 'کچھ غالب کے بارے میں' (غالب نامہ جولائی ۱۹۸۸ء) یہ مضمون غالبیات میں اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس مضمون میں ڈاکٹر عبد الستار صدیقی، شیخ محمد اکرام، اکبر علی خاں عرشی زادہ اور قاضی عبد الودود کے وہ سات خطوط شامل ہیں جن کا تعلق کسی نہ کسی طرح غالب سے ہے۔ ان خطوط پر مختار صاحب نے محققانہ اور عالمانہ حواشی لکھے ہیں۔

غالب کے شاگرد مرزا ہرگوپال تفتہ کے بارے میں مختار صاحب نے متعدد مضامین لکھے ہیں۔ ''متفرقاتِ تفتہ'' (غالب نامہ جنوری ۱۹۸۴) میں انھوں نے منشی دیانند بھٹناگر کی مرتب کی ہوئی ایک ایسی قلمی بیاض کا تعارف کرایا ہے، جس میں غالب کے نو تلامذہ تفتہ، بے صبر، مجروح مہر، حالی، سرور، یوسف مرزا، رضوان اور سالک کے خطوط شامل ہیں، یہ سب خطوط غالب اور ان کے شاگردوں کے تعلقات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ مختار صاحب نے ایک دوسرے مضمون ''دیوان تفتہ'' میں تفتہ کے ایک فارسی قلمی دیوان کا تعارف کرایا ہے جو ان کے خیال میں شروع سے آخر تک تفتہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ یہ نسخہ پنجاب یونی ورسٹی لائبریری (لاہور) کے ذخیرۂ کیفی میں محفوظ ہے۔ اس دیوان کے بارے میں بہت اہم معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ انھوں نے ایک تیسرے مضمون میں تفتہ کے دیوان دوم کے اس قلمی نسخے کی تفصیل بیان کی ہے جو بقول مالک رام صاحب کے حکیم خلیل الرحمٰن خلیل کی ملکیت تھا مختار صاحب نے اس مضمون میں یہ اطلاع بھی دی ہے

Marfat.com

کہ 'شیخ عصمت اللہ (علیگ) کے ذخیرے میں مرزا تفتہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا وہ فارسی خط محفوظ تھا جو انھوں نے اپنے والد موتی لال بھٹنا گر کو لکھا تھا۔ مختار صاحب کی اطلاع کے مطابق شیخ عصمت اللہ (علیگ) کے پاس تفتہ کی وہ نادر تصویر بھی تھی جو کیمرے سے کھینچی گئی تھی۔ شیخ صاحب، تفتہ کے ہم وطن تھے، ریٹائرمنٹ کے بعد علی گڑھ میں انھوں نے سکونت اختیار کر لی تھی۔ پانچ سات سال پہلے وہیں ان کا انتقال ہوا۔

تفتہ پر ان کا ایک اور مضمون ہے ''تفتہ کی تضمینِ گلستاں'' (غالب نامہ، جنوری ۱۹۹۰)۔ تفتہ کے چہیتے بیٹے پتمبر سنگھ کی ۱۲۷۱ھ میں وفات ہوگئی تھی جس کا تفتہ کو بہت صدمہ تھا۔ غالب نے اپنے خطوط میں پتمبر کی وفات کا ذکر کیا ہے۔ تفتہ نے اسی بیٹے کی یاد میں شیخ سعدی کی 'گلستان' کی تضمین کی اور اسے پتمبر کے نام سے منسوب کیا۔ مختار صاحب نے ''تضمینِ گلستان'' کے دو قدیم اڈیشنوں کا بہت جامع تعارف کرایا ہے۔ تفتہ کے دو اوین پر انھوں نے ایک مضمون ایوان غالب دہلی کے تفتہ سیمنار ۲۰۰۴ کے لیے لکھا ہے جو 'غالب نامہ' میں شائع ہونے والا ہے۔

غالب کے اور ایک شاگرد میاں داد خاں سیاح پر ان کا ایک مفصل مضمون ہے ''کچھ سیاح، شاگردِ غالب کے بارے میں'' (غالب نامہ، جنوری ۱۹۸۹)۔ اس مضمون میں بہت ایسے حقائق اور معلومات پیش کیے گئے ہیں جو اس سے پہلے ہماری نظر سے نہیں گزرے تھے۔ یہ مضمون بھی انھوں نے حسبِ عادت بڑی محنت تلاش اور جستجو سے لکھا ہے۔

غالب کے عزیز دوست منشی صدرالدین آزردہ تھے۔ یہ اپنے عہد کے فارسی اور عربی کے بہت بڑے عالم تھے، اور اردو کے نغز گو شاعر۔ وہ غالب کے عزیز ترین دوستوں میں تھے۔ مختار صاحب کا ایک مقالہ ہے ''مفتی صدر الدین آزردہ کی کچھ نایاب و کمیاب تحریریں'' (غالب نامہ جولائی ۱۹۸۱ء)۔ یہ مقالہ ۲۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں آزردہ کی تیرہ عربی و فارسی کی کمیاب کتابوں کا تعارف کرایا گیا ہے اور مختلف مصادر سے ان کے کچھ اردو اشعار پیش کیے گئے ہیں۔ اسے پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مضمون کتنی محنت، تلاش اور جستجو سے لکھا گیا ہے۔ ایسا مقالہ لکھنے کے لیے گہری بصیرت درکار ہے۔ مختار صاحب نے مفتی صاحب کا کمیاب تذکرۂ شعرائے اردو جو کیمبرج کے ایک کالج کے کتب خانے میں انھیں ملا تھا، بہت اہتمام سے مرتب کر کے شائع کر دیا ہے۔ اسے مالک رام صاحب

Marfat.com

نے اپنے رسالہ تحریر (دہلی) میں شائع کیا تھا، بعد کو مشفق خواجہ صاحب نے اسکا دوسرا اڈیشن کتابی شکل میں انجمن ترقی اردو پاکستان سے شائع کردیا ہے۔ اس کے حواشی بیحد قیمتی ہیں۔ انھوں نے آزردہ کے فارسی واردو خطوط مرتب بھی مرتب ہیں لیکن ابھی شائع نہیں کیا۔

مختار صاحب کا ایک جامع و مانع مقالہ غالب کے ایک دوسرے معاصر مفتی میر محمد عباس پر ہے۔ (آج کل مئی ۱۹۵۱) غالبؔ کے شاگرد سید غلام حسنین قدرؔ بلگرامی لکھنؤ میں تھے۔ غالبؔ نے ایک خط میں انھیں لکھا کہ آپ مطبع نول کشور سے، قاطع برہان کا ایک نسخہ لے کر میرے دوست مفتی میر محمد عباس کو پہنچا دیں۔ مختار صاحب نے اس مضمون میں ان دونوں کے باہمی تعلقات کا ذکر کیا ہے اور مفتی میر محمد عباس کے نام غالبؔ کے دو غیر مدوّن خطوط پہلی مرتبہ پیش کیے ہیں جو غالب کے کسی مجموعۂ خطوط میں شامل نہیں۔

مختار صاحب کا ایک مقالہ غالب کے شاگرد مولانا الطاف حسین حالی پر قابل مطالعہ ہے۔ (غالب نامہ جولائی ۲۰۰۲)۔ یہ حالیؔ کی چند کمیاب تصنیفات کے عنوان سے شائع ہوا۔ اس میں حالیؔ کی کچھ ایسی تصنیفات کا تعارف کرایا گیا ہے جو اب نایاب ہیں۔: مولود شریف، مضامینِ حالی، (جس میں حالی کے ۳۳ مضامین شامل ہیں)، مجالس النساء اور حقوق اولاد۔

غالب کے دوست خواجہ غلام غوث بے خبر پر مختار صاحب کے تین مضمون دیکھنے میں آئے۔ ''فغان بے خبر'' میں غالب کا ذکر (آج کل فروری ۱۹۵۸)، خواجہ غلام غوث بے خبر (غالب نامہ جولائی ۲۰۰ء) اور خواجہ غلام غوث بے خبر اور مرزا غالب (غالب اور آگرہ، دہلی ۲۰۰۳)۔

انھوں نے غالب کے معاصر نواب امیر حسن خاں بسملؔ کاکوروی پر شاید پہلی مرتبہ ایک سیر حاصل مضمون شائع کیا ہے۔ بسملؔ نے غالب کی کتاب ''پنج آہنگ'' کے جواب میں ''پنج گلبن'' لکھی تھی (افسوس اس کا کوئی نسخہ اب تک دریافت نہیں ہوا ہے) مختار صاحب نے امیر حسن خاں بسملؔ کے فارسی دیوان کے اس حصے کا جو کتب خانہ کاکوری میں محفوظ ہے، اپنے مضمون کے ساتھ عکس شائع کردیا ہے۔ اگر کبھی بسمل کے دیوان فارسی کا کوئی مکمل نسخہ دستیاب ہوا تو اسے مرتب کرنے کے لیے دیوان کے اس مطبوعہ حصے کا مطالعہ مفید ہوگا۔

''ہماری زبان'' کے ۲۲ مئی اور یکم جون ۱۹۵۷ء کے شماروں میں مختار صاحب کا

Marfat.com

دوقسطوں میں ایک مقالہ 'اشعارِ ذوق' شائع ہوا ہے۔ اس مقالے میں اُنھوں نے میر محمد خاں بہادر سرور کے تذکرے 'عمدۂ منتخبہ، خوب چند ذکا کے تذکرے ''عیار الشعراء' اور مفتی صدرالدین آزردہ کے تذکرے میں شامل محمد ابراہیم ذوق کے وہ اشعار پیش کیے ہیں جو اُن کے دیوان میں شامل نہیں ہیں۔ ان اشعار کی کل تعداد تینتیس ہے۔

''ہماری زبان'' کے ۱۵ر جون اور یکم جولائی ۱۹۵۷ء کے شماروں میں غالبؔ کے ایک شاگرد بالمکند بے صبر پر ان کا ایک مضمون دوقسطوں میں شائع ہوا ہے۔ پہلی قسط کا عنوان ہے ''درمدحِ غالب گوید۔'' اس مضمون میں بے صبر کے بہت مختصر سوانح بیان کرکے بے صبر کی دو مثنویوں کا ذکر کیا ہے 'لختِ جگر' اور مثنوی 'لالۂ پر داغ'۔ انھوں نے نمونے کے طور پر 'مثنوی لختِ جگر' کے کچھ اشعار بھی نقل کیے ہیں جس کا ایک قلمی نسخہ ان کے ذخیرۂ کتب میں محفوظ ہے۔ دوسری قسط میں بے صبر سے غالبؔ کے تعلقات پر روشنی ڈال کر مثنوی لختِ جگر اور منشی دیبی پرشاد بشاش کے تذکرے سے بے صبر کی تین غزلیں شائع کی ہیں۔

ویریندر پرشاد سکسینہ بدایونی نے 'ہماری زبان' کے ۲۲ر اپریل ۱۹۶۷ء کے شمارے میں مرزا رجب علی بیگ سرور کی نثری کتاب میں شامل غالبؔ کی لکھی ہوئی ایک تقریظ کا یہ کہہ کر تعارف کرایا ہے کہ یہ غالب کے کسی نثری مجموعے میں شامل نہیں ہے۔ ۱۵ر مئی ۱۹۶۷ء کی 'ہماری زبان' کے شمارے میں مختار صاحب نے ایک مراسلے کے ذریعے بتایا کہ ویریندر صاحب سے تسامح ہوا ہے یہ تقریظ اردوئے معلّٰی حصّہ دوم میں شامل ہے۔

پاکستان کی ایک اسکالر شمیلہ خاتون نے 'ڈاکٹر مختار الدین احمد' بطور غالب شناس' کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھا ہے۔ جس کے نگراں تھے مشہور ماہرِ غالبیات سید پروفیسر معین الرحمٰن۔ اس مقالے پر پنجاب یونیورسٹی نے شمیلہ صاحبہ کو ام اے کی ڈگری تفویض کی ہے۔ یہ مقالہ ابھی شائع نہیں ہوا ہے۔

غالب پر مختار صاحب کچھ اہم مضامین کا ذکر کیا جاچکا ہے۔ ڈاکٹر عطا خورشید جناب مہر الٰہی ندیم نے ''مختار نامہ'' کے عنوان سے پروفیسر مختار الدین احمد کے مقالات اور تصنیفات کا موضوعاتی اور وضاحتی اشاریہ کتابی صورت میں مرتب کرکے شائع کردیا ہے۔ اس اشاریے سے مختار صاحب کے ان مضامین کی فہرست دی جارہی ہے جو انھوں نے

Marfat.com

غالب اور قاضی
غالب اور مفتی
غالب سے ایک
غالب کا ایک غ
غالب کا ایک غ
غالب کا ایک م
غالب کا قدیم
غالب کی ایک
غالب کی ایک
غالب کی ایک
غالب کی ایک
"غالب کی بعض
کا تفصیلی تعارف

Marfat.com

غالب کی عظمت	مشمولہ 'غالب کی عظمت'، رام پور ۱۹۶۵
غالب کے آٹھ خط	''نقوش'' لاہور، مکاتیب نمبر، حصہ اول ۱۹۵۷
غالب کے ایک شعر پر بحث	''ہماری زبان'' دہلی، ۱۵/ اکتوبر ۱۹۸۴ء
غالب کے تین غیر مطبوعہ خطوط	ماہ نامہ ''آجکل'' دہلی، مئی ۱۹۵۲ء
غالب کے چند غیر مطبوعہ خطوط	ماہ نامہ ''آجکل'' دہلی، مئی ۱۹۵۲ء
غالب کے چند غیر مطبوعہ اشعار	ماہ نامہ ''ہمایوں'' لاہور جنوری ۱۹۴۱ء
غالب کے چند نایاب خطوط (بنام صفیر بلگرامی)	ماہ نامہ ''نگار'' لکھنؤ، جولائی ۱۹۵۲ء
غالب کے خطوط ایک قدیم مجموعے میں	ماہ نامہ ''آجکل'' دہلی، مارچ ۱۹۶۷
فغانِ بے خبر میں غالبؔ کا ذکر	ماہ نامہ ''آج کل'' دہلی، فروری ۱۹۵۸
کچھ سیاحؔ شاگردِ غالبؔ کے بارے میں	''غالب نامہ''، دہلی، جنوری ۱۹۸۹ء
کچھ غالب کے بارے میں	'غالب نامہ' دہلی، جولائی ۱۹۸۸ء
کچھ منشی ہرگوپال تفتہ کے بارے میں	'غالب نامہ' دہلی، جنوری ۱۹۸۴ء
مرزا غالب کی تاریخ گوئی	'ادبی دنیا'، لاہور، مارچ ۱۹۴۱ء

غالب کے شاگردوں، معاصروں اور غالب سے متعلق مختلف موضوعات پر مختار صاحب کے مضامین کی تعداد پچاس سے اوپر ہوگی۔ اگر کوئی اسکالر ان کے تمام مضامین کو تلاش کر کے مرتب کر دے اور کوئی اردو کا ادارہ کتابی صورت میں شائع کر دے تو غالبیات میں یہ بہت اہم اضافہ ہوگا۔

☆☆☆

Marfat.com

گراں قدر علمی و تحقیقی کام انجام دیتے رہے ہیں اور دے رہے ہیں ۔ بڑے صاحب علم ہیں نہ صرف برصغیر ہند کے ارباب علم و دانش بلکہ عرب ممالک کی علمی شخصیات اور یورپ کے علمائے مستشرقین سے ان کے بڑے گہرے علمی روابط ہیں۔ آرزو صاحب کے خطوط، علمی اور معلومات افزا ہوتے ہیں ۔ روزانہ اوسطا تین چار خطوط لکھتے ہیں ۔ ان کا کتب خانہ بڑا وسیع ہے ۔ علمی رسالے اور جرائد بڑے سلیقے سے رکھتے ہیں ۔ مجھے اپنے پرانے مضامین کی جب کبھی ضرورت پڑتی ہے تو انہیں سے حاصل کرتا ہوں ۔ میرے مضامین خود میرے پاس نہیں رہتے لیکن ان کے پاس محفوظ رہتے ہیں۔ میں خط لکھنے میں سست واقع ہوا ہوں، گاہے گاہے ارباب علم کو میرے علمی مشاغل اور خیریت سے وہی باخبر کرتے رہتے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ نے آرزو صاحب کو علم و فضل کے ساتھ بڑی خوبیوں سے نوازا ہے ۔ بڑے مخلص اور ملنسار آدمی ہیں ۔ ان کے اثر و رسوخ کا دایرہ بڑا وسیع ہے اگر کوئی کام جوان کے شایان شان ہو، ان کے حوالہ کر دیا جائے تو اسے بڑی ذمہ داری کے ساتھ انجام دینے کی کوشش کرتے ہیں ۔ بڑے سلیقہ مند آدمی ہیں ۔ اپنے معمولات کے سخت پابند ہیں۔ ان کے ہر کام میں نظم و ضبط پایا جاتا ہے۔''

اس طرح پروفیسر نذیر احمد صاحب نے آرزو صاحب کی شخصیت اور ان کے گوناگوں اوصاف و کمالات سے غائبانہ مجھے واقف کرادیا تھا۔ چنانچہ اس دن ان سے مل کر بڑی مسرت ہوئی۔

اس وقت چوکہ ''غنیۃ الطالبین'' کے بارے میں گفتگو ہورہی تھی اور میری یاد داشت کی کتاب میرے ساتھ تھی اس لیے میں اسی موضوع پر آ گیا اور اس بات کے ثبوت میں کہ ''غنیۃ الطالبین'' شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی تصنیف نہیں ہے۔ میں نے شرح عقائد نسفی کی شرح نبراس (ص ۴۴۵) کی یہ عبارت پیش کی۔

"واما حدیث جابر رأیت ربی مشاهدة لاشک فیه، ففی ثبوته نظر ولا یغرنک وقوعه فی غنیة الطالبین المنسوبة الی الغوث الاعظم عبد القادر جیلانی قدس سره العزیز فالنسبة غیر صحیحة والاحادیث الموضوعة فیها وافرة."

(جہاں تک حضرت جابر کی اس روایت کا تعلق ہے کہ '' میں نے بلاشبہ اپنے

Marfat.com

رب کا مشاہدہ کیا ہے'' تو اس کی صحت کا ثبوت محل نظر ہے ۔ غنیۃ الطالبین جس کی نسبت غوث الاعظم حضرت شیخ عبد القادر جیلانی قدس سرہ کی طرف کی گئی ہے تو اس میں اس حدیث کے مذکور ہونے سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ وہ حدیث صحیح ہے کیونکہ غنیۃ الطالبین کی تصنیف کی نسبت حضرت غوث الاعظم کی طرف کرنا درست نہیں چونکہ اس میں بہت سی موضوع احادیث موجود ہیں)۔

مزید ثبوت کے لیے میں نے فارسی کی یہ عبارت:

''ہرگز ثابت نہ شدہ کہ ایں از تصنیف آن جناب است گرچہ انتساب بہ آن حضرت شہرت دادر'' پیش کی جسے ''نبراس'' کے فاضل محشّی نے شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے حوالے سے نقل کر کے یہ ثبوت فراہم کیا ہے کہ ''غنیۃ الطالبین'' شیخ عبدالقادر کی تصنیف نہیں ہے۔

یہ سب کچھ سننے کے بعد آرزو صاحب نے مجھ سے دریافت فرمایا کہ یہ فارسی عبارت جو آپ نے پیش کی یہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی کس کتاب سے ماخوذ ہے؟ میں نے عرض کیا کہ محشّی اس سلسلے میں خاموش ہے ۔ البتہ میرے ایک فاضل دوست محمد مصطفیٰ مفتاحی صاحب نے جو مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کے ارشد تلامذہ میں ہیں، مولانا اعظمیؒ کے حوالے سے بتایا کہ ایک بار مولانا اعظمی نے فرمایا تھا کہ اخبار الاخیار میں حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے لکھا ہے کہ غنیۃ الطالبین حضرت غوث الاعظم کی تصنیف نہیں ہے۔ اس سے ہم نے یہی نتیجہ نکالا ہے کہ ''نبراس'' کے محشی کی نقل کردہ عبارت ''اخبار الاخیار'' ہی سے ماخوذ ہے ۔ مولانا مفتاحی صاحب نے مزید بتایا کہ مولانا اعظمی نے یہ بھی فرمایا تھا کہ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے ''فیض الباری'' میں مرتضی زبیدی بلگرامی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ''غنیۃ الطالبین'' میں الحاقی مضامین ہیں۔

آرزو صاحب نے فرمایا کہ اخبار الاخیار کے مطالعہ کیے بغیر حتمی طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ 'نبراس' کے فاضل محشی کی نقل کردہ عبارت ''اخبار الاخیار'' سے ماخوذ ہے ۔ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں ''اخبار الاخیار'' کا قدیم نسخہ ہے، پٹنہ جا کر اس کا مطالعہ کر کے کوئی حتمی رائے قائم کیجئے ۔ ویسے میرا اپنا خیال ہے کہ ''غنیۃ الطالبین'' شیخ عبدالقادر جیلانیؒ ہی کی تصنیف ہے ۔ جہاں تک اس میں کچھ الحاقی مضامین ہونے کی بات ہے تو اس سے انکار

Marfat.com

نہیں کیا جاسکتا۔ جہاں تک میرا حافظہ کام کرتا ہے ''اخبار الاخیار میں اس کا کوئی ذکر نہیں۔

آرزو صاحب کی ترغیب پر اس ناچیز نے پٹنہ جاکر خدا بخش لائبریری میں ''اخبار الاخیار'' کا مطالعہ کیا۔ اس میں شیخ عبد القادر جیلانیؒ کے احوال و آثار میں سرے سے اس کا کوئی ذکر ہی نہیں ہے کہ ''غنیۃ الطالبین'' حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ کی تصنیف ہے یا کسی اور کی۔ پھر میں نے رسالۂ معارف (اعظم گڑھ) سے استفسار کیا۔ معارف دسمبر ۲۰۰۰ء میں اس کا جواب شائع ہوا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ''غنیۃ الطالبین''، شیخ عبد القادر جیلانیؒ ہی کی تصنیف ہے، البتہ اس میں الحاقی مضامین بھی ہیں۔

اخبار الاخیار کے مطالعہ اور معارف میں استفسار کا جواب پڑھ کر آرزو صاحب کی وسعتِ نظر کا نقش دل پر مرتسم ہوگیا۔ اب ہماری خط و کتابت شروع ہوئی۔

میرے نام آرزو صاحب کا پہلا التفات آمیز مکتوب ملاحظہ ہو:

علی گڑھ۔ ۹۹/۷/۱۸۔

۱۱ ۱/۲ بجے شب

محترمی وارث ریاضی صاحب السلام علیکم

مکرمت نامہ مورخہ ۱۶/ جولائی آج سہ پہر کو ملا۔ یاد فرمائی کے لیے ممنون ہوا میں نے ۲۱ مئی کو آپ کا بہت انتظار کیا آپ کسی وجہ سے نہ آسکے۔ دوسری صبح آپ کو تلاش کرتا ہوا آپ کی قیامگاہ کی طرف گیا لیکن مکان کا پتا نہ چلا سکا اور مایوس ہوکر واپس آیا۔

آپ سے مل کر خوش ہوا اب آپ مجھے چند سطروں میں اپنے مختصر حالات لکھ بھیجیے، آپ کہاں کہاں رہے؟ کیا کرتے رہے؟ تعلیم کہاں حاصل کی؟ اس علم و فضل کے باوجود جو آپ کو حاصل ہے، ایسی جگہ کیوں آپ نے سکونت اختیار کی جس کا بہار میں بھی میں نے کبھی نام نہیں سنا۔ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کا اور میرا اس امر پر اتفاق ہے کہ آپ کو تو علی گڑھ یا ایسی ہی کسی یونیورسٹی یا کسی مرکزی علمی ادارے میں ہونا چاہیے تھا۔ آپ کا تو مولانا احمد رضا خاں فاضلِ بریلویؒ کے اس قطعے پر عمل معلوم ہوتا ہے:

نہ مرا نوش زتحسیں نہ مرا نیش زطعن نہ مرا گوش بہ مدحے نہ مرا ہوش ہجے

Marfat.com

منم و کنج خمولی کہ نہ گنجد دروے جز من و چند کتابے و دوات وقلمے

اگر زحمت نہ ہوتو تو کسی عزیز سے کہیے کہ بہ وقت فرصت آپ کے مضامین کی فہرست مجھے بھیج دیں۔ آپ کے نعتیہ کلام کا مجموعہ شایع ہوا؟ اب آپ کے مضامین کا مجموعہ بھی شایع ہونا چاہیے۔ تاریخ گوئی کے فن سے بھی کچھ دلچسپی ہے آپ کو؟

کیا آپ کسی شاہ اعزّ الدین سے واقف ہیں؟ یہ حضرت منعم پاک قدس سرہ کے مرید تھے۔ ۱۱۹۵ھ کے لگ بھگ عظیم آباد میں تھے۔ بہت اچھے خوش نویس تھے۔ ''الہامات منعمی'' نسخۂ خدابخش کہا جاتا ہے انہیں کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔ ان کی لکھا ہوا کوئی کتاب یا کوئی وصلی، کیا آپ کی نظر سے گزری ہے؟

میرے کام بہت پھیلے ہوئے ہیں۔ بہت سی ذمے داریاں لے رکھی ہیں۔ یقین مانیے ادبی قرضوں میں گردن گردن تک ڈوبا ہوا ہوں۔ ایک ادارے کو ایک کتاب کا مسودہ چھ ماہ پہلے دینا تھا، اب تک نہیں دے سکا ہوں۔ سو ڈیڑھ صفحوں کا ایک فارسی دیوان بارھویں صدی ہجری کے ایک شاعر کا ہے، بہت صاف اور سہل کلام ہے اور نسخہ بہت صاف اور واضح، اس کے شاگرد کے قلم کا لکھا ہوا ہے جو بہت حد تک صحیح ہے۔ جس خوش نویس یا ٹائپسٹ سے نقل کراتا ہوں غلطیوں پر غلطیاں کرتا ہے۔ آپ زحمت فرما کر اگر اسے نقل کر دیں یا کسی شاگرد سے اجرت پر نقل کرا دیں تو بڑا کرم ہو۔ آپ کے لیے ہفتے دو ہفتے کا کام ہے، اگر وقت نکال سکیں۔ اس علمی تعاون کے لیے ممنون ہوں گا۔ واپسی ڈاک سے خط لکھیے یا شب کے ۱۱ بجے کے بعد یا صبح ٹیلیفون کر دیں، میں دیوان کا عکس بھیج دوں گا۔ امید ہے اب آپ بہ ہمہ وجود خیر وعافیت سے ہوں گے۔ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کا امریکہ سے خط آیا ہے۔ خیریت سے ہیں۔ والسلام

مختار الدین احمد

اس مکتوب سے جہاں آرزو صاحب کی ذرّہ نوازی، اس ناچیز سے ان کے حسن

Marfat.com

ظن اور ان کے علمی مشاغل کا سراغ ملتا ہے وہیں ان کی انسان دوستی ، حسن سلوک اور مخلصانہ تعاون کے جذبات بھی ابھر کر سامنے آتے ہیں ۔

برصغیر ہند میں بہت سے اصحاب علم اور دانش ور موجود ہیں جو اپنے اپنے دائرے میں علم وادب کی خدمات انجام دینے میں مصروف ہیں ان میں آرزو صاحب کا یہ امتیاز ہے کہ انہوں نے اپنے سرچشمۂ علم سے جہاں بہت سے تشنگان علم وادب کو سیراب کیا اور کوئی چالیس بیالیس اصحاب نے ان کی نگرانی میں پی ایچ ڈی اور ام فل وغیرہ کے تحقیقی مقالات لکھ کر اعلیٰ ڈگریاں حاصل کیں، وہیں انہوں نے اپنے علمی وادبی خطوط کے ذریعے نہ جانے کتنے شائقین علم وادب کی علمی وفکری رہنمائی کی ہے ۔

ماہنامہ انشاء (کلکتہ) کے جولائی اگست ۲۰۰۰ء کے شمارے میں نصر ملک (ڈنمارک) نے اپنے ایک مکتوب بہ نام (مدیر انشا جناب ف ، اس ، اعجاز) میں یہ تاثر دینے کی کوشش کی تھی کہ علامہ اقبال ، احمدی (قادیانی) تھے ۔ان کی دلیل یہ تھی کہ ہزار مخالفت کے باوجود علامہ اقبال نے اپنے بیٹے جاوید اقبال اور اپنی منیرہ کی نگہ داشت کے لیے اپنے خاندان کے سبھی اطاعت گزاروں پر اپنے ایک احمدی رشتے دار (اعجاز احمد) کو ترجیح دی اور اپنے ایک مکتوب بہ نام سر راس مسعود میں اس احمدی رشتے دار کو باعمل اور پابند قرآن مسلمان قرار دیا۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ علامہ اقبال، احمدیت سے بے زار نہیں تھے بلکہ احمدیت سے ان کو انس وربط اور تعلق تھا۔

نصر ملک کے مکتوب کے حوالے سے میں نے ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب کو خط لکھا اور معلوم کرنا چاہا کہ کیا واقعی علامہ اقبال نے کسی مکتوب میں اپنے احمدی رشتے دار (اعجاز) کو باعمل ، پابند قرآن مسلمان قرار دیا ہے؟ آرزو صاحب نے جواب فوراً تحریر فرمایا:

علی گڑھ ۔۱۲ر جنوری ۲۰۰۱ء

مکرمی ومحترمی السلام علیکم

گرامی نامہ مورخہ ۹ رجنوری کل ۱۱ رکو موصول ہوا۔ خیر و عافیت جان کر خوشی ہوئی ۔ آپ نے سر راس مسعود کے نام اقبال کے جس خط کا ذکر کیا ہے وہ ۱۰ر جون ۱۹۳۷ء کا لکھا ہوا ہے ۔ یہ شیخ اعجاز احمد ، اقبال کے بھتیجے کے بارے میں ہے ۔اس میں انہوں نے اپنے رشتہ دار کو "باعمل اور

Marfat.com

پابند قرآن مسلمان'' قرار نہیں دیا ہے، جیسا کہ آپ نے لکھا ہے۔ اقبال کے الفاظ یہ ہیں۔

''شیخ اعجاز احمد میرا بڑا بھتیجا ہے، نہایت صالح آدمی ہے، لیکن افسوس کہ دینی عقائد کی رو سے قادیانی ہے۔ تم کو معلوم ہے کہ قادیانیوں کے عقیدے کے مطابق تمام مسلمان کافر ہیں، اس واسطے یہ امر شرعاً مشتبہ ہے کہ آیا ایسا عقیدہ رکھنے والا آدمی مسلمان بچوں کا (Guardian) ہو سکتا ہے یا نہیں .... میں چاہتا ہوں اس کی جگہ تم کو Guardian مقرر کردوں۔ مجھے امید ہے کہ تمہیں اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔

(کلیات مکاتیب اقبال ۴/ ۷۸۴، مرتبہ سید مظفر حسن برنی)

جاوید اقبال اور منیرہ کے چار گارجینوں میں بقیہ تین یہ تھے: شیخ طاہر الدین اقبال کے کلرک، چودھری محمد حسین، قدیم دوست اور نہایت مخلص مسلمان، عبدالغنی مرحوم کی جگہ خان صاحب میاں امیر الدین سب رجسٹرار لاہور۔ (انہی نے وصیت نامے کی رجسٹری کی تھی اور یہ دستاویز انہیں کی تحریر میں محفوظ ہے۔ انہی کے بیٹے میاں صلاح الدین سے منیر بانو کی شادی ۱۹۴۸ میں ہوئی)۔

جواہر لال نہرو کے نام جس انگریزی خط کا آپ نے ذکر کیا ہے اس کا اردو ترجمہ اسی جلد کے صفحہ ۳۳۰ پر موجود ہے۔ ترجمہ یہ ہے ''میرا ذہن اس بارے میں ہر شبہے سے پاک ہے کہ احمدی اسلام اور ہندوستان دونوں کے غدار ہیں'' آپ نے اس مکتوب کی تاریخ ۲۱/ جنوری لکھی ہے، کلیات میں ۲۱/ جون درج ہے۔ اقبال کا یہ خط نہرو کے مجموعۂ مکاتیب (A Bunch of Old Lettrs) صفحہ ۲۸۲ میں پہلی مرتبہ شائع ہوا ہے۔ اقبال کا مضمون ''اسلام اور احمدیت'' جنوری ۱۹۳۶ء میں لکھا گیا، اس کا متن ''حرف اقبال'' ص ۱۲۹۔ ۱۶۱ میں درج ہے۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب کے ایک نوٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ نعیم آسی

Marfat.com

صاحب نے ایک کتاب ''اقبال اور قادیان'' لکھی ہے ۔ یہ پٹنہ میں مل جائے تو اس کا مطالعہ شائد آپ کے لیے مفید ہو۔

مسودے کی نقل ہوجائے تو ایک نظر اس پر بھی ڈال لیجئے گا ، اشعار کا قائل معلوم ہوسکے تو اچھا ہے ۔امید (ہے) آپ بخیر ہوں گے

والسلام

مختار الدین احمد

ڈاکٹر مختار الدین آرزو کا یہ مکتوب پڑھ کر یہ داعیہ پیدا ہو کہ کہ احمدی چوں کہ جھوٹ بولنے میں بڑے جری اور بے باک ہوتے ہیں ، اس لیے ''اقبال اور احمدیت'' پر ایک مضمون لکھ کر یہ ثابت کرنا چاہیے کہ اقبال (معاذ اللہ) احمدی نہیں تھے۔ چنانچہ میں نے اس موضوع پر ایک مضمون لکھ کر اسے ماہنامہ انشاء کلکتہ (جنوری فروری ۲۰۰۳) میں شائع کرادیا اور پھر اسی مضمون کو تفصیل سے لکھ کر معارف کو روانہ کردیا۔ یہ مضمون معارف اکتوبر ۲۰۰۲ء کے شمارے میں شایع ہونے والا ہے ۔ اگر آرزو صاحب کا تعاون نہیں ملتا تو شاید یہ مضمون میں نہیں لکھ سکتا تھا۔ میں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ ''صاحب علم'' وہ ہے جس کی علمی صلاحیتوں کا اہل علم برملا اعتراف کرتے ہوں، علمی مسایل میں اس سے رجوع کرتے ہوں اور ممتاز علماء اور دانش وروں سے اس کے علمی روابط ہوں ۔ آرزو صاحب کی شخصیت اس کسوٹی پر پوری طرح اترتی ہے ۔ آرزو صاحب ان خوش نصیب اصحاب علم وفضل میں سے ہیں جن کی صلاحیتوں کا اعتراف علمی حلقوں میں کھلے دل سے کیا گیا ہے ۔ ان میں برصغیر ہند کے اہل علم ، عرب کے ممتاز علماء اور دانش ور اور یورپ کے علماے مستشرقین ہیں جن سے آرزو صاحب کے گہرے علمی روابط ہیں ۔ آرزو صاحب عرب ممالک کی کئی علمی اکیڈمیوں کے رکن ہیں ۔ عرب ممالک کے بعض اہم عالموں، ادیبوں اور مصنفوں سے آرزو صاحب کے اچھے تعلقات ہیں ۔ پروفیسر اسلوب احمد انصاری لکھتے ہیں:

> ''آرزو صاحب مسلم یونیورسٹی کے لیے تو مایہ ناز رہے ہی ہیں اور ہیں ، لیکن عام لوگ، علمی دنیا میں خاص طور پر عرب ممالک میں ان کی ساکھ اور شہرت سے واقف نہیں ۔ ظاہر ہے ایسا امتیاز اپنے فن میں کامل

Marfat.com

دست گاہ اور دست رس کے بغیر ممکن نہیں۔ کیوں کہ اہل زبان آسانی سے کب کسی غیر کو خاطر میں لاتے ہیں۔ آرزو صاحب عربی زبان کے منتہی ہیں اور تحقیق کے مسایل کی نزاکتوں اور پیچیدگیوں اور دشواریوں کا جیسا شعور اور تجربہ انہیں حاصل ہے، ایسا کم لوگوں کو ملے گا۔ اس میں یقیناً بہت بڑا فیضان ان کے اساتذہ مولانا عبد العزیز میمن اور پروفیسر کب کا ہے، اور اس کے لیے بنیاد فراہم کی ان کے والد ماجد مولانا ظفر الدین قادری اور دوسرے عربی کے اساتذہ نے۔"

عرب ممالک میں آرزو صاحب کی مقبولیت اور شہرت کا اندازہ اس ناچیز کے نام ان کے درج ذیل مکتوب سے لگایا جاسکتا ہے جسے انہوں نے عمان، اردن کے ایک سفر سے واپسی کے بعد لکھا ہے:

علی گڑھ

۲۰۰۲/۹/۱۵ء

میرے مکرم السلام علیکم

آپ کا صرف ایک خط ملا تھا جس میں آپ نے سید امین اشرف صاحب سے اپنی نہایت خوشگوار ملاقات کا ذکر کیا تھا۔ ہاں اس خط کی عکسی نقل بھی ملی تھی جو آپ نے جگن ناتھ آزاد کو لکھا تھا۔

میں چند دنوں کے لیے عمان / اردن گیا ہوا تھا۔ جلالۃ الملک شاہ حسین بن طلال کی وفات اور امیر حسن بن طلال کی امور مملکت سے علاحدگی کے بعد وہاں کی علمی و ادبی ادارے المجمع الملکی لبحوث الحضارۃ الاسلامیہ کی کارگزاریاں نسبۃً سرد ہوگئی تھیں۔ مدیر ادارہ در ناصر الدین الاسد علاحدہ ہوگئے تھے، اس لیے کہ ان کا تعلق پرنس حسن بن طلال سے تھا اور جب وہ المجمع کے سرپرست نہیں رہے تو المجمع کے رئیس در ناصر الدین بھی کنارہ کش ہوگئے۔

کئی سال تک صورتِ حال یہی رہی، پچھلے سال موجودہ سربراہ سلطنت، صاحب الجلالۃ الھاشمیۃ عبد اللہ الثانی ابن الحسین المعظم اور صاحب السمو الملکی ولی عہد امیر حمزہ بن حسین کی سرپرستی میں ایک نیا ادارہ بنام مؤسسۃ ال البیت للفکر الاسلامی قائم

Marfat.com

ہوا۔ مجھے اس کی بھی عضویت (رکنیت) بخشی گئی اور اطلاع دی گئی کہ ستمبر ۲۰۰۲ میں اس کا اجلاس ہوگا۔ دوسرے لفظوں میں المجمع الملکی کا نام بدل کر اب موسسۃ آل البیت کر دیا گیا ہے۔ عمارت وہی ہے اور عہدے دار بھی وہی ہیں جو سابق میں تھے، بجز عہدۂ رئیس کے۔ اب رئیس تو نہیں مدیر کا عہدہ قائم کیا گیا ہے، جس پر ایک ممتاز عالم اور مصنف اور میرے پرانے کرم فرما در ابراہیم شبّوح مقرر کیے گئے ہیں، یہ المجمع میں پہلے سے تھے اور انہیں در ناصر الدین اس ادارے میں لائے تھے۔

میں ۲ر ستمبر کی تاریخ کو دھلی سے عَمان کے لیے روانہ ہوا۔ چند گھنٹوں میں عَمان میں تھا۔ ایک نہایت عالی شان پانچ ستارے والے ہوٹل (Regency Palace) میں قیام تھا جس کی بیس منزلیں تھیں۔ سو کے قریب مندوبین پوری دنیا سے آئے تھے۔ ۳ر کو جلالۃ الملک نے اس بارھویں موتمر کا افتتاح کیا۔ پھر تین دن تک اس کے جلسے ہوتے رہے۔ پندرھویں صدی میں اسلام اور مسلمانوں کے مسائل پر مقالات پڑھے جاتے رہے اور مذاکرے جاری رہے۔ عربی دائرۃ المعارف الاسلامیہ اور دنیا بھر کے عربی مخطوطات کی فہرست سازی کے کام کی رفتار کچھ سست نظر آئی اس منصوبے کے ناظم ڈاکٹر احسان عباس کی صحت بھی بہت کمزور ہوگئی ہے۔

ایک دن مہمانوں کو بعض اجل صحابۂ کرام کے مزارات کی زیارت کرائی گئی۔ جیسے حضرت جعفر بن ابی طالبؓ (جن کا مزار شہر کرک کے قریب ہے)، حضرت زید بن الحارثہ (کرک) حضرت عبداللہ بن رواحہ (کرک) حضرت ابوعبیدہ عامر بن الجراح (غور، وادی اردن) حضرت ابوذر غِفاری (نزد قریۂ مادبا) وغیرھم رضوان اللہ الاجمعین۔ حضرت بلال بن رباح، حضرت میسرہ بن مسروق العبسی، حضرت عکرمہ بن ابی جہل اور چند دوسرے صحابۂ کرام کے مزارات بھی وہاں ہیں جن کی زیارت ایک دن میں نہیں ہوسکتی تھی۔ کچھ مندوبین اصحاب کہف کے غار بھی دیکھنے گئے جو عمان سے باہر واقع ہے اور جہاں بازنطینی اور رومن عمارتوں کے آثار اب بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ ایک مقامِ موتہ بھی گئے جو کرک کے قریب واقع ہے جہاں جنگ موتہ ہوئی تھی وہ جگہ دیکھی۔ وہاں ایک عالی شان موتہ یونیورسٹی بھی بن گئی ہے۔ ہم لوگ اِربد کے قریب یرموک بھی گئے جہاں جنگ یرموک ہوئی تھی۔ میں در ابراہیم السعافین صدر شعبۂ عربی کی دعوت پر جامعۂ یرموک بھی گیا۔

Marfat.com

ایک دن ہم لوگ بحرالمیت (Dead Sea) بھی دیکھنے گئے، بہت نشیب میں واقع ہے، پانی کا رنگ کچھ عجیب سا نظر آیا۔ بعض دوست بطور یادگار بوتلوں میں وہاں کا پانی بھر کر لائے۔

ایک رات شاہ اردن کے محل میں جو ہماری قیام گاہ سے بہت دور واقع ہے ڈِنر تھا تو دوسری رات موجودہ ولی عہد کی طرف سے رات کے کھانے کی دعوت تھی۔ ایک شام پرنس حسن بن طلال نے اپنے محل میں ہم لوگوں کو عصرانے پر مدعو کیا۔ کئی سال کے بعد ملاقات ہوئی تھی۔ میں نے سمجھا وہ بھول گئے ہوں گے۔ میں نے مصافحہ کرنا چاہا، انھوں نے گلے سے لگالیا اور چند منٹ تک بات کرتے رہے۔ انھوں نے بتایا عالم اسلام کے موجودہ حالات پر انھوں نے ایک مضمون لکھا ہے جو پاکستان کے اخباروں میں چھپے گا، دیکھیے گا۔ ڈاناصر الدین الاسد سابق رئیس مجمع الملکی سے وہیں ملاقات ہوئی، بہت محبت سے ملے۔ غرض یہ سفر ہر لحاظ سے بہت کامیاب رہا۔ والسلام

مختار الدین احمد

اگر کوئی ممتاز عالم اور بااصول دانش ور کسی ہم عصر علمی شخصیت پر کوئی علمی مضمون لکھتا ہے تو اس کا اندازِ بیان بڑا محتاط ہوتا ہے؟ وہ رائی کو پربت بنا کر نہیں پیش کرتا۔ وہ جو کچھ لکھتا ہے اپنے علم اور معلومات کی کسوٹی پر پرکھنے کے بعد لکھتا ہے۔ فارسی زبان و ادب کے شہرۂ آفاق عالم اور بالغ نظر محقق پروفیسر نذیر احمد مدظلہ نے ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو صاحب کو علمی اور اخلاقی دونوں لحاظ سے مغتنمات میں شمار کیا ہے۔ موصوف انھیں یوں خراج تحسین پیش کرتے ہیں:

''ڈاکٹر مختار الدین احمد قدیم اور جدید دونوں علمی روایتوں کے حامل ہیں۔ یورپ کے مستشرقین کی صحبت نے ان کی صلاحیت میں بڑا نکھار، ان کی شخصیت میں بڑا رچاؤ اور ان کی طبیعت میں بڑی خوش سلیقگی پیدا کردی ہے..... ڈاکٹر مختار الدین احمد بلند پایہ اخلاق کے مالک ہیں، وہ نہایت ملنسار، خلیق اور متواضع، مخلص دوست اور شفیق استاد ہیں۔ چھوٹے بڑے سب سے بڑے اخلاق سے پیش آتے ہیں۔ مزاج میں سادگی کے ساتھ شگفتگی ہے، گفتگو میں کشش ہے، مدلل انداز میں بات کرتے ہیں۔

Marfat.com

نہایت معاملہ فہم ہیں ۔ بردباری اور تحمل ان کے مزاج میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے ......اسلامی فکر رکھتے ہیں،اختلافی امور میں میانہ روی ان کا شیوہ ہے ۔ چوں کہ سیاسی مزاج نہیں رکھتے ، اس لیے سیاسی اختلاف کا موقع ہی نہیں ۔ البتہ ادبی اور علمی کاموں میں ایسے مواقع پیدا ہوجاتے ہیں ، ایسی صورتوں میں بھی وہ کبھی شدت کا طریقہ اختیار نہیں کرتے، کسی سے اختلاف بھی کریں گے تو انداز بیان ایسا نرم کہ مخالف کی کسی طرح دل شکنی نہیں ہوگی..........

علی گڑھ اور آکسفرڈ کے قیام اور علمی فضا نے انھیں قلب ونظر کی وسعت عطا کی ۔ دنیا کی ان دونوں مشہور جامعات کے علماء سے انھوں نے میانہ روی کا درس لیا اور متوازن ہونا سیکھا ۔"

انگریزی زبان و ادب کے استاد پروفیسر اسلوب احمد انصاری جن کا شمار اردو کے صفِ اول کے تنقید نگاروں میں ہوتا ہے ۔ انصاری صاحب کی تحریریں بہت ہی محتاط اور صحت مند انداز فکر کی حامل ہوتی ہیں ۔ وہ اپنے مقالے "پروفیسر مختار الدین احمد : ایک دوست" کے اختتام پر رقم طراز ہیں

"زندگی بھر کے تجربے نے بتایا کہ علم وفضل کی اہمیت اپنی جگہ پر، اور یہ دونوں عام نہیں بلکہ کمیاب ہیں ۔لیکن انسان کی انسانیت ہر طرح کے امتیاز و افتخار پر فوقیت رکھتی ہے ۔ اگر اتفاق سے یہ دونوں یک جا ہوجائیں تو یہ سونے پر سہاگہ ہے ۔ آرزو صاحب ان منتخب روزگار لوگوں میں ہیں جو ان دونوں کے جامع ہیں اور یہ ایسی نادر اور انوکھی چیز ہے جو بہ زور بازو حاصل نہیں ہوتی"

میں سال میں ایک آدھ بار علی گڑھ ضرور پہنچتا ہوں ۔ کبھی اپنے عزیزوں سے ملنے کے لیے جو علی گڑھ میں زیر تعلیم ہیں اور کبھی بہ غرض علاج ۔ جب سے آرزو صاحب سے والہانہ تعلق ہوا ہے جب بھی علی گڑھ جاتا ہوں ، آرزو صاحب سے ملاقات کے لیے ان کی خدمت میں ضرور حاضر ہوتا ہوں ، آن محترم کو سراپا خلوص پاکر اپنے آپ پر رشک کرتا ہوں :

Marfat.com

کہاں میں اور کہاں وہ نکہت گل
نسیم صبح تیری مہربانی

کہاں مجھ جیسا کم علم، ناکارہ روزگار اور کہاں محترمی آرزو صاحب جیسا نابغہ گار! یہ میری خوش نصیبی ہے اور ان کا کمال انکسار کہ بہ ہمہ علم و فضل وہ بہ ذات خود، ناچیز کی قیام گاہ تک بھی ملاقات کے لیے تشریف لاتے ہیں۔ اکتوبر ۲۰۰۰ء میں شدید بیمار ہو کر بہ غرض علاج اپنے عزیزوں کے پاس علی گڑھ پہنچا تو آرزو صاحب کئی بار میری عیادت کے لیے میری قیام گاہ تک تشریف لائے۔ اس وقت مولانا حسرت موہانی مرحوم کا یہ شعر یاد آتا رہا:

صحتیں لاکھوں مری بیماری غم پر نثار
جس میں لوٹے بارہا ان کی عیادت کے مزے

حضرت الاستاد مولانا قاری محمد طیبؒ نے اپنی علمی مجلس میں ایک بار فرمایا تھا: صاحب علم کو مخلص، متواضع، نرم خو، منکسر المزاج، خوش دل، علم دوست، ملنسار ہونا چاہیے اور طالبین علم کے لیے اپنے علم کا دروازہ ہمیشہ کھلا رکھنا چاہیے۔ صاحب علم کو علمی پندار میں نہیں مبتلا رہنا چاہیے۔ اخلاق کی شیرینی اور جذبۂ افادہ سے سرشار ہو کر ہی کوئی صاحب علم کما حقہ علم کی خدمت انجام دے سکتا ہے۔ حضرت قاری طیب صاحبؒ ان تمام خوبیوں کا پیکر تھے۔ ان کے علاوہ یہ خوبیاں میں نے جن بزرگوں میں دیکھیں، ان میں پروفیسر مختار الدین احمد آرزو اور ڈاکٹر نذیر احمد کی شخصیات سرفہرست ہیں۔

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی ارادت ہو تو دیکھ ان کو
ید بیضا لیے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں
ترستی ہے نگاہِ نارسا جس کے نظارے کو
وہ رونق انجمن کی ہے انھی خلوت گزینوں میں

☆☆☆

Marfat.com

ڈاکٹر ابن فرید
سابق استاد ملک عبدالعزیز یونیورسٹی، جدہ

آرزو صاحب

(حسنِ سلوک کا بہترین نمونہ)

مختار الدین احمد صاحب آرزو سے میں اس وقت متعارف ہوا جب میں نے چار سال کے وقفے کے بعد لکھنؤ کرسچین کالج میں انٹرمیڈیٹ میں داخلہ لیا۔ کتابیں اور رسالے پڑھنے کا شوق اسکول میں میرے ڈرل ماسٹر عابد علی صاحب مرحوم کی وجہ سے پڑا تھا، مرحوم اسکول کی لائبریری کے نگراں بھی تھے۔ وہ میرے مربی تھے کہ طلبہ میں صرف مجھے لائبریری سے کتابیں مستعار لے جانے دیا کرتے تھے۔ یہ شوق لکھنؤ واپس آنے کے بعد مجھے کتابوں کی دوکانوں اور بک اسٹالوں پر لے جایا کرتا تھا۔ وہاں کتابی دنیا ایک ایسا بک اسٹال تھا جہاں میں دن میں ایک چکر ضرور لگا آیا کرتا تھا۔ ایک دن وہاں کاؤنٹر پر ''علی گڑھ میگزین'' کا غالب نمبر رکھا ہوا دیکھا۔ اس کے مرتب مختار الدین احمد صاحب آرزو تھے۔ یہ نمبر اس وقت سے اب تک میرے پاس محفوظ ہے اور اس کے ساتھ ہی مختارالدین احمد صاحب آرزو کا نام بھی!

دو بارہ چھ سال کے وقفے کے بعد جب میں نے علی گڑھ میں ایم اے میں داخلہ لیا تو میں اپنے ہم درس طلبا کا ''بزرگ'' اور اساتذہ کے لیے ''تختۂ مشق'' بن گیا تھا جن کو میرا اہم درس یا شاگرد ہونا چاہیے تھا۔ اپنی منزل تک پہنچنے کے لیے میں ان ''رسوائیوں'' سے آزردہ خاطر نہ ہوا۔ کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا تو پڑتا ہی ہے۔ علی گڑھ میں مجھے مستقلاً اچھے انسانوں کی تلاش رہی۔ اسی تلاش میں نہ معلوم کب، کہاں اور کیسے ایک بار ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو صاحب سے ملاقات ہوگئی۔ اچھا تو یہ ہیں غالب نمبر کے مرتب! پہلی ہی ملاقات میں انھوں نے ایک خوش گوار تأثر چھوڑا۔ زوال رسیدہ مشرقی معاشرے کی یاد تازہ ہوگئی۔ وہی آداب، تہذیب، اخلاق اور برتاؤ جو کبھی اپنے خاندان کے بزرگوں میں پایا کرتا تھا اس کی جھلک آرزو صاحب میں پائی۔ ان کے شخصی اوصاف

Marfat.com

اتنے بے شمار ہیں کہ میں رفتہ رفتہ ان سے قریب ہوتا چلا گیا۔ ان سے جب بھی ملاقات ہوتی تو ان کا چہرہ شگفتہ ہوتا، سب سے پہلے خیر خیریت معلوم کرتے، اپنے ذاتی تعلقِ خاطر کا اظہار کرتے، پھر بہت سی اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے، لیکن یہ بہت سی باتیں علمی دنیا کی ہوتی تھیں۔ ان کی باتوں سے صاف اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اپنے مخاطب کو خاطر خواہ اہمیت دے رہے ہیں۔ راستے میں ملتے تو ایک لحظے کے لیے رُک جاتے، انداز بالکل یہی ہوتا، البتہ بعض خودنما حضرات کی طرح لاطائل باتوں سے راستہ کھوٹا نہ کرتے۔ میں نے تو ہمیشہ ایسا محسوس کیا کہ جیسے ان کا خاص کرم ہے مجھ پر!

آرزو صاحب نے میرے علی گڑھ پہنچنے سے پہلے اپنا تخلص ترک کر دیا تھا۔ تب سے وہ اپنا نام صرف مختار الدین احمد لکھتے ہیں۔ لیکن میں جب بھی ان کا نام لیتا ہوں تو نہ معلوم کیوں اگر ''آرزو'' ترک کر دوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے گستاخی کر رہا ہوں۔ پھر میں عجب تذبذب میں پڑ جاتا ہوں کہ اگر وہ نام لوں جو انھوں نے ترک کر دیا ہے تو عجب سی بات ہوگی۔ بہر حال، میں ان دونوں صورتِ حال سے بچنے کی راہ نکال ہی لیتا ہوں کہ وہ خوش رہیں۔

آرزو صاحب عام طور پر مصروف رہتے ہیں۔ جب کبھی ان کے گھر یا شعبہ گیا تو ان کے ہاتھ میں کوئی کتاب، رسالہ، اخبار یا کسی تحریر کی زیروکس کاپی دیکھی۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے میں علم کے ایک جہانِ آرزو میں آ گیا ہوں۔ جب بات شروع ہوتی تو گھوم پھر کر کسی علمی یا ادبی موضوع کی طرف مڑ جاتی۔ اس طرح میں نے ان سے بہت کچھ علمی آگاہی حاصل کی۔

ایک بار میں وکٹوریا گیٹ کے سامنے سے اپنا اسکوٹر لے کر چلنے ہی والا تھا کہ آرزو صاحب اپنے دو ایک شاگردوں کے ساتھ اِدھر سے گزرے مجھے دیکھتے ہی بولے، ''ابنِ فرید صاحب، اس بار آپ نے ایک پٹھان کے پنجے میں پنجہ ڈال دیا ہے۔'' میں نے کہا، ''شیوخِ اودھ نے اُنھیں خاصے لمبے عرصہ تک بھگتا ہے۔ میں بھی انھیں میں سے ہوں، بھگت لوں گا۔ یہ گفتگو میرے مضمون ''اردو املا کی الجھنیں'' سے متعلق تھی۔ انھوں نے میرے لہجے، نرم کلامی اور علمی موشگافیوں کی تعریف کی۔ البتہ میں جو معترف ہوا وہ ان کے اس وصف کا کہ وہ مختلف موضوعات کا مطالعہ کرتے ہیں اور وسیع مطالعہ کرتے ہیں۔

Marfat.com

انھیں اس کی ضرورت نہیں ہوتی کہ کوئی آ کر انھیں توجہ دلائے ۔ پھر وہ مصنف کا نام دیکھ کر نہیں موضوع پر نظر رکھ کر مطالعہ کرتے ہیں ۔ میں نے جب انھیں اپنے مضامین کے مجموعے دیے تو انھوں نے انھیں پڑھا اور اپنی رائے کا اظہار بھی کیا۔ یہ علم کا ایسا انداز ہے جو ان اہلِ علم کا ہوتا ہے جو ہمیشہ طالب علم بنے رہتے ہیں۔

علی گڑھ میں مجھے بہت سی آزمائشوں کا سامنا کرنا پڑا ۔ میں نے ہر بار یہی تاویل کی کہ میری اپنی کسی کمی کی وجہ سے ایسا ہوا ۔نفسیات اور انگریزی ادب کے ایم اے کے امتحانوں میں میری ڈویژنیں خراب کی گئیں ۔ میں نے اُردو میں ایم اے کرنا چاہا تو میرا پہلے سمسٹر کا نتیجہ ہی منسوخ ہوگیا۔ میں نے اپنے آپ کو سمجھایا ، اللہ کے نزدیک میرے لیے ان نتائج میں بھی کوئی بہتری ہوگی ۔ایک بار پھر مجھے اپنے عزائم کو توڑنا پڑا۔ میں نے میڈیکل کالج کے ایس پی ایم ڈپارٹمنٹ میں سوشل کیس ورکر کی حیثیت سے ملازمت کرلی۔ اس حیثیت سے میں نے ایک صبح آرزو صاحب کے دروازے پر بھی دستک دی ۔وہ میرے حالات سن کر حیرت زدہ رہ گئے ۔ مجھے بہت تسلی دی اور کہا گھبرایئے نہیں حالات ہمیشہ ایک جیسے نہیں ہوتے۔ پوری یونیورسٹی میں وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے میرے درد کو سمجھا اور میری بے وقعتی پر آزردہ ہوئے ۔اس وقت میرے دل میں جو سوز پیدا ہوا وہ الفاظ کا پیرہن نہیں پہن سکتا ۔ پھر جب چودہ سال کی آزمائش کے بعد مجھے سوسیالوجی کے شعبہ میں لکچرر کی نوکری ملی تو ایک دن آرٹس فیکلٹی کے سامنے ان سے ملاقات ہوگئی ۔ لپک کر میری طرف بڑھے اور کہا، مبارک ہو لیکن، یہ لکچرر شپ بہت پہلے آپ کو مل جانی چاہیے تھی، بہرحال مگن رہیے اور ماضی بھول جایئے۔یہ اندازِ تبریک اتنا پیارا تھا کہ اس کی مٹھاس میں آج ریٹائرمنٹ کے چودہ سال بعد بھی نہیں بھول سکا ہوں ۔ اس لذت کو دوبالا کرنے کے لیے میں جب بھی علی گڑھ جاتا ہوں اور طبیعت قدرے معمول پر ہوتی ہے تو میں آرزو صاحب سے ملنے ضرور جاتا ہوں ۔

میں جدّہ میں ملک عبدالعزیز یونیورسٹی کے انجینیرنگ کالج میں استاد مساعد تھا تو وہاں ایک دن فون آیا، ''میں مختار الدین احمد بول رہا ہوں۔کیا آپ سے ملنے آسکتا ہوں؟'' مجھے بے پناہ مسرت ہوئی ۔کیا آرزو صاحب کے لیے میں اتنا اہم ہوسکتا ہوں کہ عرب دنیا کے بڑے بڑے علماء وفضلا کو چھوڑ کر وہ مجھے یاد کریں۔ میں نے انھیں اپنے گھر تک آنے

Marfat.com

کا راستہ بتایا اور سڑک پر جا کر میں ان کا انتظار کرنے لگا۔ وہ جب آئے تو بڑی مسرت کے ساتھ انھیں اپنے گھر لایا۔ معلوم ہوا سیدھے یونیورسٹی لائبریری سے آرہے ہیں، خوش تھے کہ وہاں، عربی کی ایسی جدید مطبوعات ملیں جو ان کی نظر سے ہندوستان میں نہیں گزری تھیں۔ ان کے ساتھ ان کی اہلیہ محترمہ بھی تھیں جن کی میزبانی میری اہلیہ مرحومہ نے کی۔ آرزو صاحب جب تک میرے پاس رہے بے تکلف باتیں کرتے رہے۔ اس وقت وہ شرقِ اردن سے ہندوستان واپس جارہے تھے۔ اس طرح کے سفر وہ عام طور سے کیا کرتے تھے۔ ان علمی اسفار سے اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ آرزو صاحب کی مصروفیات عموماً علمی ہوا کرتی تھیں۔ اس حقیقت کا اندازہ ڈاکٹر عطا خورشید اور مہر الٰہی ندیم کی مرتب کردہ اشاریاتی کتاب ''مختارنامہ'' سے ہوتا ہے۔ یہ دوسو صفحات کی کتاب ان کے وسیع دائرۂ علم اور تصنیف و تالیف کا کیٹلاگ پیش کرتی ہے۔ اتنا بہت سا کام جس کے صرف عنوانات ایک اوسط حجم کی کتاب پر مشتمل ہوں آرزو صاحب کے گہرے علمی انہماک اور ادبی ذوق وشوق کی غماز ہے۔

۱۹۸۰ء میں غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی کے سیمنار میں میری شرکت آرزو صاحب کی دلچسپی کی بنا پر ہوئی تھی۔ وہ انسٹی ٹیوٹ کے مسائل سے بیحد دلچسپی رکھتے تھے۔ سیمنار میں چند نادانوں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر میری کھلّی اڑانے کی کوشش کی، لیکن جب انھیں اپنے منھ کی کھانی پڑی تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئے۔ آرزو صاحب سے جب میں نے ذکر کیا تو وہ مسکرائے اور انھوں نے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا ابن فرید صاحب آپ کو ہر جگہ ہر طرح کے لوگ ملیں گے: باہمیں مردماں بباید ساخت'' پر عمل کیجئے اور کبھی ٹینشن نہ لیجئے۔ ان کی اس نصیحت پر جب بھی عمل کیا خوش اور مطمئن رہا۔

ایک بار ایک قدرے خودسر اور سرکش طالب علم پر جو مجھ سے دہلی کے کسی اخبار یا رسالے کے لیے میرا انٹرویو لینے پر بیجا اصرار کررہے تھے آرزو صاحب کا غصہ بھی دیکھنے کا موقع ملا۔ میں ادارۂ علومِ اسلامیہ میں آرزو صاحب سے ملنے آیا تھا کہ وہ صاحبزادے مجھے ظہور حسین وارڈ کے صدر دروازے ہی پر مل گئے وہ میرے سیاسی اور مذہبی رجحانات سے واقف تھے۔ مجھے یرغمال بنا کر ایک کمرے میں لے جا کر علی گڑھ کے مسائل حاضرہ پر میرے تأثرات شائع کرنا چاہتے تھے۔ اس زمانے میں وہاں قرآن شریف کے کچھ

Marfat.com

اوراق جلائے جانے پر علی گڑھ کا ایک خاص طبقہ برہم تھا اور صحیح یا غلط جو صاحبان اس فعل کے ذمہ دار ٹھہرائے جارہے تھے ان کے خلاف تعزیر پرزور دیاجارہا تھا۔ آرزو صاحب آتش فتنہ وفساد سرد کرنا چاہتے تھے اور مجھے اس جھگڑے سے بھی بچانا چاہتے تھے ۔انھوں نے پہلے نرمی سے پھر کچھ سختی سے صاحبزادے کو سمجھایا کہ ابن فرید صاحب تھوڑی دیر کے لیے مجھ سے ملنے آئے ہیں آپ اُن سے انٹرویو لینے کے لیے کیوں اصرار کررہے ہیں۔ آرزو صاحب کے جمال کے مختلف مناظر نظر کے سامنے تھے، اس دن ان کا جلال بھی دیکھنے میں آیا۔

لیکن غصہ میں بھی آرزو صاحب کے لہجے میں اشتعال نہ تھا، سوائے اس کے کہ ان کا چہرہ تمتمایا ہواتھا ۔بعض پروفیسروں کی طرح وہ نہ تو چیخ چلارہے تھے اور نہ آپے سے باہر ہوئے جارہے تھے ۔ان کا انداز شرفاء کے آداب وتہذیب اور رکھ رکھاؤ کا تھا ۔انھوں نے اس معاشرے کی تصویر زندہ کردی جس کی رفعت و پاکیزگی اب دھندلا چکی ہے میں کچھ دیر بعد آرزو صاحب کے پاس معذرت کرنے گیا کہ خواہ مخواہ میری وجہ سے آپ کو زحمت ہوئی۔

وہ اسی نارمل موڈ میں اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے لکھنے پڑھنے میں مصروف تھے۔مسکراتے ہوئے انھوں نے فرمایا۔استاد کو طالب علموں کے ساتھ شفقت ومحبت کا سلوک کرنا چاہیے لیکن جب ضرورت داعی ہوتو ان کی تنبیہ کرنا بھی استاد کا فرض ہے۔ہم لوگ ابھی باتوں میں مصروف تھے کہ وہ صاحبزادے بھی سر جھکائے کچھ پشیمان سے کمرے میں داخل ہوئے۔آرزو صاحب نے انھیں بٹھایا پہلے انھیں ایک گلاس ٹھنڈا پانی پلایا اس کے بعد گرم گرم چائے ۔ جب صاحبزادے کے حواس کچھ درست ہوئے تو انھوں نے معذرت آمیزانہ انداز میں کچھ کلمات کہے اوراپنی پشیمانی کااظہار کیا۔آرزو صاحب سر جھکائے کچھ کاغذات دیکھ رہے تھے، اب انھوں نے سراٹھاکر ایک نظر انھیں دیکھا اور کہا اچھا اب جایئے لکھیے پڑھیے اورلغویات میں نہ پڑیے ۔پھر وہ میری طرف متوجہ ہوئے اوراس طرح باتیں کرنے لگے۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ وہ مکروہات کا اثر اپنے اوپر دیر تک قائم نہیں رکھتے تھے اور یہی ان کی کامیابی کاراز ہے۔

میں بعض دوسرے پروفیسروں کے پاس جاتا تھا تو وہ بیٹھنے کو بھی نہیں کہتے

Marfat.com

تھے۔ ان لوگوں کے برخلاف ، آرزو صاحب اس طرح خاطر خواہ تواضع کرتے تھے (اوراب بھی کرتے ہیں) کہ جیسے میں کوئی خاص ہستی ہوں۔ یہ برتاؤ ان کی عالی ظرفی اور مہذب خاندانی پس منظر کی نمائندگی کرتا ہے۔ میں اب بھی جب کبھی ان سے ملنے جاتا ہوں کہ ان سے ملنا اچھا لگتا ہے تو وہ دیکھتے ہی اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور جب واپس ہوتا ہوں تو اپنے گھر کے گیٹ تک پہنچانے آتے ہیں ۔ یہ شرافت و تواضع ہر صاحب طالع بیدار کے یہاں کہاں ملتی ہے ۔ یہاں تو اکثریت ان اصحابِ علم کی ہے جو مدغ ہیں۔ کاش اللہ تعالیٰ انھیں علم کے ساتھ آرزو صاحب کی طرح حسنِ سلوک بھی عطا کرے۔

آرزو صاحب سے اس لیے ملا کرتا ہوں کہ وہ اپنی شرافت اور شریفانہ برتاؤ کی وجہ سے مجھے اچھے لگتے ہیں اوراسی لیے میری حاضری خوش دلی کے ساتھ ہوتی ہے۔آرزو صاحب تبحر عالم اور قابل رشک اوصاف کے انسان ہیں۔ان سے میری عقیدت اور تعلقِ خاطر ہر ملاقات کے بعد بڑھتا ہی جاتا ہے۔

☆☆☆

Marfat.com

پروفیسر عبدالقوی دسنوی
سابق صدر شعبہ اردو، سلفیہ کالج، بھوپال

غالبیات اور ڈاکٹر مختار الدین

ابھی میں نے ہوش سنبھالا تھا اور میری اسکول کی تعلیم کا ابتدائی زمانہ تھا کہ اپنے وطن دیسنہ کے کتب خانۂ الاصلاح جانے لگا تھا جہاں کتب و رسائل کے دیکھنے اور پڑھنے کا شوق پیدا ہوگیا تھا، وہیں سرسید، شبلی، اقبال، سلیمان ندوی، عبدالسلام ندوی، عبدالماجد دریابادی، عبدالحلیم شرر، حسرت موہانی، جوش ملیح آبادی، نیاز فتحپوری وغیرہ کے نام سننے اور ان کی بعض تصانیف دیکھنے کا موقع ملا۔ کالج کی تعلیم کے زمانے میں تحقیقی وتنقیدی مضامین سے دلچسپی ہوئی تو چند اور محققین و ناقدین کے ناموں کا اس فہرست میں اضافہ ہوا جن میں خاص طور سے امتیاز علی عرشی، غلام رسول مہر، مالک رام، صباح الدین عبدالرحمٰن اور ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو صاحبان کے نام میرے نزدیک بہت اہم تھے۔ اساتذہ اور بزرگوں سے ان کے نام بار بار سننے میں آتے تھے، اُن کی تحریریں بڑے شوق سے دیکھتا تھا، اسی دوران میں غالبیات سے بھی دلچسپی پیدا ہوگئی تھی، غالب کی غزلیں پڑھتا اور پسندیدہ اشعار ذہن نشین کرنے لگا تھا۔ جس کے نتیجے میں غالب سے متعلق تحریروں اور کتابوں سے ایک خاص لگاؤ پیدا ہونے لگا تھا، جہاں تک ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو صاحب کے نام کا تعلق ہے تو ۵۰۔۱۹۴۹ء میں ان کا نام پہلی بار علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میگزین کے ''غالب نمبر'' کے ذریعہ میرے سامنے آیا۔ یہ پہلا نمبر تھا جس نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا۔ اسے دیکھ کر خوشی اس لیے بھی ہوئی تھی کہ اس کے مرتب مختار الدین احمد صاحب کا ننھالی تعلق دیسنہ سے قریب ایک مردم خیز بستی 'استھانواں' سے ہے۔ جو سادات اور ملک صاحبان کا مشہور گاؤں ہے اور جہاں سے نامور عالم اور شاعر پیدا ہوئے۔ واضح رہے کہ حضرت غوث علی شاہ قلندر (۱۲۱۹۔۱۲۹۷) کا وطن اصلی بھی استھانواں ہی ہے۔

علی گڑھ میگزین کے اس 'غالب نمبر' نے میرے دل میں ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب کے لیے ایک خاص احترام کا جذبہ پیدا کر دیا تھا، اس نمبر کی ادبی دنیا میں خاصی شہرت اور

Marfat.com

مقبولیت ہوئی جس کے نتیجے میں اس نمبر کے مضامین کچھ نئے اضافوں کے ساتھ دو کتابوں ''احوال غالب'' اور'' نقد غالب'' میں منتقل ہو کر منظر عام پر آئے تیسرے مجموعہ ''گنجینۂ غالب'' کا مسودہ ان کے انگلستان چلے جانے کے بعد قاضی عبد الغفار مرحوم کے زمانے میں انجمن سے یا دہلی کے مطبع سے غارت ہوگیا۔ یہ دونوں کتابیں ہاتھوں ہاتھ لی گئیں خاص طور سے اُردو کے ام ۔اے کے طلبہ اور ریسرچ اسکالرس کے مطالعۂ غالب کے لیے یہ کتابیں اس وقت سے ہی بڑی اہمیت رکھتی ہیں اور یہی وہ زمانہ تھا جب سے ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب کا شمار نہ صرف غالب شناسوں میں ہونے لگا تھا بلکہ ایک معتبر محقق کی حیثیت سے بھی ان کی قدر و منزلت ہونے لگی تھی ۔'' احوال غالب'' میں ڈاکٹر صاحب کے مضمون ''سرِّ غالب در حدیث دیگراں'' اور ''غالب کی تصویریں'' شامل اشاعت ہیں اور بہت اہم ہیں۔

لیکن ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب کو اپنی عمر کی تقریباً پچیس چھبیس برسوں میں یہ شہرت آسانی کے ساتھ نہیں ملی تھی اُن کی ذہانت کے ساتھ اُن کی ادب سے گہری دلچسپی اور تحقیقی نظر نے انھیں مسلسل مطالعہ کے بعد اس منزل تک پہنچایا تھا۔ ان کا تعلیمی دور بھی ان کے تحصیل علم کے ذوق و شوق کا مظہر رہا ہے۔

ان کے بچپن کے ابتدائی چند سال ان کی نانیہال استھانواں میں گزرے، تقریباً ساڑھے چار سال کی عمر میں حافظ شرف الدین احمد صاحب کے ہاتھوں بسم اللہ کی رسم انجام پائی ، اردو کی ابتدائی تعلیم اپنی والدہ سے حاصل کی۔ قرآن پاک کے ابتدائی چند پارے ان کے نانا ملک محمد واعظ الحق نے پڑھائے ۔ سات پارے ختم کر کے وہ اپنی والدہ کے ساتھ عظیم آباد پٹنہ چلے گئے جہاں ان کے والد مکرم مولانا ظفر الدین صاحب قادری مدرسہ اسلامیہ شمس الھدیٰ میں حدیث و ہیئت کے استاد تھے ۔ اِنھوں نے چھ سال کی عمر میں قرآن شریف ختم کیا اور ساتھ ساتھ مولانا محمد اسماعیل میرٹھی کی اُردو ریڈروں کے چاروں حصے بھی پڑھ ڈالے ۔ کچھ اور بڑے ہوئے تو مدرسۂ اسلامیہ شمس الہدیٰ جانے لگے جہاں مولوی سید ظہور احمد صاحب کی کلاس میں بیٹھ کر پرائیویٹ طور پر کریما، گلستاں اور فارسی کی دوسری کتابیں پڑھیں اور کچھ خوش نویسی بھی انہیں سے سیکھی۔ اپنے والد صاحب سے انھوں نے صرف ونحو کی تعلیم حاصل کی ، انہیں سے عربی پڑھی ، حدیث کی مشہور کتاب

Marfat.com

مولانا امام محمد گیارہ سال کی عمر میں ختم کی۔ سنہ ۱۹۳۲ کے سیشن میں وہ مدرسۂ شمس الہدیٰ کی ''مولوی'' کی کلاس میں داخل ہوئے۔ وہ اپنی کلاس کے سب سے کم عمر طالب علم تھے۔ ''عالم'' اور ''فاضل'' کی تعلیم بھی انھوں نے یہیں حاصل کی۔ وہ ''فاضل'' اور ''فاضل حدیث'' کے امتحانوں میں صوبہ بھر میں اول آئے اور گولڈ مڈل کے حقدار بنے۔ اس طرح درس نظامی کی تعلیم انھوں نے آٹھ سال (۱۹۳۲۔۱۹۳۹ء) میں مکمل کرلی۔ اس کے بعد دو ڈھائی سال پرایوٹ طور پر انگریزی، حساب، تاریخ، جغرافیہ پڑھ کر ۱۹۴۲ میں وہ مسلم ہائی اسکول پٹنہ میں میٹرک کی کلاس میں داخل ہوئے۔ پٹنہ یونیورسٹی سے ہائی اسکول کرکے ۱۹۴۳ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں انھوں نے داخلہ لیا، جہاں سے ۱۹۴۵ء میں انٹر، ۱۹۴۷ء میں بی اے اور ۱۹۴۹ میں ام اے کے امتحانات میں کامیابی حاصل کی۔ ام اے (عربی) میں وہ اول آئے۔ علامہ عبد العزیز میمن کی نگرانی میں انھوں نے اپنا تحقیقی کام شروع کیا اور ایک سال گیارہ مہینے ہی میں پی ایچ۔ڈی کا کام انھوں نے مکمل کرلیا۔

اس دوران میں انھوں نے تعلیم کے مختلف مرحلوں سے گزرتے ہوئے اردو، فارسی اور عربی میں اتنی صلاحیت اور نظر پیدا کرلی تھی کہ ۱۹۴۷ میں پروفیسر رشید احمد صدیقی صاحب نے انھیں علی گڑھ میگزین کا اڈیٹر مقرر کردیا۔ انھوں نے ۱۹۴۸۴۹ء میں علی گڑھ کا ایک بلند پایہ اور معیاری عام نمبر شائع کیا جسے ملک میں عام طور پر بہت پسند کیا گیا۔ پھر کچھ ہی دنوں کے بعد میگزین کا ایک شاندار اور مفید ''غالب نمبر'' نکالنے میں نمایاں کامیابی حاصل کی اور وہ محققین غالب کی صف میں نظر آنے لگے۔ یہ شمارہ ۳۴۲ صفحات پر پھیلا ہوا ہے اور اس میں ہندوستان اور پاکستان کے مشاہیر اہل قلم کے مضامین شائع ہوئے ہیں۔ اس میں غالب کے چند نادر خطوط کے عکس پہلی مرتبہ دیکھنے میں آئے آخر میں غالب کے بہت سے غیر مطبوعہ خطوط اور نادر تحریریں شائع کی گئی ہیں۔

اس نمبر کے شذرات کے مطالعہ سے ہی ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب کی تحقیقی صلاحیتوں اور غالب سے ان کی گہری دلچسپی کا پتا چلتا ہے اور وہ مستقبل کے معتبر محقق اور ماہر غالب کی حیثیت سے ابھرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ ملاحظہ کیجئے تقریباً پچیس سال کے نوجوان مختار الدین احمد صاحب شذرات میں رقم طراز ہیں:

(۱) ''غالب ہماری زبان کے خوش نصیب شاعروں میں ہیں

Marfat.com

ان کی تصانیف نثر ان کی زندگی میں ہی متعدد بار شائع ہوئیں ، فارسی و اردو دواوین کے بھی ان کے سامنے کئی ایڈیشن نکلے اس کے بعد آج تک معلوم نہیں کتنی بار اُن کی کتابیں چھپیں ۔تصانیف کی اشاعت سے قطع نظر ان پر اب تک جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں اردو کے کسی مصنف یا شاعر پر نہیں لکھی گئیں ۔''

(۲) ''غالب کی سلسلے میں بہت کچھ کام ہوا ہے لیکن ابھی بہت کچھ باقی ہے ان کے خاندانی معاملات کی تحقیق کرنی ہے وہ اپنا سلسلہ ترسم خاں وغیرہ سے ملاتے ہیں دیکھنا یہ ہے کہ یہ کس حد تک صحیح ہے ان کے عہد طفلی اور عنفوانِ شباب کے حالات بہت کم ملتے ہیں ، اس زمانے کے حالات جو کچھ تذکروں میں اور اُن کے خطوط میں مل جاتے ہیں وہ بالکل تشنہ ہین ۔ اکبر آباد کے دوران قیام کے حالات کے علاوہ میرزا کی زندگی کے اور بھی بہت سے گوشے تاریکی میں ہیں ان پر روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے .....''

(۳) '' .....اُن کی ساری تصانیف کے تنقیدی اڈیشن شائع کرنے ہیں ،ان کی تصانیف کی اولین اشاعتوں کا پتہ چلانا ہے ۔''سبد چیں '' اور ''نامۂ غالب'' کا صرف ایک نسخہ دنیا میں ہے ، (بعد کو اور چند نسخے مکشوف ہوئے) ''باغ دودر''، آج تک کہیں نہیں چھپی اس کی صرف ایک قلمی نقل ایک صاحب کے پاس ہے جو فی الحال ایران میں ہیں .....''

(۴) '' قاطع برہان، درفش کاویانی ، ابر گہر بارسوالات عبد الکریم ، تیغ تیز، نکات غالب ، لطائف غیبی کے مطبوعہ نسخے بے حد نایاب ہیں ۔ ان ساری کتابوں کے مطبوعہ ایڈیشن اور ان کی قلمی نقلیں ڈھونڈنی ہیں اور انہیں صحیح متن اور تفصیلی مقدمے اور کارآمد حواشی کے ساتھ شائع کرنے کی ضرورت ہے ۔''

(۵) '' غالب کے تلامذہ ، اُن سے تعلق رکھنے والوں ، اور اُن کے خطوط کے مکتوب الیہوں کے حالات تلاش کرنے ہیں ان سبھوں کی

Marfat.com

تصانیف بھی ایک جگہ جمع کرنی ہے۔"

(۲)"نوادر غالب کے نام سے ایک ایسا ہی مجموعہ راقم الحروف کے زیر ترتیب ہے"..... اس مجموعے میں خطوط کے علاوہ دوسرے نثری نمونے اور منظومات بھی ہوں گے۔"

(۲) " ان کی تصویروں کے جمع کرنے کا کام بھی بے حد اہمیت رکھتا ہے۔" وغیرہ وغیرہ

بلاشبہ شذرات کا ہر لفظ جو آج سے نصف صدی پہلے لکھا گیا ان کے مستقبل میں غالب شناس اور معتبر محقق ہونے کی طرف اشارہ کررہا ہے اور آج جب ہم ان کے ماضی کے علمی و ادبی فتوحات پر نظر ڈالتے ہیں تو ان کا مرتب کردہ علی گڑھ میگزین، اس کا "غالب نمبر"، "نقد غالب اور "احوال غالب" کے ساتھ مسکراتا ہوا سامنے آجاتا ہے۔

اس مسئلے میں کوئی دو رائے نہیں ہے کہ ڈاکٹر مختار الدین احمد نے نہایت لگن اور خاموشی کے ساتھ تحقیق کے خار زار کو عبور کیا ہے اور اپنے تحقیقی نتائج سے اردو ادب کے خزانے کو مالا مال کیا لیکن انھوں نے اپنی علمی فتوحات کے ذکر سے ہمیشہ اجتناب کیا، بس خاموشی کے ساتھ اپنا کام کرتے رہے۔ وہ نام و نمود سے دور خود تحقیقی کاموں میں الجھے رہے اور تحقیقی مسائل سلجھاتے رہے، اور تحقیقی کام کرنے والوں کے ساتھ تعاون اور نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرتے رہے۔ اُن کی کتابوں کی فہرست تو عام طور سے مل جاتی ہے لیکن یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ ان کے مضامین جو مختلف رسائل میں شائع ہوئے ہیں اُن کی تفصیل اب تک سامنے نہیں آسکی ہے۔ میرا قیاس ہے کہ انھوں نے مختلف موضوعات پر چارسو سے کیا کم مضامین لکھے ہوں گے، کوئی دوسرا ہوتا تو وہ اپنے مضامین کے متعدد مجموعے اب تک شائع کرا چکا ہوتا۔ لیکن اب تک جب کہ ان کی عمر ۸۰ سال کے قریب ہے اور وہ کوئی ۶۰۔۶۵ سال سے پڑھنے لکھنے کے کام میں مصروف ہیں، وہ اپنے مضامین کا ایک مجموعہ بھی شائع کرانے پر آمادہ نہیں ہوئے۔ احباب اور ناشروں کے اصرار پر انہوں نے ہمیشہ یہی عذر کیا کہ مضامین نظر ثانی کے محتاج ہیں اور نظر ثانی اور حکّ و اصلاح، حذف و اضافہ کا انھیں وقت نہیں ملتا کہ وہ ہمیشہ عربی و فارسی و اردو کے ادب کی نئی نئی وادیوں میں گھومتے رہتے ہیں۔

Marfat.com

جہاں تک غالب سے متعلق ان کے مضامین کا تعلق ہے اُن کی تفصیل بھی کہیں یکجا نہیں ملتی ۔ مجھے اب تک ان کے غالب سے متعلق ان مضامین کا علم غالب سے متعلق اشاریوں کی مدد سے ہوسکا ہے۔

۱۔ غالب کی تاریخ گوئی	ادبی دنیا لاہور مارچ	۱۹۴۰ء
۲۔ مرزا غالب کا کچھ نایاب کلام	ادبی دنیا لاہور سالنامہ	۱۹۴۱ء
۳۔ نوادر غالب	غالب نمبر علی گڑھ میگزین	۴۹۔۱۹۴۸ء
۴۔ نوادر غالب۔ غالب کے تین خط، ظفر کی غزل پر تضمین	آجکل دہلی جون	۱۹۵۰ء
۵۔ غالب اور مفتی میر محمد عباس	آجکل دہلی اگست	۱۹۵۱ء
۶۔ غالب کا ایک غیر مطبوعہ خط اور چند اصلاحیں	آجکل دہلی فروری	۱۹۵۲ء
۷۔ مرزا غالب کی تصویریں	آجکل دہلی فروری	۱۹۵۲ء
۸۔ غالب کے چند نایاب خطوط (بنام سید فرزند احمد صفیر بلگرامی)	نگار لکھنؤ جولائی	۱۹۵۲ء
۹۔ غالب کا غیر مطبوعہ فارسی مکتوب	اردو ادب علی گڑھ جولائی، دسمبر	۱۹۵۲ء
۱۰۔ غالب کا قدیم ترین مکتوب	ہمایوں لاہور سالنامہ	۱۹۵۳ء
۱۱۔ غالب سے ایک ملاقات عزیز الدین عزیز لکھنوی کے ساتھ	ماہ نو کراچی فروری	۱۹۵۳ء
۱۲۔ مرزا غالب سے ایک ملاقات ریاض الدین امجد (مولف سیر دہلی) کے ساتھ	آجکل دہلی فروری	۱۹۵۳ء
۱۳۔ غالب کا ایک غیر مطبوعہ خط اور چند اصلاحیں	آجکل دہلی فروری	۱۹۵۵ء
۱۴۔ مرزا غالب کی مہر	آجکل دہلی فروری	۱۹۵۶ء
۱۵۔ در مدح غالب می گوید	ہماری زبان علی گڑھ	۱۵ جون ۱۹۵۷ء
۱۶۔ فغان بے خبر میں غالب کا ذکر	آجکل دہلی فروری	۱۹۵۸ء
۱۷۔ مرزا غالب کی ایک اردو تقریظ	ہماری زبان ۱۵ فروری	۱۹۶۷ء
۱۸۔ غالب کے خطوط ایک قدیم مجموعے میں	آجکل دہلی مارچ	۱۹۶۷ء

Marfat.com

۱۹۔ آثار غالب: علی گڑھ میں غالب کی تحریریں تصویریں اور دوسرے نوادر	علی گڑھ میگزین غالب نمبر	۱۹۶۹ء
۲۰۔ حضرت غوث علی شاہ قلندر کی رند بلانوش سے ملاقات	شبستان دہلی، غالب نمبر	۱۹۶۹ء
۲۱۔ غالب کے آٹھ خط	نقوش لاہور مکاتیب نمبر حصہ اول	۱۹۵۷
۲۲۔غالب کی تصویریں	آئینہ غالب، احوال غالب دہلی	۱۹۵۳ء
۲۳۔سرِّ غالب در حدیث دیگراں	احوال غالب دہلی	۱۹۵۳ء
۲۴۔غالب کی ایک غیر مطبوعہ تحریر	اردوئے معلیٰ دہلی غالب نمبر حصہ دوم	فروری ۱۹۶۵ء

غالب سے متعلق مختار الدین احمد صاحب کی یہ تحریریں غالب نمبروں، رسائل کے عام اور خاص شماروں اور کتابوں میں شائع ہوئی ہیں۔ موضوعات کے تنوع ہی سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے علی گڑھ میگزین کے غالب نمبر کے شذرات میں غالب سے متعلق جن پہلوؤں پر کام کرنے کا اشارہ کیا تھا، اُن پر وہ خود کام کرتے رہے اور غالب سے متعلق حقائق سامنے لاتے رہے ہیں۔

کاش کوئی صاحب ان کی تمام تحریروں کی جو مختلف رسائل و کتب میں شائع ہوئی ہیں مکمل فہرست تیار کر دیں تو اس سے اُردو میں تحقیق کرنے والوں کی بڑی رہنمائی ہوگی خاص طور سے محققین غالب اس سے زیادہ فیض یاب ہو سکیں گے۔

اس طرح اردو کے تحقیقی خزانے میں اضافہ بھی ہوگا اور ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب کی خدمات کا بہت توجہ سے جائزہ لیا جا سکے گا جس کی بے حد ضرورت ہے۔

☆☆☆

Marfat.com

پروفیسر عبدالغفار شکیل
سابق صدر شعبۂ لسانیات مسلم یونیورسٹی

پروفیسر مختار الدین احمد

(منفرد مزاج و منہاج کی تصویر و تفسیر)

پروفیسر مختار الدین احمد ایک منفرد مزاج و منہاج کی تصویر ہیں علامہ اقبال کا یہ شعر ذرا سے تصرف کے ساتھ اُن کی شخصیت و سیرت، مزاج و منہاج پر صادق آتا ہے۔

انجمن میں بھی میسّر رہی خلوت جن کو
شمع محفل کی طرح سب سے جدا سب کے رفیق

نہایت کم گفتار، حد درجہ وضع دار، خلیق و نستعلیق، ملنسار، نیک کردار، مشرقی اقدار کے حامل انسان، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ عربی کے لکچرر، ریڈر، پروفیسر اور صدر شعبہ، مسلم یونیورسٹی کی آرٹس فیکلٹی کے ڈین، علی گڑھ کی علمی و تحقیقی روایات کے امین وعلمبردار، معتبر محقق و ادیب، ماہر غالبیات، سرسیدؒ کے شیدائی وفدائی، اکبر الہ آبادی کے معتقد، قاضی عبد الودود، حافظ محمود شیرانی، ڈاکٹر عبد الستار صدیقی اور مولانا امتیاز علی عرشی جیسے مشہور و معروف محققین کے نقش قدم پر چلنے والے راہی، کئی کتابوں کے مصنف ومؤلف، اَن گنت عربی، اردو اور کچھ انگریزی مضامین کے خالق، ہندو پاک کے علاوہ انگلستان اور متعدد عرب ممالک میں اپنے علمی و تحقیقی کارناموں پر انعامات، اعزازات اور شہرت پانے والے پروفیسر مختار الدین احمد ایک لایق و فائق اور قابل احترام شخصیت ہیں۔

راقم الحروف کی موصوف سے پہلی ملاقات ۱۹۵۲ میں لٹن لائبریری میں ہوئی جہاں وہ شعبۂ مخطوطات کے نگراں تھے۔ اُن دنوں میں شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی میں ایم اے کا طالب علم تھا، ڈاکٹر ذاکر حسین وائس چانسلر تھے اور پروفیسر رشید احمد صدیقی شعبۂ اردو کے صدر۔ دونوں حضرات مختار الدین احمد صاحب کی علمی لیاقت، کام کرنے کی لگن، ذوقِ تحقیق کے قدرداں تھے۔

پروفیسر موصوف سے جب میری پہلی ملاقات ہوئی تو وہ اُن کا عالمِ شباب تھا،

Marfat.com

چہرے پر سیاہ ڈاڑھی اور سر پر لمبے سیاہ بال تھے جو عمر کے ساتھ ساتھ گنگا جمنی ہوتے ہوتے اب بالکل سفید ہوگئے ہیں بزرگی اور بڑائی کے نشانِ امتیاز بن کر۔ پہلی ہی ملاقات میں میں پروفیسر مختارالدین احمد کی نرم گفتگو، ہمدردانہ رویّے سے متاثر ہوا۔ آپ نے علی گڑھ میں تعلیم پانے کے میرے شوق کی بڑی حوصلہ افزائی کی۔ شعبۂ اردو میں خلیل الرحمٰن اعظمی مرحوم اُن دنوں ریسرچ کے طالب علم تھے اور پروفیسر مختارالدین کے نہایت گہرے دوست۔ ۱۹۵۳ء تک میں اِن دونوں حضرات سے اپنی تعلیم کے دوران ملتا رہا۔ عمر میں مجھ سے کچھ بڑے ہونے کی وجہ سے کبھی ان سے بے تکلف نہ ہوا اگرچہ دونوں نے مجھے اپنے برابر کا ہی سمجھا۔

میری خوش قسمتی کہ ۱۹۵۸ء میں شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں میرا تقرر بہ حیثیت لکچرر ہوگیا۔ پروفیسر مختارالدین احمد نے میرے تقرر پر مبارکباد دی اور بڑی خوشی کا اظہار کیا اُس کے بعد سے لے کر موصوف سے میرے مراسم بڑھتے ہی چلے گئے۔ اتفاق سے مجھے جو یونیورسٹی کوارٹر (۵۔حالی روڈ) ملا تھا وہ وہی تھا جس میں آپ اور خلیل الرحمٰن اعظمی چند برس رہ چکے تھے۔ شعبۂ عربی اس کوارٹر سے بس چند قدم کے فاصلے پر تھا، میں اکثر اپنے فرصت کے اوقات میں پروفیسر مختارالدین احمد کے پاس ان کے شعبے چلا جاتا۔ پروفیسر عبدالعلیم ۱۹۶۸ء میں جب وائس چانسلر مقرر ہوئے تو مختارالدین احمدان کی جگہ شعبۂ عربی کے پروفیسر اور چیرمین ہوئے۔ جب کبھی میں اُن سے ملنے جاتا تھا تو اُن کے چیمبر کی بڑی میز پر بے شمار کتابیں فایلیں رسالے اور خطوط کے انبار دیکھتا۔ اپنے خالی اوقات میں پروفیسر مختار الدین کے دو ہی دلچسپ مشغلے ہوتے تھے مطالعۂ کتب یا تحریری کام۔ کبھی ملنے والے آجاتے تو چائے سے تواضع ہوتی اور بیشتر علمی باتیں ہوتیں۔ میری تحقیقی لگن اور اُس کے نتیجے میں شائع شدہ کتابوں اور مضامین کی پروفیسر موصوف بڑی تعریف کرتے، اس سے میری حوصلہ افزائی ہوتی۔ یہ رویّہ موصوف کا تقریباً ہر طالب علم اور رفیق کار کے ساتھ ہوتا تھا۔

اپنے شعبۂ عربی و اسلامیات کی لائبریری کے علاوہ پروفیسر مختار الدین احمد، مولانا آزاد لائبریری بھی اکثر آیا کرتے تھے جہاں میری اُن سے ملاقات اگرچہ مختصر سی ہوتی مگر اس ملاقات میں بھی وہ کسی مصنف یا کسی کتاب کے بارے میں مجھ سے پوچھ لیتے کہ کیا میں نے فلاں کتاب یا فلاں تحریر لائبریری میں پڑھی ہے۔ وہ جدید مصنفین کے بارے میں بھی اپنے معلومات تازہ رکھتے تھے۔ وہ اکثر مجھے مشورہ دیتے کہ لسانیات کے

Marfat.com

ساتھ ساتھ دوسرے موضوعات کا بھی مطالعہ کرتے رہیے۔

وقت کا دھارا آگے بڑھتا رہا پروفیسر مختار الدین احمد سے روابط بھی بڑھتے رہے۔ اتفاق سے ۵۔شبلی روڈ جہاں وہ اب ریڈر ہونے کے بعد مقیم تھے میری رہائش گاہ ۵۔حالی روڈ سے کچھ زیادہ دور نہیں تھی کبھی کبھی میرے ساتھ میری اہلیہ بھی اُن کے یہاں جایا کرتیں۔ میں مختارالدین احمد سے مصروف گفتگو رہتا اور میری اہلیہ اُن کی بیگم صاحبہ سے باتیں کرتی رہتیں ۔موصوف کے اور ہمارے بچوں میں بھی کچھ کچھ شناسائی ہوگئی پھر تو جب بھی ملاقات کی سبیل نکلتی میں بے تکلف آپ کے ہاں چلا جایا کرتا۔

پروفیسر مختار الدین احمد کے قریبی دوستوں اور مداحوں میں پروفیسر مسعود حسین (میرے استاد) کے علاوہ پروفیسر خلیق احمد نظامی پروفیسر اسلوب احمد انصاری، پروفیسر مسعود الحسن، پروفیسر نذیر احمد، پروفیسر ریاض الرحمٰن خاں شروانی رہے ہیں جن سے مجھے بھی نیاز حاصل رہا بلکہ اِن سب نے میرے کاموں اور محنت کی بڑی قدر اور حوصلہ افزائی کی۔علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی یہ وہ ہستیاں ہیں جنھوں نے اپنے اپنے دائروں میں علم و تحقیق کی شمعیں جلائیں اور نہ معلوم کتنوں نے اِن سے روشنی پائی اور اپنی زندگی کی راہیں روشن کیں۔

پروفیسر موصوف درج بالا ہستیوں کے مُداح، اور مخلص دوست ہیں۔کبھی کبھی وہ اُن کے ہاں جاتے کبھی کبھی وہ موصوف کے ہاں آیا کرتے اس طرح میرے لیے بھی کبھی کبھی اِن قابلِ احترام ہستیوں کی صحبت سے فیض پانے کی سبیل نکل آتی۔ میں نے بھی اِن مقتدر ہستیوں سے بہت کچھ سیکھا اور اپنا بھی ایک الگ مزاج بنایا۔پروفیسر مختار الدین سے میں نے یہ سیکھا کہ جو کام کیا جائے سلیقے سے کیا جائے، محنت اور لگن سے کیا جائے۔ تحقیق کی گہرائیوں میں گئے بغیر وہ کبھی اپنے قلم اور قدم کو حرکت میں نہیں لاتے تھے۔ غالبیات کے علاوہ آپ نے سرسید کی بعض نایاب تحریروں کی بازیافت کی۔اکبرالہ آبادی کے خطوط ڈھونڈ کر منظر عام پر لائے۔علی گڑھ اور دوسرے مقامات کی لائبریریوں کے اہم مخطوطات پر مضامین شائع کیے۔ اپنے جگری دوست مالک رام صاحب کے اشتراک سے فضلی کی ''کربل کتھا'' کو اردو دنیا کے سامنے پیش کر کے خراج تحسین حاصل کیا۔آپ نے کئی اہم شخصیتوں کے بڑے دلچسپ خاکے تحریر کیے اُن سے آپ کے مراسم اور اُن سے تعلقات کا علم ہوتا ہے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق، ڈاکٹر ضیاء الدین احمد، مالک رام، قاضی عبدالودود، پروفیسر ابواللیث صدیقی، سید نورالحسن ہاشمی، محمد طفیل، جمیل الدین عالی، حمیدہ آپا،

Marfat.com

پروفیسر مسعود حسین خاں، پروفیسر نظیر صدیقی، پروفیسر سید محمد حسنین پر آپ کے مضامین آپ کی شگفتہ اسلوبی اور دلچسپ حقائق کی بنا پر ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھے جائیں گے۔

مالک رام صاحب کا تذکرہ آ گیا تو ایک بات یاد آ گئی ۔ میرا ایک مضمون ''مولانا ابوالکلام آزاد کے بڑے بھائی مولانا ابونصر آہ پر ۱۹۶۲ء میں رسالہ'' آج کل'' دہلی میں شائع ہوا تھا جس میں میں نے پہلی بار مولانا آہ پر ایک مضمون اور اُن کے مضامین کے عنوانات اور اُن کے چند دستیاب شدہ اشعار چھپوائے تھے ۔ مالک رام صاحب نے اس مضمون کو پڑھا تھا اور وہ اس موضوع پر مزید کچھ کام کرنے کا ارادہ رکھتے تھے ۔ پروفیسر مختارالدین احمد سے مالک رام صاحب نے میرے مضمون کا ذکر کیا اور اُنھیں جب یہ معلوم ہوا کہ میں علی گڑھ ہی میں ہوں تو مختارالدین احمد صاحب سے اُنھوں نے اصرار کیا کہ وہ مجھ سے ملائیں چنانچہ دونوں حضرات میری رہائش گاہ ۵۔ حالی روڈ پر آئے۔ مالک رام صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ مولانا آہ کے بارے میں جو معلومات لٹن لائبریری میں موجود قدیم رسالے ''خدنگ نظر'' سے حاصل ہوئی تھیں وہ اسے دیکھنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ دوسرے دن ہم دونوں لائبریری گئے مگر بدقسمتی سے وہ رسالہ نہ ملا اول تو وہ نہایت قدیم اور بوسیدہ تھا کسی نے اس قابل نہیں سمجھا کہ محفوظ رکھا جائے ۔ مالک رام برابر مختار الدین احمد سے اس سلسلے میں مزید مواد حاصل کرنے کی لئے کہلواتے رہے۔ وہ بھی دھن کے پکے تھے دہلی میں یا کسی اور جگہ سے اُنھیں کافی مواد ملا پھر اُنھوں نے اپنے رسالے ''تحریر'' میں ایک طویل مضمون ابوالنصر آہ پر سپرد قلم کیا۔

پروفیسر مختارالدین احمد صحیح معنوں میں اسکالر ہیں ۔ وظیفہ یاب ہونے کے بعد بھی اُن کی علمی و تحقیقی لگن میں کوئی کمی نہیں آئی ۔ اپنی ملازمت کے زمانے میں وہ جامعہ اردو کے نائب شیخ الجامعہ ہوئے ۱۹۹۸ء میں مولانا مظہر الحق عربی و فارسی یونیورسٹی کے پہلے وائس چانسلر بنائے گئے مگر اُن کے مزاج و منہاج اور ذوق علم و تحقیق میں فرق نہ آیا۔ مسلسل محنت اور وسیع مطالعے نے آپ نے کی صحت پر بھی اثر ڈالا مگر آپ نے اپنی رہ نوردی جاری رکھی ۔ آپ کے علمی و تحقیقی کاموں کی خاطر خواہ پذیرائی ہوئی ہندو پاک میں بھی ، اسلامی ممالک میں بھی اور انگلستان میں بھی۔ ۱۹۷۹ء میں صدر جمہوریۂ ہند نے عربی زبان و ادب میں اُن کے علمی و تحقیقی کارناموں کی قدر کرتے ہوئے انھیں سرٹی فیکیٹ آف آنر سے نوازا۔ آپ کی متعدد کتابیں اور مضامین اہل علم و تحقیق سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں ۔

نجی زندگی میں پروفیسر مختار الدین احمد اپنے اہل و عیال سے محبت و شفقت

Marfat.com

کرنے والے، دوستوں کے حد درجہ خیر خواہ، ایک دلنواز اور ایک مشفق باپ کی حیثیت سے اُن کا گھر والوں سے حسن سلوک، اُن کے جذبات محبت و شفقت کا بہترین غماز ہے۔ راقم الحروف نے کبھی انہیں اپنے بچوں اور عزیزوں کی شکایت کرتے ہوئے نہیں سنا۔ نہ ان پر کبھی ناراض ہوتے ہوئے انھیں دیکھا۔ گھر کے چھوٹے بچوں کے وہ خاص طور پر بہت مانوس ہیں۔ وہ ان پر بہت شفقت فرماتے ہیں، اُن کی موجودگی میں خوش رہتے ہیں اور انھیں لطیفے سنا کر اور ان سے محبت سے باتیں کر کے انہیں خوش رکھتے ہیں۔

علی گڑھ میں مختار الدین احمد سے میری ملاقاتوں اور باتوں کی داستان طویل ہے جی تو چاہتا ہے اور بہت سے باتیں لکھوں مگر میرے دوست مکرم مہرالٰہی کی ہدایت ہے کہ مضمون مختصر ہو۔ ایسی عظیم ہستی پر چند صفحات پر مشتمل مضمون تو تشنہ ہی رہے گا۔ میری دعا ہے کہ پروفیسر مختار الدین احمد کو اللہ تعالیٰ مع اُن کے اہلِ وعیال صحت، مسرت، راحت اور سکون سے ہمکنار رکھے اور وہ اپنے علم و قلم سے نہ صرف اپنی دنیا آباد رکھیں بلکہ حسب معمول دوسروں کو بھی علمی و تحقیقی کاموں کی طرف مائل ہونے کی دعوت دیتے رہیں تاکہ وہ بھی پروفیسر موصوف کی اتباع میں منفرد مزاج و منہاج کی تصویر و تفسیر بن کر دوسروں کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوں۔

☆☆☆

Marfat.com

ڈاکٹر سید امین اشرف
سابق استاد شعبۂ انگریزی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

آرزو صاحب میری نظر میں

پروفیسر مختار الدین آرزو صاحب کو پہلے پہل میں نے ایس ایس ہال کے ہوسٹل ۵۷۔ایس ایس ویسٹ میں دیکھا جس میں پہلے مولانا عبد العزیز میمن صدر شعبۂ عربی تشریف فرما ہوتے تھے ۔ یہی ان کا دفتر تھا اور اس میں وہ اپنی کلاسیں لیتے تھے ۔ قاعات العربیہ ، ملا طاہر سیف الدین صاحب کے بنوائے ہوئے کمرے اس سے متصل تھے جہاں عربی کی کلاسیں ہوا کرتی تھیں۔ ذاکر صاحب کے عہد میں شعبۂ عربی، عثمانیہ ہوسٹل کی بالائی منزل پر چلا گیا جہاں اس زمانے میں جغرافیہ اور انگریزی کے ساتھ ہندی اور سنسکرت کے شعبے واقع تھے ۔ قاعات العربیہ کے سارے کمرے نئے قائم شدہ شعبے کامرس کو دے دئے گئے ۔ ۵۷ ایس ایس ویسٹ جو صدر شعبۂ عربی کا کمرہ تھا، ایس ایس ہال کو واپس مل گیا ۔ اس ۔ام ۔شفیع صاحب جو شعبۂ کامرس کے صدر مقرر کیے گئے تھے، ایس ایس ہال کے پرووسٹ بھی تھے، جنھیں اس بات کا بیحد شوق تھا کہ ممتاز طلبا اور یونیورسٹی پوسٹ ہولڈرز زیادہ سے زیادہ تعداد میں ان کے ہال میں اقامت پذیر ہوں ۔ ہاکی اور کریکٹ کے کپتان پہلے سے ایس ایس ہال میں تھے ، اب شفیع صاحب کی توجہ و ترغیب سے سید شاہ حسن عطا اور مختار الدین احمد آرزو بھی اسی ہال میں آ گئے ۔ یہ دونوں یونیورسٹی پوسٹ ہولڈر تھے ، شاہ صاحب یونین کے وایس پریسڈنٹ تھے اور آرزو صاحب کو رشید احمد صدیقی صاحب نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میگزین کا اڈیٹر مقرر کیا تھا۔

میری زندگی چوں کہ زیادہ تر مٹر گشتی میں گزری اس لیے بار بار اس سڑک پر گزرتا رہا ہوں جس کے ایک سرے پر اس ایس ہال کا ڈائننگ ہال، درمیان میں وکٹوریہ گیٹ اور آخری سرے پر کامرس ڈیپارٹمنٹ واقع تھا ۔ایک وجہ ادھر سے گزرنے کی یہ بھی تھی کہ ایس ایس ہال سے این آر ایس سی (غیر مقیم طلبا کے ہال) کا پرووسٹ آفس بہت قریب تھا ، اور آج بھی ہے۔ بہر حال جب بھی اس راستے سے گزرتا تو اس سڑک پر واقع

Marfat.com

ایس ایس ویسٹ کے آخری کمرے کے بیک روم میں طویل دریچے کے پاس ہمیشہ ایک طالب علم کو کتاب کے مطالعے میں غرق پاتا۔ وہ دن کی روشنی میں میں بھی ٹیبل لیمپ جلا کر کمرے میں پڑھا کرتے تھے۔ ایک بار میرے ماموں زاد بھائی سید حسن ثنیٰ انور جو مجھ سے ایک آدھ سال سینئر تھے، میرے ساتھ تھے، جب اس کمرے کے پاس پہنچا تو وہ صاحب حسب دستور محو مطالعہ تھے۔ میں نے بھائی سے پوچھا کہ یہ کون صاحب ہیں جو ہمہ وقت لکھتے پڑھتے رہتے ہیں، آخر کس مقابلے کے امتحان کی تیاری میں مصروف ہیں۔ انھوں نے دریچے کی طرف نظر اٹھاتے ہوئے کہا یہ ملک العلماء کے صاحبزادے ہیں اور عربی میں ریسرچ کر رہے ہیں۔

میں ذرا ''ملک العلما'' کی وضاحت کرتا چلوں۔ میرے ماموں کا نام تھا سید محمد محدث کچھوچھویؒ، زبردست عالم اور بہترین مقرر تھے۔ عقلیات ونقلیات خصوصاً حدیث پر انہیں عبور حاصل تھا۔ بہت سے لوگ تو ان کے نام تک سے ناواقف تھے انھیں صرف ''محدّث صاحب'' کے نام سے جانتے تھے۔ گو کہ ان کا تعلق اہلسنت والجماعت سے تھا مگر اس پائے کے عالم تھے کہ ان کی وفات پر احتراماً دارالعلوم دیوبند میں ایک دن کے لیے چھٹی کا اعلان کر دیا گیا تھا اور ان کے بیٹے سید حسن ثنیٰ کو تعزیتی قرار داد بھیجی گئی تھی۔ اس سے جہاں ایک طرف سید محمد محدّث کچھوچھوی کے علمی مرتبت کا اندازہ ہوتا ہے وہیں دوسری طرف علمائے دیوبند کی فراخدلی کا بھی۔ یہی صورت کم وبیش ملک العلماء کی تھی۔ محدّث صاحب اور دوسرے علما کی زبان سے میں نے ان کا اصلی نام مولانا شاہ ظفرالدین قادری لیتے کبھی نہیں سنا۔ ملک العلماء کا لفظ زبان زدِ خاص وعام تھا۔ حضرت مولانا ظفرالدین صاحب قادری، اپنے زمانے کے جید علماء میں تھے، تقریر وتحریر دونوں پر کامل عبور تھا۔ ان کی تصانیف کی تعداد سینکڑوں تک پہنچتی ہے اور تلامذہ و مستفیضین کی ہزاروں تک۔ محدّث اعظم اور ملک العلماء دونوں ہم عصر تھے اور پرانے دوست۔ دینی مجالس میں ایک دوسرے سے ملاقاتیں رہیں اور مابین کثرت سے خط وکتابت۔ دونوں ایک دوسرے کا غایت درجہ احترام کرتے۔ ملک العلماء کبھی کبھی عرس میں کچھوچھہ تشریف لاتے اور محدّث صاحب ملک العلماء کی دعوت پر دینی مجالس میں تقریر و وعظ وارشاد کے لیے اکثر بہار کا سفر کرتے۔ بھاگلپور اور پورنیہ میں ان کے مسترشدین کا حلقہ وسیع تھا، جب بھی اس طرف

Marfat.com

جانا ہوتا تو کوشش کرتے کہ ملک العلماء سے ملاقات ضرور ہو۔ اتنی محبت و مودت تھی ملک العلماء اور محدّث صاحب میں۔

کہا جاتا ہے کہ جو جیسا ہوتا ہے اسے ویسے ہی ساتھی مل جاتے ہیں۔ میں شعر و شاعری میں ڈوبا رہتا، رفتہ رفتہ جذبی صاحب، خلیل الرحمٰن اعظمی، جاوید کمال اور حنیف خان ناشاد سے قریب ہوتا گیا۔ خواہش ہوئی کہ مختار الدین احمد صاحب سے جو آرزو تخلص رکھتے ہیں ملا جائے اور ان سے شعر سنا جائے۔ یہ گرویدگی مجھے آرزو صاحب کے قریب لے گئی۔ میں نے یہ بھی سنا تھا کہ وہ خلیل صاحب کے دوستوں میں ہیں۔ ہر چند میں نے کبھی اُن کو خلیل صاحب کے ساتھ ٹہلتے نہیں دیکھا۔ غالباً یہ دونوں کے مزاج اور شخصیت کا فرق تھا۔ آرزو صاحب خاموش سنجیدہ اور متین ہم لوگ بے پروا لاأبالی اور ھنسوڑ۔ یہ سن کر کہ آرزو صاحب نے عربی میں ایم اے کیا ہے اور ماہر غالبیات بھی ہیں، ان سے بے تکلف ہونے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ میرے ماموں محدّث صاحب اکثر علی گڑھ آتے، قیام نواب عبدالصبور خاں شروانی کے ہاں ہوتا، آرزو صاحب محدّث صاحب سے عزیزانہ طور پر نہایت نیاز مندی اور عقیدت سے ملتے اور نواب صاحب کے یہاں محفلوں میں شریک ہوتے۔ سید ظہیر الدین علوی، ماریسن کورٹ میں محفل میلاد کا انعقاد کرتے تو سیرت نبوی کا وعظ ہوتا وہ محمد علی روڈ پر ہر سال عید میلاد النبی کے جلسے میں شرکت کے لیے بھی آتے۔ آرزو صاحب اُن سے ملنے ہر جگہ جاتے اور میں آرزو صاحب سے ان محفلوں میں نیاز حاصل کرتا۔ جھجک رفتہ رفتہ ختم ہو رہی تھی۔ ایک دن مجھ سے الگ ہو کر بولے کبھی میری قیامگاہ پر تشریف لائیے۔ اُس وقت آرزو صاحب ظہور وارڈ سے قریب ہی سرسید کے عہد کے بنائے ہوئے چار بنگلوں میں سے ایک ۵۔حالی روڈ پر رہتے تھے۔ مگر یہ پہلی ملاقات ہی ہمت شکن ثابت ہوئی۔ ہوا یہ کہ اُنھوں نے دور ہی سے مجھے آتے ہوئے دیکھ لیا اور دیکھ کر کہا ''خوش آمدید'' میں نے سمجھا کہ کسی سے کہہ رہے ہیں ''خوشامدی آ گیا'' میں ملول ہو گیا۔ آرزو صاحب ٹوٹ کر نہایت محبت سے ملے مگر مجھ پر سکتے کا عالم طاری تھا اور عجیب گومگو کی کیفیت تھی۔ ایک طرف تو خلوص و محبت کا اظہار، دوسری طرف خوشامدی کہنا، واللہ کیا منافقت ہے۔ میں نے سید حسن مثنیٰ سے ساری روداد سنائی تو انھوں نے کہا۔ اے بندۂ خدا خوشامدی کیوں کہیں گے، ''خوش آمدید'' کہا ہوگا۔ میں شرمندہ ہوا۔

Marfat.com

آرزو صاحب کا علمی و ادبی مرتبہ اور ان کی تحقیقی سرگرمیاں، فنی کاوشیں آسمان کی رفعتوں کو چھو رہی ہیں: نامور ادیب، لاثانی محقق، ماہر غالبیات عربی و فارسی کے مشہور اسکالر، ماہر مخطوطہ شناس، قابل قدر دانشور، مذہبیات کے تقابلی مطالعہ پر نظر رکھنے والے اور اسلامی تاریخ و واقعات کے پارکھ۔

علی گڑھ میں کسی شخصیت یا یونیورسٹی کے نامور استاد سے ملنے جایئے تو آواز آئے گی۔ ''ابھی آتے ہیں''۔ اس ''ابھی'' میں یقیناً آدھ گھنٹے کا نقصان ہے۔ آرزو صاحب جس لباس میں ہوں اور جس حال میں ہوں بغیر انتظار کرائے بلا تامل اندر سے باہر ملاقات کرنے آجائیں گے، خواہ ڈریسنگ گاؤں میں ہوں یا گھر کے معمولی کپڑوں میں۔ دوسری بات یہ ہے کہ وہ ہمیشہ مل کر خوش ہوتے ہیں، چہرے پر بشاشت آجاتی ہے، وقت کی کوئی قید نہیں، کوئی چاہے جب آئے جب تک بیٹھے۔ اس کے برعکس ایسا بھی ہوتا ہے کہ آپ کبھی کسی کے پاس دوپہر کو پہونچے تو تاثر یہ ملے گا کہ شخص مذکور کہہ رہا ہو کہ یہ بلا اس وقت سے کہاں آگئی، کیونکہ یہ کھانے، پینے یا قیلولہ کا وقت ہوتا ہے۔

آرزو صاحب کو یہ ہنر آتا ہے کہ مخاطب کی طبیعت اور مزاج کے مطابق موضوع کا انتخاب کرتے ہیں۔ کوئی عالم دین ہے تو دین و مذہب کی باتیں، محقق قسم کا آدمی ہے تو مخطوطات اور نوادر کا ذکر ہوگا۔ ترقی پسند ادیب ہے تو اس سے سجاد ظہیر سے تعلقات، علی سردار جعفری سے اپنی پہلی ملاقات اور محمد حسن، وامق جونپوری اور پرویز شاہدی کا ذکر کریں گے۔ مخاطب اگر ادیب ہے تو ادب سے متعلق گفتگو ہوگی، کوئی سیاسی لیڈر ہے تو ملکی حالات پر تبصرے اور شاعر ہے تو اس سے اس کے تازہ شعر سننے کی فرمائش کریں گے اور ہم جیسوں سے ہلکی پھلکی باتیں کریں گے۔ گفتگو میں مزاح کی ہلکی سی چاشنی ہوتی ہے۔ وہ دوسروں کو ہنساتے ہیں مگر خود نہیں ہنستے۔ زیادہ سے زیادہ ایک خفیف سا تبسم زیر لب ہوتا ہے۔ میں نے انھیں قہقہہ لگاتے کبھی نہیں دیکھا۔ ممکن ہے کہ سنجیدہ محفل میں زور دار قہقہے کو ادب و تہذیب کے منافی سمجھتے ہوں۔ آرزو صاحب میں بڑی خوبی یہ ہے کہ کسی کی غیبت نہیں کرتے۔ یہ کمال کا وصف ہے۔ اس خصوصیت کو میں کمال سے اس لیے متصف کر رہا ہوں کہ یہ غیبت ہمارا دل پسند قومی کھاجا ہے۔ ایک واقعہ یاد آرہا ہے پروفیسر آل احمد سرور کے بڑے صاحب زادے محمد صدیق میرے کلاس فیلو ہیں۔ میں زمانۂ طالب علمی

Marfat.com

میں اُن سے ملنے ایک بار رابعہ منزل (بدر باغ) گیا۔ مجھ سے دس قدم آگے ڈاکٹر عبدالعلیم چل رہے تھے۔ علیم صاحب جیسے ہی سرور صاحب سے ملے اور الگ الگ کرسیوں پر بیٹھے تو علیم صاحب نے مسکرا کر کہا ''ضروری گفتگو کرنے کے بعد جو کچھ کرنا ہے آیئے اُسے پہلے ہی کرلیں''۔ حسد اور غیبت دونوں بڑے مہلک امراض ہیں۔ آرزو صاحب نہ غیبت پسند ہیں نہ حاسد، میرے اس خیال کی تصدیق دیوبند کے ایک عالم، شاعر، اور دانشور وارث ریاضی کے ایک خط مورخہ ۷/ جنوری ۲۰۰۳ سے ہوتی ہے۔ مجھے ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ''میں آرزو صاحب سے والہانہ عقیدت رکھتا ہوں۔ استادِ محترم حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند کے بعد اگر کوئی شخصیت مجھے نظر آتی ہے تو وہ آرزو صاحب کی شخصیت ہے۔ آرزو صاحب مدظلہ جتنے بڑے دانشور ہیں اُتنے ہی بڑے مخلص بھی۔ میں نے اُن کی محفل میں نہ کسی کی غیبت سنی نہ اُن کو اپنی برتری اور علمی تفوق کا اظہار کرتے دیکھا۔ یہ اوصاف علمی شخصیات میں بہت کم دیکھے جاتے ہیں۔''

آرزو صاحب سے جو بھی گفتگو کرتا ہے وہ اُس کا دل نہیں دکھاتے۔ وہ دل آزاری کو بڑا گناہ سمجھتے ہیں۔ کسی کی غلط اور ناحق بات کی تردید بھی اسطرح نہیں کرتے کہ مخاطب اپنی نظر میں خفیف ہوجائے۔ ایسا بھی نہیں کہ مخاطب کی ہر بات کو وہ تسلیم ہی کرلیں۔ ان کا اپنی بات کہنے اور اختلاف کرنے کا ایک خوبصورت اور مخصوص انداز ہے۔ چونکہ خلیق اور ملنسار ہیں اور نرم دمِ گفتگو اس لیے جب کوئی بات اُن کو مطمئن نہیں کرتی تو وہ اسطرح اختلاف کرتے ہیں ''غالباً یہ بات اس طرح ہے، یا شاید ایسا نہیں ہے۔ ہاں یہ بھی ایک پہلو ہے میں نے اس پر غور نہیں کیا تھا'' وغیرہ۔ گفتگو بھی ایک آرٹ ایک فن شریف ہے۔ وہ اونچی آواز میں بات نہیں کرتے۔ کوئی بات جو پسند خاطر نہو اس کے لیے نہ کوئی طنزیہ فقرہ استعمال کرتے ہیں نہ غصے اور جھنجھلاہٹ کا اظہار۔ اُن کی بات چیت میں عامیانہ اور سوقیانہ انداز کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ بات اس طرح شروع کرتے ہیں کہ سننے والے میں انہماک و اشتیاق پیدا ہو اور گفتگو بارِ سماعت نہ ہو۔ ان کی گفتگو میں لفاظی ہوتی

Marfat.com

ہے نہ نمائش نہ تصنع ، تاہم خوش سلیقگی کی وجہ سے پُرکشش ہوتی ہے۔ سچ ہے:

ع قبائے گل میں گل بوٹا کہاں ہے

وہ مخاطب کو بھی بولنے کا موقع دیتے ہیں ۔ وہ اسکی باتیں دل جمعی اور دل چسپی سے سنتے ہیں ۔ ہوسکتا ہے کہ طویل گفتگو ان کے علمی کاموں یا لکھنے پڑھنے میں حارج ہوتی ہو مگر ایسا کوئی ردِعمل ان کے چہرے سے ظاہر نہیں ہوتا ۔ اس معاملے میں ان میں بڑا ضبط و تحمل ہے ۔ ہوسکتا ہے کہ کسی کی گفتگو سے اُکتا بھی جاتے ہوں مگر اُٹھنے میں پہل نہیں کرتے اور بات کرنے والا اُٹھتا بھی ہے تو یہی کہتے ہیں کہ ''بیٹھیے ۔ بیٹھیے ابھی تو آپ سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔'' یا یہ کہ'' آپ تو بہت دنوں کے بعد آئے ہیں کچھ دیر اور بیٹھے بھئی اب ایک پیالی گرم چائے اور ہوجائے۔

چائے کا ذکر کیا آیا گویا دبستاں کھل گیا۔ ایک دن کہنے لگے ۔ اچھی چائے بنانا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ یہ بھی ایک فن ہے۔ چائے کے پانی ہی کو لیجئے۔ پانی نہ کم پکا ہوا ہو نہ زیادہ کھولتا ہوا ہو ۔ چائے دان میں پتی ڈال کر دم دینا ضروری ہے کتنی دیر تک ، یہ تجربہ سکھاتا ہے ۔ پتی زیادہ گل جانے سے بھی چائے بے مزہ ہوجاتی ہے ۔ شکر اور دودھ کی آمیزش کا صحیح توازن چائے کا لطف دوبالا کردیتی ہے۔ ایک زمانے میں لوپچوں چائے انہیں بے حد مرغوب تھی ۔ اس کا شوق انہیں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی مرحوم نے دلایا تھا ، پھر نہ جانے کیوں یہ چائے بازار سے غائب ہوگئی ۔ اب وہ مجبوراً چائے میں لپٹن کی گرین لیبل والی پتی کی آمیزش پسند کرتے ہیں اور اسی پر قناعت کرتے ہیں۔ آرزو صاحب کے چائے پینے کا بھی خاص انداز ہے ۔ ان کے ہونٹ چائے کی پیالی سے اس طرح مس ہوتے ہیں کہ پیالی نے چائے ختم ہونے تک اندازہ نہیں ہوتا کہ آیا وہ چائے پی بھی رہے ہیں یا نہیں ۔ چائے نوشی کا تقاضا یہ ہے کہ اس دوران گفتگو خوشگوار ہو ۔ چائے کی لطافت حساس طبیعتوں پر خوشگوار اثر چھوڑتی ہے۔ اس کا ارغوانی رنگ طبیعت میں سرور پیدا کرتا ہے۔ جن صاحبان کو آرزو صاحب کے چہرے پر یہ خوشگوار کیفیت دیکھنی ہو وہ اُن کے ساتھ چائے پی کر دیکھیں ۔ چائے کی خوش نما پیالیوں سے آرزو صاحب کے ذوق جمال کی غمازی ہوتی ہے۔

آرزو صاحب نے جب سگریٹ نوشی ترک کی تو پائپ اور سگار پینے لگے ،

Marfat.com

انگلستان میں انھوں نے سگریٹ بہت کم پی ۔ پائپ پینا انھوں نے وہیں شروع کیا ۔ کہتے تھے انگلستان کی ٹھنڈک میں پائپ سے کش لیتا تھا تو پورے جسم میں گرمی پیدا ہوجاتی تھی ۔ ہالینڈ اور جرمنی میں انھوں نے سگار شروع کیا ۔ انھیں ہالینڈ کا پائپ کا تمباکو انگلستان کے تمباکو سے زیادہ بہت پسند آیا ۔ وہ وہاں سے جرمنی جانے لگے تو ڈچ تمباکو کے کئی پوچ اپنے ساتھ لیتے گئے ۔ جب یہ اسٹاک ختم ہوگیا تو انھوں نے سگار پینا شروع کیا ۔ کہتے تھے ہوانا کے سگار بھی وہاں بآسانی مل جاتے تھے ۔ ان کی سگارنوشی ہندوستان میں عرصے تک جاری رہی ۔ ۱۹۶۰ء کے بعد تک پچاس سگار کا ڈبا سات روپے کو مل جاتا تھا ، بعد کو اس کی قیمت بتدریج پچیس تک پہنچ گئی ۔ ۱۹۶۵ء میں انھوں نے سگار پینا یک لخت اور اچانک چھوڑ دیا ۔ میں نے اسی زمانے میں ترک کی وجہ پوچھی انھوں نے کہا کوئی خاص بات نہیں ، ایک دن یکا یک خیال آیا یہ تمباکو نوشی جس فارم میں بھی ہو ٹھیک نہیں سوائے نقصان کے کسی قسم کا فائدہ نہیں ۔ میں نے پوچھا اتنی مدت کی عادت کو ترک کرتے ہوئے بہت تکلیف ہوئی ہوگی ۔ کہنے لگے بالکل نہیں ، لوگ عام طور پر سگریٹ وغیرہ آہستہ آہستہ چھوڑتے ہیں ، تعداد سگریٹوں کی کم کرتے جاتے ہیں ، میں نے یک لخت چھوڑ دیا ۔ صبح شعبہ گیا تو انگلیوں میں سگار سلک رہا تھا ، سہ پہر کو گھر واپس آیا ، شام کو سگارنوشی کے ترک کا عزم کیا ، چھوڑ دیا ۔ پھر کبھی اسے منہ نہیں لگایا ۔ اس بات کو آج چالیس سال ہوگئے ، ہر قسم کی تمباکو نوشی قطعاً ترک ہے ۔ یہ بھی آرزو صاحب کی سیرت کا ایک پہلو ہے اس سے انکی قوتِ ارادی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے ۔

ہاں چائے پینے کا شوق بدستور ہے ، اسے چھوڑنے کو تیار نہیں ۔ وہ چائے پینے پلانے کو فن کا درجہ دیتے ہیں ۔ اوکسفورڈ میں ایک جاپانی طالب علم سے ان کی دوستی ہوگئی ۔ وہ اس کے یہاں چائے کا اہتمام دیکھ کر بہت متاثر ہوئے ۔ وہ کہتے ہیں چائے کا سیٹ نفیس ہو پیالیاں ، پرچ خوبصورت ، سبک اور صاف شفاف ہونی چاہیے ۔ دھات کی بنی ہوئی پیالیاں اور تشتریاں انھیں مرغوب نہیں ، جرمن سلور یا اصلی چاندی ہی کی کیوں نہوں ۔

آرزو صاحب سے میرے کوئی نصف صدی کے تعلقات ہیں ۔ میں نے انھیں وسیع المشرب ، خوش اخلاق لیکن کم آمیز پایا ۔ انھیں اپنے دوستوں کا حلقہ وسیع کرنے کا کبھی شوق نہیں رہا ۔ وہ کہتے ہوئے سنے گئے ہیں کہ بھئی جن لوگوں سے تعلقات ہیں انھی

Marfat.com

سے آخر تک نباہ ہوجائے یہ بہت ہے۔ انٹرمیڈیٹ اور بی اے کی کلاسوں میں ان کے ساتھیوں میں تقسیم ہند سے پہلے پنجاب اور سندھ تک کے طلبا تھے، لیکن اپنے ہم سبقوں میں ان کے گہرے تعلقات چند ہی سے تھے۔ انٹرمیڈیٹ کلاس میں اقبال محمد شفیع، جمال یوسف خواجہ، عارف بشیر، ابوعلی ہاشمی، سید احمد، قاضی اقبال احمد وغیرہ، بی اے میں اولاد احمد صدیقی، فرخند علی ہاشمی، سید شاہ حسن عطا، ام اے میں مسعود صدیقی (بھوپال) اور حافظ خورشید حسن (سنبھل) اور قانون کی کلاسوں میں احسان رشید صدیقی ان کے ہم جماعت تھے۔ دونوں، خسرو صاحب، حفیظ الرحمٰن صاحب اور اسماعیل صاحب کی کلاسوں میں سب سے آخری نشستوں پر بیٹھے پابندی سے انگریزی ناول اور اپنے اپنے ذوق کی تازہ مطبوعات پڑھا کرتے تھے۔ دونوں کو قانون پڑھ کر کچہری میں وکالت نہیں کرنی تھی اس لیے دونوں نے کچھ دنوں کے بعد یہ کوچہ چھوڑ دیا۔

ایک ملاقات میں انھوں نے اپنے ان دوستوں کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ اقبال محمد شفیع، فوج میں بریگیڈر ہوئے اب اسلام آباد میں مقیم ہیں۔ جمال یوسف خواجہ صاحب، صدر شعبۂ فلسفہ اور ڈین فیکلٹی آف آرٹس ہوئے، عارف، سید بشیر الدین صاحب لائبریرین کے صاحب زادے ایک مشہور انڈسٹریل فرم میں آفیسر بنے، دہلی میں مقیم ہیں۔ سید ابوعلی ہاشمی، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے حقیقی بھائی تھے یوپی میں کہیں ملازم ہوگئے تھے پھر ان کا پتا نہیں چلا۔ سید احمد، ڈاکٹر سید ظفر الحسن صدر شعبہ فلسفہ کے صاحبزادے، بی اے کرکے لاہور چلے گئے۔ کئی سال پہلے لاہور میں ان کی وفات ہوئی۔ قاضی اقبال ڈاکخانہ میں ملازم ہوگئے تھے پھر حکومت یوپی کے محکمۂ سیاحت سے متعلق ہوگئے تھے۔ بعد کو استعفا دے کر امریکہ چلے گئے وہیں ان کی وفات ہوئی۔

بی اے کے ساتھیوں میں اولاد احمد صدیقی صاحب علی گڑھ کے شعبۂ اقتصادیات کے پروفیسر اور صدر شعبہ ہوئے، سید فرخند علی ہاشمی یونیورسٹی اسکول کے بہت کامیاب استاد ثابت ہوئے اور سید شاہ حسن عطا، یونین کے نامور مقرر اور نائب صدر ہوئے۔ انھوں نے پاکستان میں خاصی شہرت حاصل کی۔ ان کے ام اے (عربی) کے رفقا میں مسعود صدیقی سعودی عربیہ کے محکمۂ تعلیمات میں مدت ملازمت پوری کرکے بھوپال واپس آئے اور سیفیہ کالج میں وایس پرنسپل ہوئے۔ حافظ خورشید حسن نے ام اے کے ساتھ ال ال بی بھی کیا تھا، وہ سنبھل کے کامیاب وکیل بنے۔ احسان رشید صاحب

Marfat.com

یورپ میں بھی آرزو صاحب کے معاصر رہے انھیں بون یونیورسٹی سے اقتصادیات میں اور آرزو صاحب کو آکسفورڈ سے عربی و اسلامیات میں ایک ہی سال ۱۹۵۶ء میں ڈاکٹریٹ تفویض ہوئی ۔ احسان صاحب کراچی یونیورسٹی میں اقتصادیات کے صدر شعبہ اور پھر اسی یونیورسٹی میں وائس چانسلر مقرر ہوئے۔

آدمی کو اس کے مزاج کے مطابق دوست احباب بھی مل جاتے ہیں ۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے علی گڑھ میں ان کے خاص الخاص احباب میں نمایاں نام ڈاکٹر نذیر احمد اور پروفیسر اسلوب احمد انصاری کا ہے ۔ یہ دونوں اپنے اپنے میدان کے جیّد عالم اور دانشور ہیں نہایت درجہ مہذب ، متین اور سنجیدہ ۔ یہ دونوں علی گڑھ کی نہایت سربرآوردہ شخصیات میں ہیں ، ویسے میں آرزو صاحب کو شروع سے ہی دیکھتا رہا ہوں کہ انھیں ایسے ادیبوں اور شاعروں سے الرجی رہی ہے جو غیر سنجیدہ ، بے ہنگم اور لا اُبالی ہوں ، جن کی زندگی میں کوئی نظم نہ ہو۔

جب وہ بی اے کے طالب علم تھے اور لٹن لائبریری ، اسٹریچی ہال کے قریب ایس ایس ہال میں واقع تھی ، آرزو صاحب ان اوقات میں جب ان کی کوئی کلاس نہیں ہوتی تھی دوستوں سے گپ شپ کے بجائے اپنا وقت لائبریری کے دارالمطالعہ میں صرف کرتے یا سید بشیر الدین لائبریرین اور پروفیسر عمر الدین صاحب کے پاس جا بیٹھتے۔ کبھی موقع پاکر شعبۂ اردو چلے جاتے اور رشید صاحب ، محمد عزیر صاحب کی گفتگو سے مستفید ہوتے ، کبھی یا جذبی صاحب اور ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی سے ادبی فیوض حاصل کرتے۔ یہ اساتذہ اور خاص طور پر علوی صاحب ان پر بہت مہربان تھے ۔ لاطائل گفتگو اور کار فضول سے انھوں نے ہمیشہ دامن بچایا ہے مگر سر پر ایسی کوئی آفت آ ہی جائے تو وہ خوش اسلوبی سے اُسے بھی انگیز کر لیتے ہیں ۔

''ملفوظات اشرفی'' میں میرے جدّ امجد مخدوم سید اشرف جہانگیر سمنانی کے حوالے سے ایک جگہ منقول ہے کہ ''میں درجۂ وَلایت و قطعیّت تک روزہ نماز سے پہونچا ہوں نہ کثرتِ عبادت سے بلکہ مخلوق خدا کی حاجت روائی سے ۔ آرزو صاحب ہر صبح نمازِ فجر کے بعد پابندی سے قرآن پاک کی تلاوت کرتے ہیں ، وہ غوث اور قطب کے ماننے والوں میں ہیں اعلیٰ اخلاق سے مزین ، اپنوں اور دوسروں کی حاجت روائی اُن کا محبوب

Marfat.com

شیوہ ۔ وہ تقریباً ۱۷ سال تک شعبہ عربی کے سربراہ رہے اور آرٹس کی فیکلٹی کے ڈین بھی ۔ انھوں نے بڑے نازک مواقع پر حاجت مندوں کی مدد کی ہے ۔ وہ کسی کی مدد کر کے خوش ہوتے ہیں ۔ کام ہوجاتا ہے تو احسان نہیں جتاتے ۔ اسی سلسلے میں ایک بات اور عرض کردوں جس کا تعلق علی گڑھ کے خاص مزاج سے ہے ۔ مجھے نہیں معلوم کہ جن لوگوں کے ساتھ آرزو صاحب نے حسن سلوک کیا ہے، آج وہ اِن کے دوست ہیں یا مخالف ، لیکن اتنا جانتا ہوں کہ یہ میرا تجربہ ہے کہ کسی بھی شعبے کے سربراہ کی حیثیت سے آپ جس شدّ و مد کے ساتھ کسی کی حمایت کر رہے ہیں، کل پلٹ کر اُس کا آپ کا مخالف ہوجانا یقینی ہے ۔ ایسی ضابطہ شکنی عین اخلاق ہے جہاں کسی پریشان حال اور مستحق انسان کی مدد امداد کی صورت نکل آئے کیونکہ قانون کا بنیادی مقصد سختی نہیں ، راحت رسانی ہے ، آرزو صاحب نے ہمیشہ لوگوں کی مدد کی ہے اور Out of the Way جا کر ۔ مگر ہنوز یہ امر مشتبہ ہے کہ ایسے لوگ آج بھی آرزو صاحب کے ممنون کرم ہیں یا نہیں ، اِن کو محبت سے یاد کرتے ہیں یا ان کی غیبت کرتے ہیں ۔ حضرت علیؓ سے کسی نے کہا کہ فلاں شخص ہمیشہ میرے درپئے آزار رہتا ہے ۔ آپ نے اس پر برجستہ فرمایا کہ ''تم نے اس کے ساتھ کوئی نیکی تو نہیں کی ہے؟'' کارِ خیر کرنے والے کو چاہیے کہ نیکی کر کے بھول جائے کیونکہ:

؎ زمین شور سنبل بر نیارد

آرزو صاحب تنگ دل اور تنگ نظر نہیں ہیں ۔ ان کے مذہبی خیالات میں بڑی وسعت ، رواداری اور کشادگی ہے ۔ اس کی وجہ علی گڑھ اور آکسفورڈ میں ان کا طویل قیام، ان دونوں یونیورسٹیوں میں ان کی تعلیم و تربیت اور ان کی متوازن شخصیت اور انسان دوستی ہے ۔ وہ ہر عقیدہ و مسلک کے انسان سے محبت سے ملتے ہیں ۔ بقول جگر

ع میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہونچے

ایسا جید عالم اور ایسا خاکسار ، خلیق اور ملنسار ، تہذیب و ادب کا پاسدار ، علی گڑھ کے دیرینہ روایتی کلچر کا نمونہ ، علم و ادب کا جیتا جاگتا شاہکار ، ادیب ، دانشور عالم ، محقق مختارالدین احمد آرزو صاحب جیسا گوہر نایاب کہاں اللہ انھیں تادیر قائم رکھے ۔ (آمین)

؎ ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

☆☆☆

Marfat.com

پروفیسر نورالحسن نقوی
سابق استاد شعبہ اردو، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مسلم یونیورسٹی کی ملازمت میں داخل ہوئے زیادہ مدت نہیں گزری تھی کہ ایک عجب طرح کے تجربے سے دوچار ہونا پڑا۔ یہاں ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغِ ستم ہمارے ایک دوست تھے۔ ان کا حال یہ تھا کہ آج برسرکار ہیں تو کل بے روزگار۔ ڈانوا ڈول ملازمت کو سنبھال رکھنے کے لیے کئی دفتروں کا طواف ضروری تھا۔ شعبۂ تاریخ کے صدر پروفیسر نورالحسن جو آگے چل کر وزیر تعلیم ہوئے ان دنوں آرٹس فیکلٹی کے ڈین تھے ایک دن یہ انھیں سلام کرنے ان کے دفتر میں داخل ہو رہے تھے کہ ہمارے ایک بزرگ اور بہت سینیر استاد دفتر سے برآمد ہوئے۔ فرمایا ڈین صاحب سے تمھاری سفارش کرنے آیا تھا۔ انھوں نے کہا ''میں خود ان کے بارے میں فکرمند ہوں۔'' سوکھے دھانوں برسات ہوگئی۔ شام کو یہ ان کا شکریہ ادا کرنے ان کی کوٹھی پر جا پہنچے۔ کہا ''آپ کو میری ملازمت کی فکر ہے۔ اس کا شکریہ ادا کرنے حاضر ہوا ہوں۔'' جواب ملا ''جی نہیں۔ میں آپ کے بارے میں قطعاً فکرمند نہیں ہوں۔ یہ اطلاع آپ کو دی کس نے؟'' اِنھوں نے نام بتایا۔ ڈین صاحب نے فرمایا ''بے شک وہ آئے ضرور تھے مگر اپنے ایک کام سے، آپ کا تو انھوں نے نام بھی نہیں لیا۔'' اس دن ہم نے یہ سبق سیکھا کہ کسی پر بھروسا نہ کرو۔ اپنے لیے اپنے آپ کوشش کرو کوئی سفارش کرنے کا وعدہ کرے تو اس کی ساتھ لگ کے صاحب اختیار کے پاس جاؤ۔ مگر تجربے نے بتایا کہ یہ تدبیر بھی کارگر نہیں ہوتی۔ آپ کا جو ''محسن'' آپ کے سر پر احسان کا بوجھ لاد رہا ہے وہ ایک طرف تو زبان سی آپ کی سفارش کرتا جاتا ہے اور دوسری طرف آپ کی نظر بچا کے اُسے آنکھ مارتا جاتا ہے تو بس ایک ہی صورت رہ گئی۔ اپنی مدد آپ۔ چنانچہ اسی اصول پر ہم کاربند ہوگئے۔

آرزو صاحب کے بارے میں کچھ عجب سی رائے دل میں بیٹھ جاتی اگر آگے چل کر بار بار ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کے نزدیک آنے کا موقع نہ ملا ہوتا۔ ان کا مزاج یہ ہے کہ حقدار کو اس کا حق دینے یا دلانے میں وہ کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھتے اور اِس کے لیے نہ کسی دوڑ دھوپ کی ضرورت ہے نہ سعی و سفارش کی اور اگر معاملہ اس کی برعکس ہے تو انھیں رام کرنے کی کوئی تدبیر نہیں۔ آرزو صاحب کی سب سے بڑی دشواری

Marfat.com

یہ ہے کہ ان کے پاس بزم آرئیوں کے لیے وقت نہیں۔ آپ کا کوئی کام کر سکتے ہیں تو بلا تامل کر دیں گے لیکن آپ کو وقت درکار ہے تو سخن درین است۔ ان کی زندگی کا ایک ایک پل تحقیق و تنقید اور تصنیف و تالیف میں صرف ہوتا ہے۔ یہی حال اس زمانے میں تھا جسے لوگ مشغول عمر کا نام دیتے ہیں یعنی ملازمت کی مصروفیت کا زمانہ اور یہی حال ہم اب دیکھتے ہیں جب ملازمت کا بوجھ سر سے اُتر چکا ہے۔ بلکہ اب انھیں وقت کی تنگی کا گلہ زیادہ ہے کیونکہ اب تصنیفی کاموں کا ہجوم بھی زیادہ ہے۔

آرام اور سیر و تفریح کے لیے وہ کبھی وقت نہ نکال سکے۔ ان کا مکان بہت بڑا ہے اور کمرے خوب کشادہ مگر ہر کمرہ کتاب خانہ ہے۔ صحن نسبتاً چھوٹا ہے مگر بیگم صاحبہ کے ذوقِ باغبانی نے اسے گلزار بنا دیا ہے۔ انھوں نے طرح طرح کے پودے لگا رکھے ہیں۔ کوئی آنے والا پھولوں پودوں کی تعریف کرے تو آرزو صاحب بھی ضرور ایک آدھ توصیفی جملہ کہہ دیں گے ورنہ ان کا حال بھی میر تقی میر کا سا ہے جن کے کمرے کا باغ میں کھلنے والا دریچہ بند ہی رہا کیونکہ انھیں اپنی غزلوں کے چمن کی آبیاری نے اتنی مہلت ہی نہ دی کہ کسی اور گلستاں کی طرف توجہ کر سکیں۔ آرزو صاحب کا معمول ہے کہ سہ پہر کو کمرے سے باہر نکل آتے ہیں۔ سب سے پہلے کتابوں، رسالوں اور کاغذوں سے لدی ہوئی چھوٹی میز، صحن، بہ الفاظِ دگر چمن کے بیچوں بیچ لگا دی جائے گی۔ پھر اس کے چاروں طرف چند کرسیاں بچھ جائیں گی۔ آخر میں آرزو صاحب باہر تشریف لائیں گے اور میز پر ان کے مسودات کے اوراق بکھر جائیں گے گویا ان کا چمنستانِ بوقلموں کِھل اُٹھے گا۔ ایسے میں کہاں فرصت کہ اردگرد بہار دکھاتے پودوں کی طرف نظر اٹھا کے دیکھا جا سکے۔

بیگم صاحبہ کی زبان سے کبھی کبھی دبی زبان میں یہ شکایت سُنی کہ ڈاکٹر صاحب گھر کے انتظام میں، سامان کی خریداری میں بلکہ مکان کی تعمیر و مرمت کے کام میں بالکل دلچسپی نہیں لیتے۔ یہ سارے کام بیگم صاحبہ کو کرنے پڑتے ہیں، عرض کیا گیا کہ وہ جن کاموں میں مصروف ہیں وہ زیادہ اہم ہیں۔ علم و ادب کی خدمت تو اپنی جگہ لیکن کیا آپ کے لیے اتنا کافی نہیں کہ اپنے شوہر کے علمی خدمات کے سبب آپ کو بیگم آرزو کہلانے کا اعزاز حاصل ہے؟ خدا جانے یہ دلیل انھیں قائل کر سکی یا نہیں مگر ایک دن فرمانے لگیں کہ گھر کے کاموں میں تو شاید تم بھی ہاتھ نہیں بٹاتے۔ نگار، اکثر بازار میں سامان خریدتی نظر آتی ہیں۔ میں نے عرض کیا ابھی تو آپ کو ہماری صرف ایک خوبی کا علم ہوا ہے۔ ہم میں تو

Marfat.com

ایسے ہزار گن اور پائے جاتے ہیں، کہاں تک گِنائیں۔

اپنی تمام مصروفیات کے باوجود آرزو صاحب دوسروں کے علمی کاموں ہر ممکن مدد کے لیے ہمیشہ تیار رہتے ہیں اور اسے اپنے وقت کا زیاں نہیں بلکہ بہترین استعمال خیال کرتے ہیں ۔ ملک کے اندر اور باہر سے روز انہ متعدد خط موصول ہوتے ہیں اور ان میں طرح طرح کی فرمایشیں ہوتی ہیں ۔ اکثر لوگوں کو نادر و نایاب کتابوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ آرزو صاحب ان کتابوں کو جو عموماً گراں ہوتی ہیں، بلا تاخیر حاصل کرتے ہیں اور اب جب کہ ڈاک کا خرچ بے حد بڑھ گیا ہے انھیں منزلِ مقصود کی طرف روانہ کر دیتے ہیں ۔ اکثر اسکالر اور مصنف کمیاب کتابوں رسالوں کے عکس یا مخطوطات سے مطلوبہ مواد کی فرمایش کرتے ہیں جو بہت مشکل ہونے کے باوجود پہلی فرصت میں پوری کر دی جاتی ہے۔ علمی و تحقیقی معاملات میں رہنمائی کے خواستگار بے شمار ہوتے ہیں اور شاید کسی کو مایوسی کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔

اِس آئینے میں ہم نے اپنی صورت دیکھی تو حد درجہ بھیانک نظر آئی ۔ ایسے فرمائشی خطوط اوّل تو ہمیں موصول ہی نہیں ہوتے ، دورانِ سفر ہی گم ہوجاتے ہیں ۔ ایسا نہ ہوا تو مکتوب نگار کو جو کتاب مطلوب ہے وہ علی گڑھ میں دستیاب نہیں ہوتی ۔ جس مخطوطے کا عکس درکار ہے وہ مخطوطہ لائبریری سے گم ہوجاتا ہے یا عکس بنانے والی مشین خراب ہوجاتی ہے ۔ یہی سبب ہے کہ ہمیں کسی کتاب کی ضرورت ہو تو کسی سے درخواست کرنے کی ہمت نہیں ہوتی اور ایک ہمارے کرم فرما آرزو صاحب ہیں کہ ان کی دلچسپی کی کتابیں طلب کیے بغیر ہر طرف سے علی گڑھ پہنچتی رہتی ہیں۔

کافی مدت گزرنے کے بعد ہماری ریڈرشپ کا انٹرویو ہوا۔ اب آرزو صاحب نہیں ایک اور پروفیسر ڈین کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ میری گزارش کے بغیر آرزو صاحب ان سے میری سفارش کرنے تشریف لے گئے ۔ گھنٹہ بھر آرزو صاحب کی دلیلیں سننے کے بعد فرمایا ”کسی تکنیکی دشواری کے سبب میں انٹرویو لینے والوں میں شامل نہیں ہوں“۔ میں نے سنا تو افسوس ہوا ، خاص طور پر اس بات کا کہ ڈین صاحب نے جو کچھ بعد کو بتایا وہ پہلے ہی بتا دیتے تو دونوں کا وقت بھی بچتا اور سفارش کرنے والوں کو جو شرمندگی ہوتی ہے آرزو صاحب اس بھی محفوظ رہتے ۔

آرزو صاحب اپنے دوستوں اور نیازمندوں کی مدد میں اتنا کچھ کر گزرتے ہیں

Marfat.com

جو اچھے اچھوں کے بس کی بات نہیں ۔ یہاں ایک واقعہ نہایت اختصار کے ساتھ بیان کرنا چاہتا ہوں۔ ایک بار انھوں نے مجھے کسی کتاب کا مسودہ دیا کہ اسے خوشخط لکھ دو۔ میں نے عرض کیا کہ یہ تو پہلے ہی صاف لکھا ہوا ہے۔ فرمایا تم ذرا قلم جما کر لکھ دو ۔ یہ کام سرکاری ہے، اس کا معاوضہ مجھے پیشگی وصول ہو چکا ہے ۔ اس کے ساتھ ہی ایک لفافہ عنایت فرمایا اس میں نو سو روپے تھے ۔ میں نے پانچ سات دن میں مسودہ صاف کر کے ان کی خدمت میں پیش کر دیا۔ دیکھا، پسند فرمایا اور خوشی کا اظہار کیا۔ اگلے دن زحمت فرمائی اور ایک اور لفافہ مرحمت فرمایا ۔ اس میں بھی نو سو روپے تھے ۔ میں نے عرض کیا کہ نقل کا معاوضہ تو مجھے پہلے بھی وصول ہو چکا۔ فرمایا یہ مزید ہے ۔ اسے اچھے کام کا انعام سمجھو اور یقین کرو یہ میری طرف سے نہیں ہے، جو مجھے ملا ہے وہی تمھیں دے رہا ہوں ۔ اُس وقت تو جو کچھ انھوں نے کہا میں نے اُسی کو سچ جانا لیکن بعد کو رفتہ رفتہ ان کے مزاج کے پرتیں ایک ایک کر کے کھلیں اور ان کی بہت سی خوبیوں کا علم ہوا تو بات سمجھ میں آ گئی ۔ اُن دنوں مجھے کوئی ضرورت در پیش تھی اور شاید انھیں اِس کا اندازہ ہو گیا تھا ۔ اُنھوں نے اپنے ایک نیازمند کی اس طرح مدد کی کہ اسے شرمندہ بھی نہ ہونے دیا اور اس کی مشکل بھی آسان ہو گئی ۔ اِس زمانے میں کون کسی کی مدد کرتا ہے اور کرتا ہے تو سو احسان جتانے کے بعد ۔ یہی نہیں بلکہ زندگی بھر ایک احسان کا صلہ سو بار وصول کرتا ہے۔

آرزو صاحب کا اصل کام عربی میں ہے۔ اس سے تو ہم ناواقف ہیں لیکن اردو میں بھی انھوں نے بہت کام کیا ہے ۔ بیشتر کام تحقیقی نوعیت کا ہے ۔ بلاشبہہ انھوں نے اردو کی بیش بہا خدمت انجام دی ہے ۔ ان کی تحریروں سے ہم نے اپنی بساط کے مطابق فیض اٹھایا ہے اور ان میں ہمیں جو سب سے زیادہ پسند ہے وہ ان کی خودنوشت ہے جسے روز نامچہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا ۔ اس خودنوشت کے کچھ حصّے مختلف رسائل میں بالاقساط شایع ہوئے ہیں ۔ یہ آپ بیتی کم اور جگ بیتی زیادہ ہے ۔ اس کا مطالعہ کر لیا تو گویا ایک عہد کی سیر کر لی ۔ مگر مشکل یہ ہے کہ ان قسطوں کو یکجا کیا جائے تو کئی ضخیم جلدیں تیار ہو جائیں گی۔ اِس زمانے میں جب اردو کتابوں کی فروخت امر محال ہے کون اِسے چھاپنے کا حوصلہ کر سکے گا۔ عجب نہیں ہمارے دوست مہرالٰہی ندیم ان جلدوں کو شایع کرنے کی کوئی سبیل نکال سکیں ۔ بہرحال اتنا ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ یہ خودنوشت یا روز نامچہ شایع ہو جائے تو ایک ایسی کتاب ہماری دسترس میں ہوگی جو نہایت پُر از معلومات ہونے کے ساتھ ساتھ بے حد دلچسپ بھی ہوگی۔ ☆☆☆

Marfat.com

پروفیسر کبیر احمد جائسی
سابق صدر شعبۂ اسلامیات، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مختار الدین احمد کا اندازِ تربیت

پروفیسر مختار الدین احمد صاحب کا شمار مادرِ علمی کے اُن اساتذہ میں ہوتا ہے جو علم کے لیے نہیں بلکہ خود عِلم اُن کے لیے بنا ہے۔ ایسے اساتذہ کے دامنِ تربیت سے وابستہ ہونا، اکتساب فیض کرنا اور ہم نشینی سے مستفید ہونا دارورسن کی طرح ہر ''مدعی'' کی قسمت میں نہیں ہوتا۔ یوں تو میں پروفیسر مختار الدین احمد صاحب کا کبھی شاگرد نہیں رہا ہوں مگر اللہ کے کرم سے ان کی تربیت سے محروم نہیں ہوں۔ اُن سے تعارف استاذ محترم پروفیسر نذیر احمد صاحب کے ذریعے کب اور کیسے ہوا یہ تو یاد نہیں، کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جب سے پروفیسر نذیر احمد صاحب کی شاگردی میسر ہوئی ہے اُسی زمانے سے پروفیسر مختار الدین احمد صاحب سے بھی متعارف ہوں۔ میرے پرانے کاغذات میں ان کا ایک ''رقعہ'' محفوظ رہ گیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جب میں مسلم یونیورسٹی میں اپنی تعلیم کے آخری مراحل میں تھا اُس وقت پروفیسر مختار الدین احمد صاحب نہ صرف مجھ کو جانتے تھے بلکہ بعض کاموں کا اہل بھی سمجھتے تھے۔ افسوس ہے کہ اِس ''رقعہ'' پر سالِ تحریر درج نہیں ہے صرف تاریخ ہے لیکن چونکہ یہ رقعہ مجھ کو کشمیر ہاؤس میں ملا تھا اِس سے اس بات کا یقین ہے کہ یہ ۱۹۶۶ء کے بعد کا نہیں ہے۔ بہرحال وہ رقعہ درج ذیل ہے:۔

مکرمی کبیر احمد جائسی صاحب سلام مسنون

عبد الودود صاحب یہاں ہمارے ساتھ پی ایچ ڈی کر رہے ہیں۔ کشمیر ہاؤس میں ان کا داخلہ ہوجائے تو خوب ہو۔ آپ وہاں کے پرانے لوگوں میں ہیں اِس لیے داؤ پیچ سے واقف ہیں کوئی داؤ یاد آجائے تو انھیں بھی بتادیجیے۔ میں نے احتیاطاً نسیم قریشی صاحب کے نام خط لکھ دیا ہے لیکن تاکید انہیں کرتا ہوں کہ آپ سے پہلے مل لیں۔ والسلام

مختار الدین احمد

ایک ملاقات میں میرے استفسار پر مختار الدین احمد صاحب نے بتایا کہ

Marfat.com

عبدالودود اعظمی شعبۂ عربی میں ان کی نگرانی میں ڈاکٹریٹ کے لیے چوتھی صدی ہجری کے مصنف الشمشاطی کی نایاب کتاب الانوار و محاسن الاشعار اڈٹ کر رہے تھے۔ یہ نسخہ جو منحصر بفرد ہے کتب خانۂ سلطان احمد ثالث استانبول میں محفوظ ہے انھوں نے اسے خود اڈٹ کرنے کے لیے اس کا عکس منگوایا تھا لیکن اعظمی صاحب کی ضرورت اور ان کے ذوق و شوق کو دیکھتے ہوئے یہ موضوع انھیں تفویض کر دیا۔ لیکن وہ جلد ہی وزارت خارجہ میں ملازم ہو کر ہندوستان سے باہر چلے گئے۔ دس سال کے بعد ۱۹۷۶ میں الاستاذ صالح مہدی العزاوی نے بغداد سے اور پھر ڈاکٹر سید محمد یوسف نے ۱۹۷۸ء میں کویت سے شائع کیا۔ نسیم قریشی (ریڈر شعبہ اردو) اس وقت سلیمان ہال کے پرووسٹ تھے۔ یاد نہیں کہ میں نے اِن عبدالودود صاحب کو کوئی داؤ بتایا تھا یا نہیں اور اگر بتایا تھا تو وہ کارگر کیوں نہ ہوا؟ یہ یاد ہے کہ میں جب تک کشمیر ہاؤس میں رہا عبدالودود صاحب کو وہاں داخلہ نہ مل سکا تھا۔ اِس ''رقعہ'' کو بطور تمہید اس لیے نقل کر رہا ہوں کہ آج کی نسل کو معلوم رہے کہ ہمارے اساتذہ کا ہمارے ساتھ کیا برتاؤ تھا اور اِسی سے موازنہ کر کے وہ اپنے اساتذہ کے بارے میں زیادہ نہ سہی تھوڑا اندازہ تو کر ہی سکتے ہیں۔

آج کی صحبت میں پروفیسر مختار الدین احمد صاحب کے اندازِ تربیت پر روشنی ڈالنی مقصود ہے۔ میں اگر چہ کلاس میں انکا شاگرد نہیں رہا ہوں پھر بھی میرے پاس ان کی ایسی تحریریں محفوظ ہیں جن کے ذریعے انہوں نے میری ایسی تربیت کی ہے کہ آج تک گراں بارِ احسان ہوں۔ صفحات کی قلت کی وجہ سے اُن کی صرف دو تحریروں کا حوالہ دوں گا اور کوشش کروں گا کہ میں کم سے کم بولوں اور اِن صفحات میں ان کی آواز دیر تک گونجتی رہی ہے۔

۱۹۸۴ء میں جب میں نو سالہ بن باس سے لوٹ کر ادارۂ علوم اسلامیہ میں ریڈر ہو چکا تھا، ہادی حسن ہال کے پرووسٹ صاحب (شاید ڈاکٹر ایم۔ بی خان) کا خط مجھ کو ملا کہ ہال میگزین کے لیے کوئی مضمون بھیج دوں۔ فارسی زبان و ادب کا طالب علم ہونے کی وجہ سے میں نے ہادی حسن صاحب پر قلم اُٹھانے کا ارادہ کیا، اگر چہ میں ان کا شاگرد نہیں تھا مگر مجھے بھی ان کو دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ میں نے سوچا کہ ان پر اب تک کچھ نہیں لکھا گیا ہے میں ہی اس کام کی ابتدا کیوں نہ کر دوں۔ اُن کی تصانیف تو علی گڑھ میں محفوظ تھیں مگر حالات زندگی بتانے والے اگر تھے تو مجھ کو نہ مل سکے تھے۔ صرف میرے مرحوم استاد ڈاکٹر شمعون اسرائیلی صاحب کی ایک دو صفحے کی تحریر جس سے ان کے کوائف کا تھوڑا سا علم

Marfat.com

ہوجاتا ہے موجود تھی، میں نے اسی تحریر کو خضرراہ بنا کر پروفیسر ہادی حسن صاحب پر ایک چھوٹا سا مضمون میگزین کے لیے لکھ دیا جو انتہائی غلط شائع ہونے کی وجہ سے کسی کی توجہ کا مرکز نہ بن سکا۔ مزید برآن وہ مضمون بھی کچھ یوں ہی سا تھا۔ جولائی ۱۹۸۶ء میں جب ادارۂ ''تہذیب الاخلاق'' میں میرا تقرر ہوا تو اُس کے ایڈیٹر پروفیسر اسرار احمد صاحب کے ساتھ ایک مشن کے تحت ''تہذیب الاخلاق'' کے لیے مضامین لکھ رہا تھا۔ میں نے مذکورہ مضمون پروفیسر مختار الدین احمد صاحب کے درج ذیل خط کی روشنی میں ترمیم و اضافہ کے ساتھ ستمبر ۱۹۸۶ء کے ''تہذیب الاخلاق'' میں شائع کیا تھا [1]۔ یہاں یہ بتانا نا مناسب نہ ہوگا کہ ''تہذیب الاخلاق'' میں شائع ہونے والے مضمون میں جو ''کھانچے'' رہ گئے تھے ان کو ختم کر کے اور ان کی ایک اور کتاب Mughal Poetry, its Culture & Historical value کا تجزیہ شامل کر کے ''پروفیسر ہادی حسن کی علمی خدمات'' کے عنوان سے میں نے اپنی کتاب ''انعکاس'' (ص ۱۲۷۔۱۵۶) میں شائع کر دیا تھا جو مارچ ۱۹۸۷ء میں منظر عام پر آئی تھی۔

پروفیسر مختار الدین احمد صاحب کے درج ذیل طویل خط کے مطالعے سے اندازہ ہوگا کہ وہ اپنے چھوٹوں کی کمزور تحریروں کو بھی بغور پڑھتے ہیں اور اگر کوئی ان سے مشورہ طلب کرتا ہے تو ان سے جو بھی علمی مدد ہو سکتی ہے اس سے دریغ نہیں کرتے۔ پروفیسر مختار الدین احمد صاحب نے میرے معمولی سے مضمون پر اظہار خیال کرتے ہوئے میری جس انداز سے تربیت کی ہے وہ اِس خط کی ہر ہر سطر سے نمایاں ہے۔ ذیل میں ان کا پورا خط نقل کیا جا رہا ہے۔ جو قلم برداشتہ لکھا گیا تھا:

---

(۱) میرے اس مضمون کو ''سیارہ'' لاہور کے شمارہ ۲۹ میں نقل کیا گیا تھا جسے پڑھ کر ایک پرانے علیگ ڈاکٹر عبدالعزیز صاحب نے ایک طویل مقالہ لکھ کر مجھ کو بھیجا تھا جسے میں نے دو قسطوں (دسمبر ۱۹۹۰ جنوری ۱۹۹۱ء) میں شائع کر دیا تھا۔ یہ ڈاکٹر عبدالعزیز صاحب دوسروں کی آوازوں کی نقل کرنے کے ماہر تھے اسی ''جرم'' کی ''پاداش'' میں پروفیسر ہادی حسن صاحب سے متعارف ہوئے تھے۔ یہ بات گذشتہ صدی کی چوتھی دہائی کی ہے۔

Marfat.com

باسمہ

علی گڑھ

۸۶/۶/۷

مکرمی کبیر احمد جائسی صاحب السلام علیکم

آج شعبہ گیا تو آپ کا مضمون میز پر رکھا ہوا ملا۔ پڑھ لیا، آپ نے بہت توجہ سے مضمون لکھا ہے۔ یہیں بیٹھا ہوا یہ چند اشارات لکھ رہا ہوں ممکن ہے آپ کے لیے کچھ مفید ثابت ہوں۔

عنوان میں ''ڈاکٹر'' کا لفظ بڑھا دیجیے، ''صاحب'' کی اب ضرورت نہیں۔ اوپر ''نباتیات'' لکھ آئے ہیں اب پھر بعد کو ''علم النباتیات'' لکھنے کی بھی ضرورت نہیں۔

صفحہ ۱۶ ''ڈاکٹر ہادی حسن مرحوم کی ۴ ستمبر ۱۹۵۴ء کو مدت ملازمت ختم ہوگئی تھی۔'' یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم نے بیک وقت چار سال کی انہیں توسیع دی اِس طرح ۶۰ سال کی عمر پوری ہونے کے بعد انہیں مزید چار سال تک پروفیسر اور صدر شعبہ کی حیثیت سے کام کرنے کا موقع ملا اِس طرح وہ ۴ ستمبر ۱۹۵۸ تک علی گڑھ کے شعبۂ فارسی سے متعلق رہے۔

اگر آپ نے ان کی تاریخ ولادت ۳ ستمبر صحیح لکھی ہے تو وہ متقاعد ۳ ستمبر کو نہیں بلکہ ۲ ستمبر کو ہوئے ہوں گے۔

مجھے چالیس بیالیس سال کے دوران قیام میں یاد نہیں آتا کہ کسی استاد کو بیک وقت چار سال کی توسیع ملی ہو۔ اس وصف میں صرف پروفیسر محمد حبیب ان کے شریک ہیں۔ ذاکر صاحب نے دونوں کو بیک وقت چار چار سال کی توسیع دی تھی۔ اس سے جہاں اِن اساتذہ کے علم و فضل کا اندازہ ہوتا ہے وہاں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مرحوم کی علم نوازی اور ان کی قدر افزائی پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

ص ۱۷ حکومت ہند نے ڈاکٹر ہادی حسن صاحب کو فارسی کے اسکالر کی حیثیت سے سرٹی فیکٹ آف آنر دیا تھا اُس کی رقم -/1500 ماہوار نہیں تھی جیسا کہ آپ نے لکھا ہے، اس طرح تو پندرہ ہزار سالانہ سے زائد ہوئی۔ اتنی رقم اُس وقت تو کیا اب بھی سرٹی فکٹ آف آنر پانے والوں کو نہیں ملتی۔ اضافے کے بعد اب ہم لوگوں کو پانچ ہزار سالانہ ملتا ہے (۱) گویا -/500 ماہوار سے بھی کم، اس وقت رقم اِس سے بھی کم تھی غالباً

(۱) اب یہ رقم بڑھ کر بیس ہزار پھر پچاس ہزار سالانہ ہوگئی ہے

Marfat.com

۱۵۰۰ سالانہ۔ پھر اِسے پنشن نہ لکھیے یہ پنشن نہیں ہوتی، یہ ایک طرح کا اعزاز یہ ہوتا ہے جو ہر ایک اسکالر کو زندگی بھر ملتا رہتا ہے۔

معلوم ہو سکے تو لکھیے کہ یو جی سی کی رقم کس موضوع پر کام کرنے کے لیے انہیں ملی تھی۔ کام غالباً مکمل نہیں ہو سکا۔

آپ نے ڈاکٹر صاحب کی تصنیف ایرانی بحریہ کی تاریخ پر بہت اچھا نوٹ لکھا ہے لیکن آپ مجھ سے متفق ہوں گے کہ یہ ان کا اصل کارنامہ نہیں، فارسی ادب کے سلسلے میں جو کچھ انھوں نے بعد کو لکھا ہے اُس کو پیش کرنے کی ضرورت تھی۔ یہ تصنیف تو جیسا کہ مرحوم نے خود مجھ سے ذکر کیا تھا اُن کی ابتدائی کوششوں کا نتیجہ تھی اور وہ خود اُسے اہمیت نہیں دیتے تھے، اِسی لیے اس پر نظرثانی کر کے دوبارہ شایع کرنے کی انہیں کبھی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔

یہ میری ذاتی رائے ہے اور کوئی ضرور نہیں کہ آپ اِس سے متفق ہوں کہ یہ کتاب جس پر آپ نے بہت توجہ کی ہے اُن کی کمزور تصانیف میں ہے، اگر اس کی بہت اہمیت ہوتی تو ایران میں اب تک اس کے کئی تراجم چھپ گئے ہوتے۔

آپ کو توجہ کرنی چاہیے ڈاکٹر صاحب کی اُن کتابوں اور اُن مضامین کی طرف جو انہوں نے فارسی ادب پر لکھے ہیں۔ اُن سے اُن کی صحیح اہمیت کا اندازہ ہوگا۔

ممکن ہے اس گرمی کی تپش میں آپ بہت زیادہ محنت کرنے کی طرف مائل نہ ہوں لیکن میرا مشورہ یہ ہوگا کہ آپ کا موجودہ مضمون یہیں علیگڑھ میں چھپ چکا ہے بعینہ بغیر ترمیم و اضافہ کے اِسے شایع نہ کرایئے۔ آپ نئے سرے سے مضمون لکھیے اور جن تصانیف کا آپ نے ذکر کیا ہے مختصر طور پر سہی سبھوں کا تعارف کرا دیجیے۔ یہ بڑا مفید کام ہوگا۔ اور ڈاکٹر صاحب مرحوم کی صحیح قدر شناسی۔

ان کی قوتِ حافظہ اور خطابت پر بھی ایک دو پیراگراف ضرور لکھیے۔ ان کے پاس الفاظ کا بڑا ذخیرہ تھا اُس کے مناسب اور برمحل استعمال سے وہ لوگوں کو مبہوت کر دیتے تھے۔ اور اُن کی خطابت کے جادو سے عوام تو عوام میں نے خواص کو مسحور ہوتے دیکھا ہے۔

ص ۱۹ آپ نے طبری اور مسعودی کے ساتھ مؤرخین میں ثعلبی کا ذکر کیا ہے، ثعلبی نام کا کوئی مؤرخ نہیں گزرا ہے۔ ثعلبی (ابواسحاق نیسابوری) ایک مفسر ضرور گزرے

Marfat.com

ہیں جن کی تفسیریں ''الکشف والبیان'' اور ''عرائس المجائس'' شایع ہوچکی ہیں۔ آپ کی مراد ابومنصور ثعالبی سے ہوگی جو مؤرخ تو بڑا نہیں لیکن مشہور ادیب اور مصنف ہے۔ ایران کی تاریخ پر ایک کتاب اُس کی طرف منسوب ہے اس کے کئی ایڈیشن نکلے ہیں، ایک ایڈیشن ایران سے بھی نکلا ہے، لیکن اس کتاب کا مصنف ثعالبی تھا یہ امر متحقق نہیں بلکہ خاصا مشکوک ہے۔ کتاب کا نام ''غرر اخبار ملوک الفرس وسیرھم'' ہے۔ یہ پہلی مرتبہ پیرس سے ۱۹۰۰ میں شایع ہوئی، تہران کا ایڈیشن ۱۹۶۳ کا میری نگاہ سے گزر چکا ہے، تعجب نہیں اس کا کوئی اور ایڈیشن بھی نکلا ہو۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم کے پیش نظر پیرس کا ایڈیشن ہوگا۔

ص ۲۵ر آخری پیراگراف کی دوبارہ اشاعت مناسب نہیں۔ اِسے نکال دیجیے۔ اگر فارسی اساتذہ کا واقعی وہی حال ہے جو آپ نے لکھا ہے جب بھی اِس کا اس طرح اظہار نا مناسب ہے اور پروفیسر نذیر احمد اور پروفیسر امیر حسن عابدی کے ادھورے کاموں کو مکمل کرنے کے لیے تو یہ حضرات خود بفضلہٖ موجود ہیں، شرط یہ ہے کہ انھیں آپ متوجہ کریں اور اُن کی مناسب علمی مدد۔

اب رہا یہ سوال کہ ڈاکٹر ہادی حسین کی ایرانی بحریہ کی تاریخ مکمل کون کرے، تو یہ کام آپ کیجیے اور اِس طرح کیجیے کہ آپ اس کا فارسی یا اردو میں ترجمہ کردیجیے (اصل کتاب بھی اب کم ملتی ہے) اور نئے معلومات حواشی وتعلیقات میں درج کردیجیے۔

''دیوان ہمایون'' کے بیان میں یہ ذکر قرین انصاف ہے کہ اس دیوان کو پروفیسر سید حسن عسکری صاحب نے تلاش کیا تھا اور اُس پر پہلا مضمون اور اُس کا بھرپور تعارف پروفیسر حافظ شمس الدین احمد استاد شعبۂ فارسی پٹنہ کالج نے رسالہ معیار (پٹنہ) کی کئی قسطوں میں کرایا تھا، یہ ۱۹۳۶ء کی بات ہے۔

آپ نے مضمون پر میری رائے طلب کی تھی اس لیے عجلت میں یہ سطور تحریر کردی ہیں۔

والسلام

مختار الدین احمد

درج بالا خط کے سلسلے میں کچھ زیادہ وضاحت کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی، صرف اتنا عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اِس خط کے پڑھنے سے پروفیسر مختار الدین احمد صاحب

Marfat.com

کی وسعت مطالعہ کا بھی کسی قدر اندازہ ہوتا ہے اوراس بات کا بھی کہ وہ کس صبر وتحمل سے اور کس شائستہ انداز سے اپنے چھوٹوں کی غلط باتوں کی طرف ان کی توجہ مبذول کراتے ہیں کہ اُن کی اصلاح بھی ہوجائے اوران کی اَنا کو بھی ٹھیس نہ پہونچے۔

ص۲۵ کے ایک پیراگراف کی طرف پروفیسر مختارالدین احمد صاحب نے توجہ دلائی ہے۔ جب میں نے اسے لکھا تھاتو بربنائے بشریت مجھ کووہی طمانیتِ قلب حاصل ہوئی تھی جو دنیا کے اولین پٹنے والے انسان نے حریف کوگالی ایجاد کرکے دینے کے بعد حاصل کی ہوگی۔ میں نے ان کی بات کا احترام کرتے ہوئے اب اُس پیراگراف کواپنے مضمون سے نکال دیاہے ۔ اِس جگہ یہ بتاتا چلوں کہ' اس زمانے میں اگرنوجوانی تو کیا جوانی بھی ڈھلنے لگی تھی مگر ''ھیضۂ حق گوئی'' کے جراثیم باقی تھے اس لیے میں نے یہ صحیح بات لکھنے میں کوئی حرج نہیں سمجھا کہ اب تو فارسی کے ایسے اساتذہ ہونے لگے ہیں جو ''بُود'' اور ''بَود'' میں فرق نہیں سمجھتے اورآہو کے معنی خرگوش بتاتے ہیں۔ پروفیسرمختارالدین احمد صاحب نے اُس پیراگراف کومضمون سے نکلواکر نہ صرف میری جارحیت کوحرفِ غلط کی طرح مٹادیا بلکہ مظلوم کوظالم بننے سے بھی بچالیا۔

ایک اور خط پیش ہے ۔ یہ خط ادارہ علوم اسلامیہ میں میرے پروفیسر اور صدر شعبہ مقرر ہونے کے بعد مبارک باد دینے کے لیے عجلت میں لکھا گیا تھا۔ یوں تو ہے یہ ایک تہنیتی خط لیکن ایک تجربہ کار اور منجھے ہوئے شفیق استاد نے ''نوگرفتار'' صدر شعبہ کی تربیت کے لیے اپنے تجربات کا جو نچوڑ اشاروں اشاروں ہی میں پیش کیا ہے وہ کم ہی تہنیتی خطوط میں ملے گا۔علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا ادارۂ علوم اسلامیہ جس کوکم عقل کلرکوں نے شعبہ علوم اسلامیہ کا نام دے رکھا ہے جب سے تین حصوں میں تقسیم ہوا ہے طرح طرح کے مصائب ومسائل سے دوچار ہوتا رہاہے۔ پروفیسر مختار الدین احمد صاحب نے بڑے بلیغ انداز سے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس عمل یا ان اعمال سے دور رہنے کی ترغیب دی ہے جن سے خود میں بھی کبھی کبیدہ خاطر رہا کرتا تھا ۔ مزید برآں انہوں نے ایک نوگرفتار کی ہمت بڑھاتے ہوئے اُس کی قدرے تعریف بھی کردی ہے کہ وہ اُس میں مگن ہوکر بے خطر آتشِ ناآزمودہ میں کود پڑے ۔اب پروفیسر مختارالدین احمد صاحب کا خط ملاحظہ ہو:

Marfat.com

باسمہ

علی گڑھ

۸۹/۸/۲۲

مکرمی پروفیسر کبیر احمد جائسی صاحب السلام علیکم

پروفیسر شپ اور شعبے کی صدارت دونوں مبارک ہو۔ خیال تھا کہ شعبہ یا گھر پر آ کر مبارک باد دوں گا لیکن ایک عزیز بچے کی علالت کی وجہ سے یہ دو مہینے سخت پریشانی میں گزرے۔ پنت ہوسپٹل دھلی میں برین آپریشن کی سخت منزل تھی، خدا نے بڑا فضل کیا، پرسوں بچہ گھر پر آ گیا ہے اور بفضلہٖ اچھا ہے۔

شعبے کی صدارت ایک بڑی ذمہ داری ہے لیکن مجھے یقین ہے آپ یہ کام ایسی خوش اسلوبی سے انجام دیں گے کہ شعبے کا وقار بڑھے گا۔

آپ کئی سال سے اس شعبے میں ہیں اور اُس کے مسائل کو اچھی طرح جانتے ہیں یقین ہے آپ اُن کا خیال رکھیں گے۔ گزشتہ سال دو سال میں ایسے معاملات شعبے کو ضرور در پیش ہوئے ہوں گے اور انھیں جس طرح اور جس طریقے سے برتا گیا ہوگا وہ بخوبی ممکن ہے کہ آپ کو پسند نہ آیا ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنے اُن تجربات کی روشنی میں آپ کے عہد صدارت میں کوئی کام ایسا نہ ہو جس سے دوسروں کو وہی خیال ہو جو کبھی آپ کو ہوا تھا۔

شعبے میں آپ ریسرچ پر زور دے سکیں تو کیا کہنا، لیکن خود ریسرچ کرنا نسبتہً آسان ہے، دوسروں سے کرانا مشکل ہے۔ اِن دِقتوں سے میں واقف ہوں پھر بھی کوشش تو کرنی چاہیے۔

''مجلۂ علوم اسلامیہ'' کی ادارت و اشاعت کا مسئلہ زیادہ دقت طلب نہیں، یہ آپ کا مسئلہ ہے اور اِسے آپ آسانی سے حل کر سکتے ہیں، زیادہ تعاون نہ ملے جب بھی خود آپ اس کے لیے لکھیں، یٰسین مظہر صاحب اور ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی سے لکھوایئے، اِن لوگوں کا تو پورا تعاون آپ کو حاصل ہوگا، ممکن ہے اور رفقائے شعبہ سے بھی مل جائے۔

Marfat.com

آپ شعبے کے باہر کے لوگوں سے بھی مضمون لکھوائیں، سال میں اگر دو نمبر نکل جائے تو سبحان اللہ، آپ کے پاس فنڈ کی کمی نہیں، صرف توجہ کی ضرورت ہے۔

میرا دس بارہ سال (یکم اپریل ۱۹۵۸ء تا ۱۱ مئی ۱۹۶۸ء) تک اس شعبے سے تعلق رہا ہے، اس لیے دل چاہتا ہے کہ اِس شعبے کا وقار بڑھے۔ آپ سے توقعات ہیں اس لیے لکھ رہا ہوں۔

میں تھوڑی دیر کے بعد پٹنہ کے سفر پر روانہ ہو رہا ہوں۔ عجلت میں یہ چند سطریں میں نے سوچا آپ کو لکھ دوں۔ آپ کے نام عارف نوشاہی کا خط کل آیا ہے بھیج رہا ہوں۔

امید ہے کہ آپ بخیر ہوں گے۔ ''تہذیب الاخلاق'' برابر مل رہا ہے شکریہ۔

خیر طلب

مختار الدین احمد

پروفیسر مختار الدین احمد صاحب نے اپنے شاگردوں کے علاوہ دوسروں کو بھی بہت کچھ سکھایا، سمجھایا اور فائدہ پہونچایا، ایک انگشت شمار تعداد ان لوگوں کی بھی ہے جو کسی نہ کسی بات پر ان سے شاکی ہیں۔ اگر یہ انگشت شمار افراد نہ ہوتے تو پروفیسر مختار الدین احمد صاحب فرشتہ ہوتے بشر نہ ہوتے اور ہم جیسے عقیدت مندوں کو ان کی بشریّت پیاری ہے فرشتگی نہیں۔ اب جب کہ اِن سطروں کا لکھنے والا ''سینیر سٹی زنس'' میں شمار ہونے لگا ہے اب بھی وہ گاہے بہ گاہے صاحب موصوف سے استفادہ کرتا رہتا ہے۔ مستفید ہونے کی تو کوئی عمر ہوتی نہیں۔

پروفیسر مختار الدین احمد صاحب نے بڑی با سلیقہ اور نظم و ضبط کی پابند زندگی گذاری ہے۔ اُن کے ہر کام کے اوقات کار مقرر ہیں اور وہ ہر ممکن کوشش کر کے ہر کام کو مقررہ وقت پر پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اِس عمر میں بھی اِن کی زندگی اُسی سلیقے اور نظم و ضبط کی حامل ہے جو کبھی ان کی جوانی کے زمانے میں رہی ہوگی۔ میں کیا اور میری دعا کیا پھر بھی دست بہ دعا ہوں کہ پروفیسر مختار الدین احمد صاحب تا دیر صحت و سلامتی کے ساتھ ہماری رہنمائی کرتے رہیں۔ آمین

☆☆☆

Marfat.com

پروفیسر اصغر عباس
ڈائرکٹر سرسید اکیڈمی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

شرف مختار

بیس تیس برس پہلے کی بات ہے جب پروفیسر مختار الدین احمد صاحب جنھیں ہم لوگ آرزو صاحب کہتے رہے ہیں شبلی روڈ پر رہتے تھے یہاں پہلا مکان سرور صاحب کا تھا دوسرا آرزو صاحب کا۔ سرور صاحب کے گھر آتے جاتے اکثر آرزو صاحب کو بھی دیکھتا تھا۔ میں انہیں بڑے ادب سے سلام کرتا اور وہ نہایت محبت سے جواب دیتے۔ پھر میں ان کے یہاں آنے جانے لگا، مجھے اسی زمانے سے ڈاکٹر صاحب سے شرف نیاز حاصل ہے۔

مجھے پروفیسر مختار الدین احمد صاحب کی شفقت بزرگانہ کا اندازہ اس وقت ہوا جب شعبۂ اردو میں ایک سلکشن کمیٹی ہوئی، میں لکچرر شپ کا امید وار تھا ڈین فیکلٹی آف آرٹس کی حیثیت سے ڈاکٹر صاحب انتخابی کمیٹی کے اہم رکن تھے۔ میرے مربی سرور صاحب شعبے سے سبکدوش ہو چکے تھے۔ اس انٹرویو کے دوران آرزو صاحب نے میری جس طرح مدد کی اس کی یاد میرے دل منت شناس میں اتنے دن گزرنے کے باوجود باقی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ میرے تقرر میں استاذی المحترم پروفیسر محمود الٰہی صاحب، پروفیسر گوپی چند نارنگ صاحب اور آرزو صاحب کا تعاون شامل تھا یہ سب کے سب مذکورہ انتخابی کمیٹی کے ارکان تھے۔ یاد آتا ہے کہ پروفیسر سید امیر حسن عابدی بھی اس کمیٹی میں شریک تھے۔

جن دنوں یونیورسٹی میں مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے یوم تاسیس کی تقریبات کا آغاز ہوا تھا میں سرسید ہال میں وارڈن تھا۔ اس کے پروسٹ ڈاکٹر حسام الدین فاروقی کو ادب سے اور علی گڈھ سے مرے شغف کا علم تھا اسی لیے انھوں نے مجھے سرسید ہال کی ادبی اور تہذیبی سرگرمیوں کا نگراں بنا دیا تھا۔ میں نے پہلا کام اس دوران یہ کیا کہ سرسید ہال میگزین کا اولڈ بوائز نمبر نکالنے کا منصوبہ بنایا اور مضمون کے لیے من جملہ علی گڑھ کے دیگر اصحاب قلم کے پروفیسر مختار الدین احمد صاحب کی خدمت میں بھی حاضر ہوا، جنھوں نے علی گڑھ میں اپنی طالب علمی کا بیشتر زمانہ سرسید ہال میں گزارا تھا۔ انھوں نے میری درخواست پر ''یادوں کے چراغ'' کے عنوان سے اپنے زمانے کے سرسید ہال کے تأثرات بڑے دلکش

Marfat.com

انداز میں قلمبند کر کے مجھے دے دیے۔ یہ خصوصی شمارہ ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور بعد کو اس کی تقلید میں یونیورسٹی کے کئی جریدوں کے اولڈ بوائز نمبر مختلف ناموں سے نکلے۔

پروفیسر مختار الدین احمد صاحب سے ملیے تو ان کے چہرے کی شگفتگی، ان کی آواز کی نرمی جو خلقی ہے اور ان کی بولتی ہوئی آنکھیں ملنے والے کو یہ یقین دلا دیتی ہیں کہ وہ اپنے عمر بھر کے گہرے دوست سے مل رہا ہے۔ ان کی مجلس میں بیٹھنے والا کسی نہ کسی عنوان بہرہ مند ہو کر اُٹھتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب انسانی رشتوں کی نزاکت اور لطافت کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ جب وہ اپنے کسی جاننے والے کی کسی کامیابی کی خبر سنتے ہیں تو بہت مسرور ہوتے ہیں۔ جب مجھے آکسفورڈ جانے کے لیے ایک فیلوشپ ملی تو مبارک باد دینے غریب خانے پر تشریف لائے۔ دیر تک اپنے زمانے کے آکسفورڈ کی باتیں کرتے رہے اور مفید مشورے دیتے رہے اور رخصت ہوتے ہوئے مجھے ایک خوبصورت سادہ ڈائری دی اور فرمایا کہ اس میں آکسفورڈ کے شب و روز کے تاثرات لکھنا۔ ان کی خوش گفتاری، وضع داری، نفاست اور رکھ رکھاؤ کا نتیجہ ہے کہ وہ علی گڑھ میں شمع محفل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

آرزو صاحب زمانۂ طالب علمی میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے چند منتخب لوگوں میں گنے جاتے تھے۔ اسی زمانے میں پہلی بار اپنے ہم سبق مسعود صدیقی صاحب کے ساتھ مل کر انھوں نے یوم سرسید کے موقع پر سرسید کی تصانیف اور ان کے نوادر کی نمائش کا آغاز کیا۔ اب بھی وہ روایت قائم ہے اور یوم سرسید کے موقع پر ایک علمی و ادبی نمائش کا اہتمام یونیورسٹی کی سرسید اکیڈمی، مولانا آزاد لائبریری کے تعاون سے کرتی ہے۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ اس نمائش کی ابتدا سرسید ہال کے دو طالب علموں مختار الدین احمد اور مسعود صدیقی نے آج سے نصف صدی پہلے ۱۹۵۰ میں کی تھی۔

علی گڑھ میں آرزو صاحب، پروفیسر عبد العزیز میمن جیسے بے مثل عالم کے شاگرد رشید ہیں۔ میمن صاحب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ہر اس صنف کے منتہی تھے جس کا تعلق عربی زبان و ادب سے رہا ہے۔ انگلستان میں بھی ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب نے پروفیسر سر ہملٹن گب جیسے یگانۂ روزگار عالم کی نگرانی میں تحقیق کا ایسا کام کیا جسے علمی حلقوں میں حسن قبول حاصل ہوا۔

عربی ادب کے ساتھ آرزو صاحب کو اردو ادب پر بھی دسترس حاصل ہے۔ اردو تذکروں پر ان کی نظر بڑی وسیع ہے جنوبی ہند سے لے کر شمالی ہند تک اردو کا شاید ہی

Marfat.com

کوئی تذکرہ ہو جس پر انھوں نے گہری نظر نہ ڈالی ہو۔ دہلوی نثر کی اولین کتاب ''کربل کتھا'' اور اردو کے قدیم ترین مخطوطات اور نادر خطوط تلاش کر کے انھوں نے اردو زبان اور ادب کی تاریخ میں بیش بہا اضافہ کیا ہے۔

پروفیسر مختار الدین احمد صاحب کا شمار برصغیر کے ممتاز ماہرین غالبیات میں ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں علی گڑھ میگزین کا ''غالب نمبر'' شائع کیا اور اس میں تحقیق و تنقید کا اتنا قیمتی مواد جمع کر دیا کہ آج تک غالبیات کے طالب علم اس سے استفادہ کرتے رہتے ہیں۔ غالب پر مختار الدین احمد صاحب کی شاید پہلی تحریر ۱۹۳۸ میں ساغر نظامی کے رسالے ''ایشیا'' میں شائع ہوئی تھی یہ رسالہ میرٹھ سے نکلتا تھا غالب پر ڈاکٹر صاحب کی نگارشات کا سلسلہ اس زمانے سے تا حال جاری ہے۔

کہتے ہیں کہ عشق کی انتہا یہ ہے کہ عاشق محبوب سے اس طرح گھل مل جائے جیسے دودھ میں پانی۔ پروفیسر مختار الدین صاحب نے غالب کی ایک ایک خصوصیت کو اس طرح اپنے اندر جذب کر لیا ہے کہ من دتو کا امتیاز مشکل ہو گیا ہے۔ غالب کی طرح آرزو صاحب کے مزاج کا بھی جز و لاینفک مکتوب نگاری ہے۔ خط کا جواب نہ دینا ان کے نزدیک ناقابل معافی جرم ہے اسی لیے وہ خطوط کا جواب اس تیزی سے دیتے ہیں جیسے بقول شخصے ہم آپ ایک دوسرے کو سلام کا جواب دیتے ہیں۔

ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب کی نگارشات کے بارے میں کچھ عرض کرنا ایک اعادہ ہی ہوگا لیکن مجھے آرزو صاحب کی وہ تحریریں بہت پسند ہیں جو انہوں نے اپنے احباب اور واقف کاروں کے بارے میں تاثراتی انداز میں لکھی ہیں۔ ان میں دلچسپی کے بڑے سامان ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ ان میں ان کی جذبات سے بھری پر خلوص شخصیت چلتی پھرتی دکھائی دیتی ہے دوسرے یہ کہ بات کو خوبصورت انداز میں کہنے کا تخلیقی عمل ایسا رس گھولتا ہے کہ عبارت دل موہ لیتی ہے۔ تیرے یہ کہ باوجود عربی کے عالم ہونے کے وہ عربی آمیز اردو نہیں لکھتے۔ ان کی تحریریں بڑی شگفتہ ہوتی ہیں اور ان میں عالمانہ اور ادیبانہ وزن اور وقار بھی ہوتا ہے۔

علی گڑھ میں اب قحط الرجال بڑی تیزی سے طاری ہو رہا ہے اس زمانے میں پروفیسر مختار الدین احمد صاحب کی کڑھی ہوئی شخصیت بسا غنیمت ہے۔

☆☆☆

Marfat.com

پروفیسر محفوظ الحسن
صدر شعبۂ اردو مگدھ یونیورسٹی، گیا

ڈاکٹر مختار الدین احمد
(ایک خط کی روشنی میں)

''مختار نامہ'' کے مرتبین نے ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی بہت ساری صفات کا ذکر کیا ہے ان میں ایک خاص صفت ان کی مکتوب نویسی، بروقت خطوں کا جواب دینا بتایا ہے۔ دوسری خوبی یہ بتائی ہے کہ وہ اتنے ملنسار، خلیق، منکسر المزاج ہیں کہ کسی ملاقاتی کو زحمتِ انتظار نہیں دیتے اور اس کے مزاج و معیار کے مطابق اس سے گفتگو کرتے ہیں،

آئندہ سطور میں ڈاکٹر صاحب موصوف کے ایک خط کا ذکر مقصود ہے جو ایک طرف استفسار کرنے والے کی علمی تشنگی دور کرتا ہے تو دوسری طرف یہ خط آپ کے علمی ذوق وشوق، گہرے مطالعے اور معلومات کا ایک بیش قیمت خزانہ ہونے کا اشاریہ بھی ہے۔

۱۹۷۶ میں ہفتہ وار ''آدرش گیا'' میں میں نے ''چند مکتوب اور مکتوب نگار'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا جس میں ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کو خراج تحسین پیش کی تھی۔ میں آج بھی اپنے اس موقف پر عام پر قائم ہوں جو ان کے سلسلے میں میں نے پچیس سال پہلے تحریر کیا تھا۔ اس مضمون کا ایک اقتباس یہاں پیش کرتا ہوں:

''یہ وہ لوگ ہیں جو علم سینہ کو دفینہ نہیں بناتے بلکہ حتی الامکان تشنگان علم کی سیرابی کو اپنا مقدس فریضہ اور سرمایۂ حیات سمجھتے ہیں۔ ہندو پاک میں ہی نہیں بلکہ دنیا کے ہر اس خطے میں جہاں اُردو زبان و ادب کی درس و تدریس کا کام انجام دیا جارہا ہوگا اصحاب علم و ارباب قلم ان کے نام اور کارناموں سے واقف ہوں گے۔''

جب میں ڈاکٹر عظیم الدین احمد (۱۸۸۰۔۱۹۴۹) کی شخصیت، حیات اور شاعری پر تحقیقی مقالہ سپردِ قلم کر رہا تھا تو ان دنوں اپنے موضوع سے متعلق بہت سی معلومات حاصل کرنے کے لیے متعدد حضرات سے بذریعہ خط و کتابت میں نے رابطہ قائم کیا تھا، ان میں

Marfat.com

سے جن حضرات نے جواب کو اخلاقی فرض تصور کرتے ہوئے جواب سے نوازا تھا، ان میں ایک اہم نام ڈاکٹر مختار الدین احمد کا ہے۔

دراز قد، گندمی رنگ، بھرے ہوئے بدن متناسب اعضاء کی ایک خوبصورت اور پُرکشش شخصیت کا نام مختارالدین احمد ہے جو بے انتہا خلیق، سنجیدہ، ملنسار، منکسرالمزاج، خوش سلیقہ اور خوش اطوار ہے۔ میں ایک بار آپ سے علی گڑھ میں نہ صرف ملا ہوں بلکہ ایک علمی ضرورت سے چند دنوں تک آپ کے گھر پر قیام آپ کی مہمان نوازی کا شرف حاصل کر چکا ہوں اور میں بلا شبہہ کہہ سکتا ہوں کہ آپ کا شمار ان لوگوں میں ہے جو پہلی ہی ملاقات میں اپنی شخصیت کا جادوئی اثر ملنے والے پر چھوڑ جاتے ہیں۔

ڈاکٹر عظیم الدین نے جرمنی میں ایک قدیم مخطوطہ شمس العلوم اڈٹ کیا تھا اور اس پر جرمن زبان میں مقالہ تحریر کیا تھا: مجھے مرحوم پر مقالہ لکھنے کے سلسلے میں اس کتاب کے مصنف اور کتاب کے موضوع کی تلاش ہوئی۔ جب موضوع سے آگاہی نہیں ہوئی اور مصنف کا حال کافی تلاش وجستجو کے بعد بھی معلوم نہ ہوسکا تو استاد محترم ڈاکٹر سید حسنین مرحوم سابق صدر شعبۂ اُردو مگدھ یونیورسٹی بودھ گیا کے ایما پر ڈاکٹر صاحب موصوف سے رجوع کیا۔ انھوں نے تشنہ کام کی علمی پیاس بجھانا ضروری سمجھا اور نہایت مفصل خط لکھا۔ یہ خط حسنین کے نام ہے مگر دراصل مخاطبت اس خط میں مجھ سے ہے۔ اس خط کی نقل پیش خدمت ہے۔

''محبی ڈاکٹر حسنین صاحب! سلام مسنون

محفوظ الحسن صاحب کا خط ملا۔ جس سے معلوم ہوا کہ وہ ڈاکٹر عظیم الدین احمد پر کام کر رہے ہیں اور آپ کی نگرانی میں مقالہ سپرد قلم کر رہے ہیں۔ انہوں نے کچھ معلومات مجھ سے طلب کی تھیں، ان کا خط کاغذوں میں کہیں فی الحال گم ہوگیا ہے یہ خط آپ کو لکھ رہا ہوں کہ آپ اُنہیں بھجوادیں۔ اسی بہانے آپ کی بھی خیر وعافیت معلوم کرنے کا موقع مل گیا۔

یہ عرب مصنف نِشوان بن سعید الحمیری ہے، ابوالحسن یا ابوسعید اس کی کنیت ہے، یہ عربی لغت وادب کا بڑا عالم ہے۔ شمالی صنعائے یمن کے ایک مقام حوث کا رہنے والا تھا۔ سالِ ولادت اب تک معلوم نہیں ہوسکا۔ لیکن سالِ وفات ۵۷۳ھ مطابق

Marfat.com

۱۱۷۸ہے۔تصانیف میں القصیدة الحمیریه ہےجس کا دوسرا نام النشوانیه بھی ہے، الحور العین ،بھی شرح کے ساتھ طبع شدہ ہے۔بعض کتابیں ابھی تک غیر مطبوعہ ہیں ان کے قلمی نسخے کتب خانوں میں موجود ہیں۔ان میں کتاب القوافی ، الفرائد و القلائد ، خلاصة السیرة ،اخبار الملوک التتابعه ، التبیان فی تفسیرالقرآن، احکام صنعاء و زبید، ارجوزة فی الشهور الرومیة قابل ذکر ہیں۔

لیکن نشوان کی سب سے اہم کتاب شمس العلوم و دواء کلام العرب من الکلوم ہے جو یمن کی تاریخ و ادب کے مطالعہ کے لیے بہت مفید ہے۔اس کتاب کا انتخاب ڈاکٹر عظیم الدین احمد نے لائیڈن کے مطبع برل(Brill) سے ۱۹۱۶ء میں اپنے جرمن مقدمے اور تعلیقات کے ساتھ شائع کر دیا ہے۔ یہ کتاب گب میموریل سیریز لندن کے سلسلۂ مطبوعات میں چھپی ہے۔شمس العلوم کے دو حصے قاضی عبداللہ الجرافی الیمنی نے قاہرہ سے چھاپے تھے بعد کو پروفیسر ک۔ف تستر ستین K.V.Zettersteen استاد عربی و اسلامیات جامعۂ اپسالا (Upsala) نے مکمل کتاب کا متن اپنے مقدمہ اور حواشی کے ساتھ مطبع برل(Brill) لائیڈن سے دو جلدوں میں شائع کر دیا ہے۔پہلی جلد ۱۹۵۱ میں اور دوسری جلد ۱۹۵۳ء میں شائع ہوئی ہے۔

نشوان کا ایک گمشدہ قصیدہ میں نے لائیڈن یونیورسٹی کے کتب خانے میں دریافت کیا ہے۔ اِس کے عربی اشعار کی تعداد زیادہ نہیں۔ کچھ شعر عربی کی مختلف کتابوں میں محفوظ ہیں۔

حالات زندگی کی لیے مندرجہ ذیل کتابیں دیکھی جائیں:بغیة الوعاة للسیوطی ، ٤٥٣، معجم الادباء ،لیاقوت الحموی (٢:٦٠٤) اور جرمن اسکالر بروکلمان کی کتاب *GAL* تاریخ ادبیات عربی (۱:۳۶۴)اور اس کی ذیل (۱:۵۲۷ ھ)۔

میرا خیال ہے کہ اسقدر معلومات محفوظ الحسن صاحب کے لیے کافی ہوں گی۔"

ایسے خط کی روشنی میں کیا کوئی شخص ڈاکٹر مختار الدین احمد کی شخصیت کے اس پہلو سے انکار کی جرأت کر سکتا ہے جس کا ذکر میں نے ابتدائی سطور میں "مختار نامہ" کے حوالے سے کیا ہے؟ ایسے لوگوں کی سحر کار شخصیت کی قد آوری کا احساس ان کی عظمت ،شرافت اور خلوص کا جادو اس وقت اور سر چڑھ کر بولنے لگتا ہے جب ایسے حضرات سے بھی سابقہ

Marfat.com

پڑتا ہے جو دُور دیش سے آنے والے کا تحفہ تو قبول کر لیتے ہیں مگر ان سے دو باتیں کرنا اور شرف ملاقات بخشنا اپنی شان کے منافی سمجھتے ہیں ۔اسی علی گڑھ میں اس حادثے کا بھی شکار ہو چکا ہوں ۔(خدا ان کی مغفرت فرمائے اور میری بھی میں نے تو انہیں معاف کر دیا ہے کہ بہر حال وہ بڑے تھے اور عدیم الفرصت بھی) ۔

میں اللہ سے ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب کی صحت وسلامتی اور درازیِ عمر کی دعا مانگتا ہوں کہ تشنگانِ علم کو ان سے سیراب ہونے کا زیادہ سے زیادہ موقع ملے اور میرے جیسے ہزاروں لوگ ان سے مستفیض ہوتے رہیں ۔آمین ثُم آمین ۔

☆☆☆

Marfat.com

پروفیسر شریف حسین قاسمی
صدر شعبۂ فارسی، دہلی یونیورسٹی

پروفیسر مختار الدین احمد
(ایک مایۂ ناز محقق)

پروفیسر مختار الدین احمد صاحب عربی اور اردو زبان و ادب کے ایک مایۂ ناز محقق اور دانشور ہیں ۔ آپ کی اعلیٰ علمی و تحقیقی کاوشیں مجھ ایسے طالب علم کے لیے منارۂ نور کی حیثیت رکھتی ہیں، جن کی روشنی میں قابلِ قدر کام انجام دیے جاسکتے ہیں ۔ حالانکہ آپ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں شعبۂ عربی سے وابستہ رہے ہیں ، لیکن اردو زبان و ادب سے آپ کا جو قلبی تعلق ہے، اس کی وجہ سے آپ ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ تمام اردو دنیا میں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں ۔ غالب پر آپ کی گراں قدر تحریروں کی بنیاد پر آپ کو بجا طور پر ایک صاحبِ نظر غالب شناس بھی سمجھا جاتا ہے اور اسی وجہ سے غالب پر اگر وقیع کام کا کوئی منصوبہ بنایا جاتا ہے تو پروفیسر مختار الدین احمد کی رائے اس میں عام طور پر شامل رہتی ہے ۔ آپ کے وسیع مطالعے، علمی و ادبی امور سے گہری دلچسپی اور آشنائی اور اس نوعیت کے امور کی وضاحت کے لیے آپ کا حسن سلیقہ اور علمی رویہ ایسے چند اوصاف ہیں جن کے صاحبانِ نظر معترف ہیں ۔

آپ کی علمی و تحقیقی کوششوں سے جو آثار وجود میں آئے ہیں ، وہ آج اہم منابع کی صورت میں استعمال کیے جاتے ہیں اور صرف یہی نہیں بلکہ مجھے خوب علم ہے کہ عربی اور اردو ادب پر کام کرنیوالے اپنے اپنے مسائل و مشکلات کے حل کے لیے آپ سے رجوع کرتے ہیں ۔ اس سلسلے میں بے شمار سوال نامے اور استفسارات آپ کو بھیجے جاتے ہیں اور آپ حتی الوسیع ان کا تسلی بخش جواب دینا گویا اپنا فرض عین سمجھتے ہیں ۔

راقم الحروف کو مختلف علمی و ادبی امور میں آپ سے راہنمائی حاصل کرنے اور مشکلات کے دور کرنے کا موقع ملا ہے ۔ مجھے یہ احساس ہے کہ آپ جس انداز سے مختلف علمی مسائل کے حل کرنے اور متعلقہ نکات بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں، وہ اب اس زمانے میں بڑا نادر عمل ہے۔ آپ نے ایک بار ایک استفسار کے جواب میں نہ صرف وہ معلومات فراہم کردیں جو آپ کے پاس موجود تھیں، بلکہ خود ہی ان حضرات کو بھی میری

Marfat.com

مدد کے لیے خطوط لکھے جن کے پاس پروفیسر مختارالدین صاحب کی نظر میں ایسا مواد موجود تھا جس کی فراہمی میری علمی و ادبی مشکلات کے حل کرنے میں ضروری تھیں۔ بڑی تعداد میں فضلا سے آپ کے قریبی تعلقات ہیں ۔آپ کے علمی وقار کی وجہ سے، آپ جس کو بھی علمی مدد کے لیے لکھتے ہیں، وہ حتی الامکان ان کی فرمائش (دوسروں کے لیے بھی پوری کرنے میں) خوشی محسوس کرتا ہے۔ علمی مسائل حل کرنے کے لیے متعلقہ منابع کے نام، کتابوں سے ضروری صفحات کے فوٹو اسٹیٹ اور اس کے علاوہ اس ضمنی مواد کی نشاندہی جو مقالات وغیرہ کی شکل میں موجود ہیں، یہ سب کام پروفیسر مختا رالدین احمد صاحب نہایت دلچسپی اور بہ طیب خاطر انجام دیتے ہیں ۔ وہ اسے بار نہیں سمجھتے، بلکہ مسرت محسوس کرتے ہیں کہ اس طرح ایک علمی کام ان کی معمولی مدد سے ایک حد تک مکمل صورت میں پیش کیا جاسکے گا۔

ہم آپ کی علمی زندگی پر نظر ڈالیں تو پتا چلتا ہے کہ آپ نے گوناگوں خدمات انجام دی ہیں ۔ آپ عربی کے نامور استاد، علمی و تحقیقی مجلّات کے سنجیدہ اور فاضل مدیر، صاحبِ نظر محقق و ادیب اور ایک علمی راہنما کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں اور ان تمام ہی میدانوں میں آپ نے اپنے امتیازات کے نمایاں اور اہم نقوش چھوڑے ہیں۔

آپ کی تصانیف و تالیفات پر نگاہ ڈالیے تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے جس موضوع پر بھی لکھا ہے، اس کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی ہے ۔ کوئی وضاحت طلب امر تشنۂ توضیح نہیں۔ چوں کہ وہ خود اس انداز سے کام کرتے ہیں، اس لیے چاہتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ دوسرے بھی اسی انداز سے کام کریں اس لیے سائل کی علمی مدد کرنا ان کے مزاج کا تقاضا ہے ۔ اس میں کسی قسم کی مصلحت کو دخل نہیں ۔

راقم نے آپ کی دو کتابیں احوال غالب اور نقد غالب کا خاص توجہ سے مطالعہ کیا ہے ۔ ان دونوں کتابوں میں غالب کے بارے میں جو مواد فراہم کیا گیا ہے، اس سے غالب کی زندگی اور آثار پر نہ صرف نئی روشنی پڑتی ہے، بلکہ غالب پر مزید تحقیقی کام کرنے کے امکانات بھی روشن ہوجاتے ہیں۔ پروفیسر مختار الدین احمد صاحب نے زبان و بیان کی سادگی اور صراحت سے جن علمی مسائل اور تحقیقی امور سے بحث کی ہے، اس کی وجہ سے آپ کی تصانیف کو قبول عام نصیب ہوا ۔ پروفیسر مختار الدین احمد صاحب عربی، فارسی اور اردو پر یکساں قدرت رکھتے ہیں اور مشرقی علوم کے مختلف گوشوں پر علمی و تحقیقی کام کرنے کے لیے ان تینوں زبانوں سے مکمل آشنائی نے آپ کو ایک خاص امتیاز بخشا ہے ۔ تحقیقی کاموں میں

Marfat.com

محتاط رویے نے آپ کی تصانیف کو ہر لحاظ سے بڑی حد تک مکمل صورت عطا کی ہے۔

عربی زبان کے جید عالم اور مشہور زمانہ فاضل پروفیسر عبد العزیز میمن اور پھر پروفیسر سر ہملٹن گب، پروفیسر اے۔ ایف۔ ایل بیسٹن، پروفیسر کاہلے، پروفیسر آرتھر جان آربری ڈاکٹر رچرڈ والزر ایسے اساتذہ کی نگرانی اور راہنمائی میں مختار الدین صاحب کا علمی و تحقیقی ذوق پروان چڑھا ہے۔ اس کے بعد فارسی اور اردو کے عظیم محقق اور منفرد غالب شناس جناب قاضی عبد الودود مرحوم کی رفاقت نے آپ کے اس ذوق وشوق کو نکھارا ہے۔ اس طرح پروفیسر مختار الدین احمد صاحب کی شخصیت میں مغرب کی شرق شناسی اور اس میدان میں ہندوستانی روایات کے امتیازات جمع ہوگئے ہیں۔ ان روایات کے سنگم کی چھاپ آپ کے علمی و تحقیقی کارناموں پر بخوبی نظر آتی ہے۔

مخطوطات کی تلاش، ان کی شناخت اور پھر ان کا باقاعدہ تعارف بھی آپ کا ایک امتیازی وصف ہے۔ فارسی اردو اور عربی کے متعدد اہم اور منفرد خطی نسخے آپ نے دریافت کیے ہیں۔ ان میں سے بعض آپ کی کوششوں سے ترتیب و تدوین کے جدید طریقوں کے مطابق منظر عام پر آچکے ہیں۔ آپ کی متلاشی نظروں نے پچھلی صدیوں کے کچھ ایسے آثار ڈھونڈ نکالے ہیں جن کا ذکر دیگر مآخذ میں نظر آتا تھا اور گمان تھا کہ وہ اب مفقود ہیں۔ اس ضمن میں یورپ کے مخطوطات میں مفتی صدرالدین آزردہ کے اس تذکرے کا ذکر ضروری ہے جس کا شیفتہ نے گلشن بیخار میں ذکر کیا ہے۔ مزید برآن فضل علی فضلی کی کربل کتھا اور حیدر بخش حیدری کے تذکرۂ گلشن ہند کے خطی نسخے بھی آپ نے دریافت کیے ہیں اور انھیں اپنے خاص علمی انداز سے شائع کیا ہے۔ مخطوطات سے خاص دلچسپی کے باعث آپ نے خطی نسخوں کے چند ذخائر کی فہرستیں خود تیار کی ہیں اور بعض دیگر فضلا کی مرتبہ فہرستوں پر نظر ثانی بھی کی ہے اور انھیں شائع کیا ہے۔

آپ کی ان علمی کاوشوں کو بجا طور پر سراہا گیا۔ میرا کیڈمی، بہار اکیڈمی، اتر پردیش اکیڈمی اور غالب انسٹی ٹیوٹ نے آپ کو اپنے ایوارڈ پیش کیے ہیں اور صدر جمہوریہ ہند نے انھیں عربی زبان و ادب کے مستند عالم و محقق کی حیثیت سے آج سے کوئی تیس سال پہلے سرٹیفکٹ آف آنر سے نوازا ہے۔

اس وقت آپ کی عمر ۸۰ سال کے لگ بھگ ہے، لیکن آج بھی آپ انہماک اور توجہ سے اپنے علمی کاموں کو انجام دینے میں مصروف ہیں۔ خداوند عالم کی بارگاہ میں دست بہ دعا ہوں کہ آپ صحت و سلامی کے ساتھ اسی طرح اپنے علمی کام انجام دیتے رہیں اور تشنگان علم ان کی کوششوں سے سیراب ہوتے رہیں۔ آمین۔

Marfat.com

پروفیسر شاہ عبدالسلام
شعبۂ عربی، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ

پروفیسر ڈاکٹر مختار الدین احمد

(اقدار و معیار کے محافظ)

چراغ سے چراغ جلتے ہیں تو ہر طرف روشنی ہوتی ہے اور جب یہ سلسلہ کچھ مدھم پڑ جاتا ہے یا ٹوٹ جاتا ہے تو فضا میں تاریکی چھا جاتی ہے۔ علوم وفنون کے حوالے سے بھی صورت حال کچھ اسی طرح ہے کہ اگر علم وادب کی ترسیل وابلاغ میں کمی یا کوتاہی واقع ہوتی ہے یا کم علموں کے ہاتھ میں قلم آجاتا ہے تو پورا معاشرہ روبہ زوال ہوجاتا ہے۔ مگر اس کے برعکس اگر صاحبانِ علم وادب کے حوالے سے اپنی ذمہ داریوں کو نیک نیتی کے ساتھ انجام دیتے، اپنے علمی ورثے کے آثار واقدار کا تحفظ کرتے اور اپنی آنے والی نسلوں کے لیئے ہوش مندی اور سنجیدگی کا مظاہرہ کرتے ہیں تو پھر وہ معاشرہ مہذب، منظم اور ترقی یافتہ کہلاتا ہے اور وہ پوری قوم دیگر اقوام میں نمایاں مقام حاصل کرتی ہے اور سرخ رو ہولی ہے۔

چونکہ راقم الحروف کے اسلاف پچھلی پانچ چھ بلکہ اس سے بھی زیادہ پشتوں سے تدریس وتعلیم کے میدان میں رہے ہیں اسی لیے فدوی اپنے بزرگوں کی اعلا علمی اور ادبی روایات سے واقف بھی ہے اور ان پر عمل پیرا رہنے کے لیے سنجیدہ بھی۔ اس نے اپنے اسلاف سے یہی کچھ سیکھا ہے کہ علمی اقدار ومعیار کا تحفظ ہی روشن مستقبل کی ضمانت ہے۔ اسی لیے ایسے لوگ جو علمی اور تہذیبی ورثے اور اس کے اقدار و معیار کے تحفظ پر زیادہ زور دیتے ہیں، میرے نزدیک بہت ہی زیادہ قابل احترام ہوتے ہیں۔

عصر حاضر کی ایسی ہی چند سرکردہ اور قابل احترام شخصیتوں میں پروفیسر ڈاکٹر مختار الدین احمد کا نام بھی سر فہرست ہے۔ پروفیسر صاحب نے اپنی پوری زندگی تعلیم وتدریس اور تصنیف وتحقیق میں گذاردی اور اپنی تربیت اور رہنمائی میں متعدد ایسے شاگرد پیدا کردیے ہیں جو توقع ہے کہ آگے ان کے نقش قدم پر چل کر علم کی اعلا قدروں کی حفاظت کرتے رہیں گے۔

Marfat.com

پروفیسر صاحب کو میں نے تقریباً بیس برس قبل پہلی بار اس وقت دیکھا تھا جب وہ شعبۂ عربی لکھنؤ یونیورسٹی میں ایک سلکشن کمیٹی کے سلسلے میں تشریف لائے تھے اوراس وقت کے صدر شعبۂ عربی پروفیسر محمد رضوان علوی مرحوم نے آپ کی شخصیت، علمی تبحر اور تدریسی فراخ دلی کا تعارف کرایا اور میں ان کی شخصیت سے بہت متاثر ہوا۔

اس کے بعد پھر جب آہستہ آہستہ ان سے رابطہ بڑھا اور ان سے خط کتابت شروع ہوئی اور ملاقاتیں رہیں تو پھران کی علم دوستی اور ادب نوازی نے ان کی شخصیت کواور بھی پرکشش بنادیا۔ میں ذاتی تجربے کی بنیاد پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ طلباء اور محققین کے حق میں وہ ہمیشہ معین ومددگار ثابت ہوتے ہیں۔ کسی موضوع کے اصل مراجع تک پہنچانے اورمفید ترین حوالوں تک رسائی حاصل کرانے میں مختار الدین احمد صاحب بڑی فراخ دلی کے ساتھ پیش آتے ہیں اور اپنی معلومات، علمی استعداد اور اپنے تجربوں کا خزانہ بے دریغ اسکالروں اور محققین کے سامنے کھول کر رکھ دیتے ہیں۔ مزاجاً اصول پسند اور طبعاً خوددارو غیور ہونے کے باعث ان سے قریب ہونے میں تھوڑا وقت ضرور لگتا ہے مگر ایک بارقربت حاصل ہونے کے بعدان کی علمی فیض رسانی طلباء اور علم دوست حضرات کو مالا مال کرتی رہتی ہے۔ میں بھی ان کی علمی فیاضیوں سے بارہا مستفید ہواہوں بلکہ ہوتا رہتا ہوں۔

مختارالدین احمد صاحب نے ہندوستان کے مستند ومعروف عربی کے اسکالر علامہ عبدالعزیز میمن مرحوم کی شاگردی میں رہ کر تحقیق وتنقید کی اعلیٰ اور معتبر قدروں کو برتنے اور ان سے فیض یاب ہونے کا جو سلیقہ سیکھا اسے انھوں نے اپنی علمی زندگی میں بروئے کارلاکر خود بھی نام کمایا اور دوسروں کو بھی فائدہ پہونچایا۔اوکسفورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر ھملٹن گب (H.A.R. GIBB) کی نگرانی میں مغرب کے تحقیق وتنقید کے اعلیٰ اصولوں کو سمجھنے سیکھنے کے بعد زبان وادب کی تدریس اور علمی تحقیق اورمخطوطات کی تصحیح و تدوین میں انھیں استعمال کرنے کا ڈھنگ انھیں یورپ کے قیام کے دوران ہی حاصل ہوا۔ اس سے خود بھی وہ مستفید ہوئے اور دوسروں کو بھی فیض یاب کیا۔

آرزو صاحب نے شرق اوسط، برطانیہ، ہالینڈ، جرمنی، فرانس اور ترکی میں محفوظ عربی فارسی اور اردو کے مخطوطات کے خزانوں کو دیکھنے پرکھنے اور انھیں منظرعام پرلانے کا اہم کام انجام دے کرانھیں نئی زندگی عطا کی ہے۔ الحماسة البصريه، ديوان ابن الدمينة، قصيدة الاعشى الكبير، فضائل من اسمه احمد و محمد، رسالة المبرد النحوى وغیرہ کی محققانہ تدوین نے انھیں ہندوستان کے ساتھ ساتھ عالم عرب

Marfat.com

میں بھی وقار واعتبار دلوایا۔ دمشق کے مجمع اللغة العربیہ اردن کے مجمع اللغة العربیة الاردنیة، مصر کی جمعیة العالمیة لاحیاء التراث العربی اورعمان کی المجمع الملکی لبحوث الحضارة الاسلامیة جیسے موقر علمی اداروں نے آپ سے تعلق قائم کر کے اور اپنے اداروں کا رکن بنا کر آپ کی عربی واسلامیات میں آپ کے تحقیقی کاموں کا اعتراف کیا اور اعزازات سے نوازا۔

آرزو صاحب شعبۂ عربی علی گڑھ یونیورسٹی میں کوئی پینتس سال تک درس دیتے رہے اور سترہ سال تک وہ کرسی صدارت کو زینت بخشتے رہے ۔ ایک کامیاب اور فعّال صدر شعبہ کی حیثیت سے انھوں نے کارہائے نمایاں انجام دیے۔عربی کے ساتھ ساتھ انھوں نے اردو زبان وادب میں بھی تحقیق وتدوین کے جوہر دکھائے اور متعدد اردو مخطوطات کے متون کی پہلی مرتبہ تدوین کی اور وہ انھیں منظر عام پر لائے۔ غالب شناسی کی روایات کو مستحکم کرنے اور آگے بڑھانے میں آرزو صاحب کی خدمات قابل تحسین بھی ہیں اور قابل رشک بھی۔ اس سلسلے میں آپ کی مرتب کردہ کتابیں ''احوال غالب''، ''نقد غالب'' اورغالبیات پر قیمتی تحقیقی مقالات جن کی تعداد بیس پچیس سے کم نہ ہوگی ثبوت میں پیش کیے جا سکتے ہیں۔

مختارالدین صاحب کی مجموعی علمی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ان کی ان خدمات کے اعتراف میں ماضی میں دو کتابیں ''نذر مختار'' اور ''مختارنامہ'' شائع ہوکر منظر عام پر آچکی ہیں۔ ان مجموعوں میں ملک اور بیروں ملک کے معتبر اور معروف مصنفوں اور ادیبوں نے ان کی علمی خدمات کا بھرپور جائزہ لیا ہے اور ان کے طویل علمی سفر کا احاطہ کیا ہے۔

قدرت نے نہایت فیاضی کے ساتھ محترم مختارالدین احمد صاحب کو ان اخلاق حسنہ سے نوازا ہے جو بقول شخصے انسان کو انسان کامل بناتی ہیں۔ مستقل مزاجی وخود اعتمادی، ہمدردی ومحبت، عقل وفہم، دانائی ودوراندیشی، وقار ومتانت، قدردانی وحوصلہ افزائی، فراخ دلی وعالی ہمتی، علم دوستی اور سنجیدگی ان کے مزاج کا خاصہ ہیں۔

ایسی جامع حیثیات کے انسان روز روز نہیں پیدا ہوتے ہیں۔ آج کے دور میں جبکہ قحط الرجال ہے اپنے درمیاں ایسی ذی علم شخصیت کی موجودگی پر ہم جتنا فخر کریں بجا ہے۔ ایسی ہی شخصیت کے لیے میر تقی میر سے استفادہ کرتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے

مت سہل انھیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

Marfat.com

ڈاکٹر شمس بدایونی

۵۸، نیو آزاد پُرم کالونی، آئرٹ نگر، بریلی

مکتوباتی سرمایۂ ادب اور مختار الدین احمد

اردو میں مکتوباتی ادب کے سرمائے کی عمر تقریباً دو سو برس ہے ۔ عام طور پر مکتوباتی ادب پر جن اہل قلم نے کتابیں اور مضامین لکھے ہیں اُن میں اردو کے اَولین دستیاب شدہ خط محررہ ۶/ دسمبر ۱۸۲۲ء (مکتوب نگار نواب حسام الدین ابن والا جاہ بہادر نواب کرناٹک ۔ مکتوب الیہ نواب بیگم صاحبہ) کو بنیاد بنا کر اردو خطوط نگاری کے آغاز کا سال ۱۸۲۲ء عیسوی قرار دیا گیا ہے ۔ ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو نے بھی اردو کے قدیم خطوط تلاش کیے اور اُن کی تاریخ کا تعین کیا ہے ۔ اُن کی تلاش و تحقیق کی رو سے اردو کا پہلا خط ۱۸۰۳ء عیسوی میں لکھا گیا تھا جس کی مکتوب نگار فقیرہ بیگم اور مکتوب الیہ مرزا محمد ظہیر الدین علی بخت بہادر اظفری دہلوی (۱۸۵۹۔۱۸۱۸ء) تلمیذ میر تھے ۔ اس خط کی تاریخ تحریر ۱۵/ رجب ہے لیکن سال تحریر اس پر درج نہیں ۔ پروفیسر صاحب نے اس قیاس پر کہ اظفری نے 'واقعات اظفری' میں واقعات تاریخی ترتیب سے درج کیے ہیں اس خط کا سالِ تحریر ۱۲۱۸ھ/۱۸۰۳ء قرار دیا ہے ۔ اب تک کی دریافت کے مطابق اردو کا قدیم ترین خط یہی ہے ۔ یہ خط ڈاکٹر صاحب نے واقعات اظفری (۱۲۲۱ھ/ ۱۸۰۶ء) نسخۂ جامعہ ٹیوبنگن جرمنی سے اخذ کیا تھا۔ [1]

ڈاکٹر صاحب نے اردو کے بعض اور بھی قدیم مکاتیب تلاش کیے، ان کی قدامت کی تحقیق کی اور ان کا صحیح متن تاریخ و سنہ کے تعین کے ساتھ شائع کیے ۔ راقم الحروف کے نام ایک خط (مکتوبہ ۱۷/ مارچ ۱۹۸۵ء) میں وہ لکھتے ہیں۔

> میں نے اردو کے متعدد قدیم خطوط تلاش کیے ہیں اور
> ان میں سے کئی شائع بھی کر دیے ہیں ۔ انور علی یاس مرحوم [2] کا خط

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے ۔ اردو کا ایک قدیم رقعہ مرتب ۔ پٹنہ فروری ۱۹۸۴، صحیفہ لاہور، اپریل جون ۱۹۸۴ء

[2] انور علی یاس آروی (ف ۱۲۶۲ھ/۱۸۴۶ء) تلمیذ غلام علی راسخ عظیم آبادی (ف ۱۲۳۸ھ/ ۲۳۔۱۸۲۲ء)

Marfat.com

میں نے بہار کی ایک خانقاہ کے کتب خانے میں دریافت کیا تھا۔ ایک قدیم مجموعے میں جس میں فارسی خطوط تھے اردو کا یہ رقعہ نظر پڑ گیا، اور میں نے اسی وقت اسے نقل کرلیا۔ کچھ عرصہ بعد اسے میں نے سہ ماہی رسالہ ''معاصر'' کے ایک شمارے میں شائع کرادیا تھا۔[1]

مجھے ایک دوسرے خط (مکتوبہ ۱۵ مارچ۔ ۱۹۸۵ء) میں وہ لکھتے ہیں:

''میں نے رسالۂ معاصر پٹنہ میں یاس عظیم آبادی کا ایک اردو رقعہ محررہ ۱۲۶۲ھ [2] بھی شائع کیا ہے۔ یہ غالباً ۱۲۶۲ھ کا لکھا ہوا ہے۔ اردو کے کچھ قدیم رقعات رسالہ ''آج کل'' دہلی میں چھپے ہیں تاریخ یاد نہیں۔ گارساں دتاسی کا ایک خط بنام سرسید احمد خاں بھی خیال آتا ہے کہ ''آج کل'' میں چھپا تھا۔ یہ پیرس میں مجھ کو ملا تھا اور غالباً یورپ کے دوران قیام (۱۹۵۳۔۱۹۵۶ء) مضمون لکھ کر اشاعت کے لیے عرش ملسیانی مرحوم کو بھیجا تھا اس خط کا۔''

غالبؔ سے قبل اردو خطوط نگاری کے بعض نمونے خواجہ احمد فاروقی نے بھی اپنے تحقیقی مقالے ''اردو مکتوب نگاری کا ادبی و تاریخی ارتقاء'' میں پیش کیے ہیں۔ ان میں آرزو صاحب کا دریافت کردہ انور علی یاس کا خط بھی شامل ہے لیکن ان خطوط کے حصول کے باوجود وہ اردو مکتوب نگاری کے آغاز کے بارے میں صحیح نتائج اخذ کرنے میں ناکام رہے، اور یہ تحقیقی بحث غلط مبحث کا رُخ اختیار کرگئی۔[3] ڈاکٹر آرزو صاحب ایک ایسے محقق ہیں جنھوں نے قدیم رقعات کی صرف تلاش پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ ان سے بعض اہم نتائج بھی برآمد کیے۔ قدیم رقعات سے متعلق ان کے دو مضامین اور شائع ہوئے ہیں۔

۱۔ مانچسٹر میں اردو کے کچھ قدیم رقعات — آج کل — مارچ ۱۹۵۶ء

۲۔ راجہ رام موہن رائے کا ایک اردو رقعہ — آج کل — جون ۱۹۵۶ء

گارساں دُتاسی کے نام۔

اردو مکتوبات کا پہلا مطبوعہ نمونہ آج سے تقریباً ایک سو سینتیس (۱۳۷) سال پہلے

---

[1] انور علی یاس کا اردو خط۔ سہ ماہی معاصر پٹنہ حصہ (۲) ۱۹۵۲ء

[2] مطابق ۱۸۴۵

[3] ملاحظہ کریں عبد اللطیف اعظمی کا مضمون 'اردو مکتوب نگاری کا آغاز'، مطبوعہ سہ ماہی روشن بدایوں جلد ۷ شمارہ ۱ / ۱۹۸۴

Marfat.com

۱۸۶۵ء میں ''نامۂ غالب'' (مرزا غالب) کے نام سے شائع ہوا تھا۔ یہ دراصل ''قاطع برہان'' کے جواب میں ۱۶ صفحے کا ایک طویل خط ہے جو مطبع محمدی دہلی میں ۱۸۶۵ء میں چھپا۔ اس کے بعد ۱۸۶۶ء میں انشائے اردو (مولوی ضیاء الدین خاں دہلوی)، ۱۸۸۶ء میں انشائے سرور (رجب علی بیگ سرور)، ۱۸۹۱ء میں فغان بے خبر (غلام غوث بے خبر) ۱۹۴۰ء میں انشائے بے خبر [1] خطوط کے مجموعے شائع ہوئے۔ دراصل اردو کے ابتدائی دور کے خطوط نگاروں کا یہ دور رجب علی بیگ سرور (ف ۱۸۶۸ء) سے محمد حسین آزاد (ف ۱۹۱۰ء) تک نو (۹) مکتوب نگاروں کو محیط ہے ان کے نام حسبِ یل ہیں۔

۱۔	رجب علی بیگ سرور	(۱۷۸۷۔۱۸۶۸ء)
۲۔	مرزا غالب	(۱۷۹۷۔۱۸۶۹ء)
۳۔	خواجہ غلام غوث بے خبر	(۱۸۲۴۔۱۹۰۵ء)
۴۔	نواب واجد علی شاہ	(۱۸۲۳۔۱۸۸۷ء)
۵۔	سرسید احمد خاں	(۱۸۱۷۔۱۸۹۸ء)
۶۔	امیر مینائی	(۱۸۲۸۔۱۹۰۰ء)
۷۔	داغ دہلوی	(۱۸۳۱۔۱۹۰۵ء)
۸۔	محسن الملک	(۱۷۳۷۔۱۹۰۷ء)
۹۔	محمد حسین آزاد	(۱۸۳۲۔۱۹۱۰ء)

یہ وہ مکتوب نگار ہیں جن کے خطوط کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں اور جن کی مکتوب نگاری کی الگ الگ خصوصیات ہیں۔

ڈاکٹر آرزو صاحب نے مکتوباتی ادب کے ادبی و تاریخی ارتقاء کو نظر میں رکھتے ہوئے متقدمین کے اُس دور کی چار ممتاز شخصیتیں یعنی غالب، غلام غوث بیخبر، سرسید احمد خاں اور محمد حسین آزاد کے کچھ خطوط کی بازیافت کی، اُن کو جانچا، پرکھا، اُن کے علمی مسائل، ان کی ادبی خصوصیات پر اظہار خیال کیا اور ان پر مناسب تعارفی نوٹ اور حواشی لکھے۔ ان میں کچھ شائع کیے کچھ شائع ہونے والے ہیں۔ مکتوباتی ادب کی تاریخ کی یہ گم شدہ کڑیاں ڈاکٹر آرزو کی محنت و کاوش سے جڑ سکیں۔ اس ضمن میں ان کے حسبِ یل مضامین شائع ہو چکے ہیں۔

---

(۱) عبداللطیف اعظمی نے انشائے بے خبر کی ترتیب کا زمانہ ۱۸۹۱ء یا اس کے آس پاس قرار دیا ہے۔ بے خبر کی وفات (۱۹۰۵ء) کے ۳۵ سال بعد یہ مجموعہ آگرہ سے شائع ہوا تھا۔ ملاحظہ کریں حوالۂ سابق۔

Marfat.com

غالب:

۱۔ غالب کے تین غیر مطبوعہ خطوط	آج کل دہلی مئی ۱۹۵۲ء
۲۔ غالب کے چند نایاب خطوط	نگار لکھنؤ جولائی ۱۹۵۲ء
۳۔ غالب کا قدیم ترین مکتوب	ہمایوں لاہور سالنامہ ۱۹۵۳ء
۴۔ غالب کا ایک غیر مطبوعہ خط اور اصلاحیں	آج کل فروری ۱۹۵۵ء
۵۔ غالب کے آٹھ خط	نقوش لاہور مکاتیب نمبر اول ۱۹۵۷ء
۶۔ غالب کے خطوط ایک قدیم مجموعے میں	آج کل دہلی مارچ ۱۹۶۷

سرسید احمد خاں:

۱۔ مکاتیب سرسید	نقوش لاہور شمارہ ۳۱، ۳۲
۲۔ مکاتیب سرسید	ہماری زبان علی گڑھ ۱۶/اپریل ۱۹۵۳ء
۳۔ سرسید کے کچھ غیر مطبوعہ خطوط	فکر و نظر، علی گڑھ جنوری ۱۹۶۰ء
۴۔ مکاتیب سرسید	فکر و نظر، علی گڑھ اپریل ۱۹۶۰ء
۵۔ مکاتیب سرسید	فکر و نظر، علی گڑھ اکتوبر ۱۹۶۲ء
۶۔ مکتوب سرسید	فکر و نظر، علی گڑھ جنوری ۱۹۶۲ء
۷۔ سرسید کے دو غیر مطبوعہ خط	فکر و نظر، علی گڑھ اپریل ۱۹۶۲ء

سرسید احمد خاں کے میری ناقص معلومات کے مطابق مکتوبات کے سات مجموعے شائع ہو چکے ہیں، لہٰذا ڈاکٹر آرزو نے سرسید کے کچھ غیر مطبوعہ خطوط تلاش کر کے اس سلسلے میں جو کام کیا ہے وہ گزشتہ کام پر اہم اضافہ ہے۔ یہ ایک خوش آیند بات ہے کہ ان کے تالیفی پروجیکٹ میں ''کلیات مکاتیب سرسید'' کی ترتیب و تدوین بھی شامل ہے۔ یہ کلیات اردو کے مکتوباتی ادب میں غالب اور اقبال کے بعد تیسری بڑی شخصیت سرسید کے حوالے سے مکتوباتی ادب کی نوعیت، اس کی جہتیں اس کے متفرق اسلوب سے بھی متعارف کرائے گی، خصوصاً اس لیے کہ سرسید، غالب کے معاصر ہیں اور دونوں ایک دوسرے سے متاثر ہیں۔

ڈاکٹر آرزو نے متوسطین میں اکبر الٰہ آبادی (ف ۱۹۲۱ء) کی شخصیت کا انتخاب کیا اور ان کے غیر مطبوعہ خطوط جمع کیے۔ قدیم اخبارات و رسائل سے ان کے مطبوعہ خطوط تلاش کیے۔ ان سب کو یکجا کر کے مع حواشی علی گڑھ میگزین کے اکبر الٰہ آبادی نمبر (۱۹۵۱ء) میں شائع کیے۔ کچھ نسخے فاضل چھپوا کر ان کو کتابی صورت دی۔ ڈاکٹر صاحب کو اس پچاس سال

Marfat.com

کے عرصے میں تلاش سے اکبر کے بہت سے غیر مطبوعہ انگریزی اور اردو خطوط ملے ہیں۔ آج کل وہ ''کلیات اکبرالہ آبادی'' کی ترتیب میں مصروف ہیں۔

اردو کے مکتوباتی ادب کی ہنوز تاریخ شائع نہیں ہوئی۔ آج سے نصف صدی پیشتر جولائی ۱۹۵۲ء میں ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی (ف ۱۹۹۵ء) نے پی، ایچ ڈی کی لیے مقالہ بہ عنوان ''مکتوبات اردو کا ادبی و تاریخی ارتقاء'' پیش کیا تھا، جس پر ان کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض ہوئی، لیکن یہ مقالہ آج تک شائع نہیں ہوا۔ اس کی عدم اشاعت کی کیا وجوہ رہیں یہ خواجہ صاحب ہی بہتر جانتے ہوں گے۔ دوسری کوشش عبداللطیف اعظمی (ف ۲۰۰۲ء) نے کی۔ انھوں نے ۱۹۷۵ء میں ایم اے کے لیے ''جدید اردو ادب کے خطوط: ایک تنقیدی جائزہ'' کے عنوان سے مقالہ لکھا تھا، یہ بھی غیر مطبوعہ رہا۔ ۱۹۸۵ء میں اس مقالے کا مقدمہ راقم الحروف حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا اور اسے 'روشن' کے خطوط نمبر (ج ۷، ش ۲، ۱۹۸۴ء) میں شائع کردیا۔ ایم اے کے بعد اعظمی صاحب نے مکتوب نگاری سے متعلق مزید مواد جمع کیا اور ترتیب بھی دیا۔ ڈاکٹر عنوان چشتی نے مکاتیب احسن (جلد اول، دہلی ۔۱۹۷۷ء) کے مقدمہ میں ان کے مسودے ''اردو مکتوب نگاری'' کا حوالہ دیا ہے (ص: ۴۳) یہ مسودہ بھی دن کا اجالا نہیں دیکھ سکا۔ اب اعظمی صاحب کی وفات کے بعد اس کو بھی مرحوم تصور کر لینا چاہیے۔ عبداللطیف اعظمی نے اپنے نام کے خطوط بنام ''مشاہیر کے خطوط'' (دہلی ۱۹۷۵ء) شائع کیے۔ اس کے پیش لفظ میں انھوں نے خطوط کے مجموعوں کی توضیحی فہرست شائع کرنے کا ذکر کیا (ص: ۸) لیکن یہ کام بھی انجام پذیر نہیں ہوا۔ ڈاکٹر آرزو ان معنوں میں ان دو معاصرین سے سبقت لے گئے۔ انھوں نے مکتوبات سے متعلق اپنی جملہ تلاش و تحقیق، معلومات و ذخیرے کو وقف عام کردیا اور یہ سلسلہ ابھی جاری ہے۔ اس طرح وہ لگاتار مکتوباتی ادب کی تاریخ کی کڑیوں میں اضافے کا موجب بن رہے ہیں۔

متاخرین اور معاصرین میں انھوں نے مولوی عبدالحق، ڈاکٹر ذاکر حسین، رشید احمد صدیقی اور کچھ دوسرے اصحاب کے خطوط مع حواشی شائع کیے ہیں، ان کی تفصیل یہ ہے:۔

۱۔ اکبر صاحب کے خط جلد ۳ ناشر: خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ۔ ۱۹۹۹

ان ۶۱ خطوط کے مکتوب الیہ مولانا عبدالماجد دریابادی ہیں۔ یہ ۱۹۲۵ تا ۱۹۲۹ء کے لکھے ہوئے ہیں

۲۔ اکبر صاحب کے خط جلد ۴ ناشر: خدابخش لائبریری پٹنہ۔ ۱۹۹۹ء

Marfat.com

اس جلد میں ۲۸ مکتوب الیہم کو لکھے گئے اکر صاحب کے ۷۰ خطوط مرتب کیے گئے ہیں۔ مع تعارف مکتوب الیہم اور مع حواشی و اشاریہ

۳۔ مکاتیب اختر میاں اختر جوناگڑھی تحقیق (حیدرآباد، سندھ) نمبر ۸، ۹، ۱۹۹۵)
مختلف مشاہیر کے نام ۳۶ خطوط مع تعارف و حواشی

۴۔ ممتاز حسن کے خطوط دوارکاداس شعلہ کے نام۔ مشمولہ ارمغان علمی، لاہور ۱۹۹۸
ممتاز حسن (ف ۱۹۷۴ء) کے ۲۳ خطوط پر معلومات تمہید کے ساتھ

۵۔ رشید احمد صدیقی کے چند غیر مطبوعہ خطوط غالب نامہ۔ دہلی۔ جنوری ۱۹۵۶
۱۳ خطوط بنام ڈاکٹر سید عا. حسین (ف ۱۹۷۸ء)

۶۔ مولوی عبدالحق کے کچھ غیر مطبوعہ خطوط قومی زبان کراچی اگست ۱۹۹۱ء
۹ خطوط بنام قاضی عبدالودود

۷۔ مکتوبات قاضی عبدالودود تحقیق حیدرآباد سندھ نمبر ۱۲، ۱۳، ۹۸۔۱۹۹۹
۳ خط بنام عبدالستار صدیقی (بہ عنوان علمی مکتوبات)

۸۔ مکتوبات قاضی عبدالودود تحقیق حیدرآباد سندھ نمبر ۱۲، ۱۳، ۹۸۔۱۹۹۹
۲ خط بہ نام شیخ محمد اکرام

۹۔ مکتوبات محفوظ الحق خدا بخش لائبریری جرنل پٹنہ جون ۲۰۰۰ء
پروفیسر محفوظ الحق استاد فارسی و اردو پریسڈنسی کالج کلکتہ کے خطوط صدر یار جنگ، نصیر الدین ہاشمی اور مختار الدین احمد صاحب کے نام

۱۰۔ مکتوبات گیلانی بنام مالک رام معارف، اعظم گڑھ نومبر ۱۹۸۹ء
سید مناظر احسن گیلانی (ف ۱۹۵۶ء) کا مکتوب مع تمہید

۱۱۔ مکتوب گیلانی بنام غلام دستگیر رشید صحیفہ لاہور مئی جون ۱۹۸۹ء
۵ خطوط مع تمہید و حواشی

۱۲۔ نجیب اشرف صاحب کے چند خطوط نوائے ادب بمبئی جنوری ۱۹۸۹ء
پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی کے ۸ خطوط بنام مختار الدین احمد آرزو

۱۳۔ نظیر صدیقی کے خطوط بنام مختار الدین احمد جون ۱۹۹۲ سے ۳ر اکتوبر ۲۰۰ کے درمیان لکھے ہوئے ۳۳ خطوط تمہید و حواشی کے ساتھ مرتبہ ڈاکٹر مختار الدین احمد (رسالہ ادراک باقر گنج سیوان ۲۰۰۳)

Marfat.com

۱۴۔ کچھ بکھرے خطوط سید محمد حسنین کے ۲۲ خطوط بنام مختارالدین احمد از ۱۹۵۹ تا ۱۹۹۶ء مع تمہید و تعلیقات از مختارالدین احمد۔ انہی خطوط کے ساتھ ڈاکٹر مختارالدین احمد صاحب کے ۲۶ خطوط از ۱۹۶۳ء تا ۱۹۹۶ء مرتبہ ڈاکٹر مختارالدین احمد (مطبوعہ رسالہ ''نوید'' شعبۂ اردو، مگدھ یونیورسٹی گیا، بہار مرتبہ ڈاکٹر محفوظ الحسن ۲۰۰۳ء۔

ڈاکٹر آرزو، مکاتیب کی ادبی و تاریخی اہمیت کو سمجھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ مکاتیب کو جمع کرنے محفوظ کرنے اور ان کی ترتیب میں ہمیشہ سرگرم عمل رہتے ہیں۔ ایک بڑی تعداد ان کے پاس ان خطوط کی بھی ہے جو خود ان کے نام ہیں۔ ان میں بہت سے خطوط کو انھوں نے بڑے سلیقے اور اہتمام سے مرتب کر کے مختلف اوقات میں مختلف عنوانوں کے تحت شائع کرادیا ہے۔ مثلاً اگر کسی ایک شخص کے کسی ایک موضوع پر متعدد خطوط دستیاب ہیں تو اس موضوع کی رعایت سے انھوں نے خطوط مرتب کردیے۔ قاضی عبدالودود اور مالک رام سے ان کی خط و کتابت ایک طویل مدت کو محیط ہے۔ اس درمیان دونوں کا پسندیدہ موضوع غالب بھی ان خطوط میں زیر گفتگو رہا لہٰذا انھوں نے غالب سے متعلق ان دونوں ماہرین غالبیات کے کچھ خطوط کو بہ عنوان ''غالبیات'' ایک جگہ یکجا کردیا (تحقیق نمبر ۱۲۔۱۳، ۹۹۔۱۹۹۸ء) مزید برآں انھوں نے علمی استفسارات، نکات، مسائل وغیرہ سے متعلق مکاتیب کو علمی مکتوبات کے عنوان سے پیش کیا (مجلّہ تحقیق۔ نمبر ۱۲، ۱۳) اس کے علاوہ اپنے نام متعدد اہل قلم کے مکاتیب انھوں نے مع تعارف و حواشی مرتب کر کے شائع کیے ہیں۔

ڈاکٹر آرزو کے مکتوب نگاروں کی ایک طویل فہرست ہے۔ ان کا اشاریہ مختارنامہ (مرتبین ڈاکٹر عطا خورشید، مہرالٰہی ندیم علی گڑھ۔ ۲۰۰۲ء) میں دیکھا جاسکتا ہے۔ اس وقت مختارالدین احمد صاحب کے نام خط لکھنے والے صرف چند مشاہیر کے نام لکھنے پر اکتفا کروں گا۔ یہ حسب ذیل ہیں:

مولوی عبدالحق، جوش ملیح آبادی، پروفیسر احتشام حسین، قاضی اختر جوناگڑھی، شیخ محمد اکرام، نیاز فتحپوری، ڈاکٹر مولوی محمد شفیع، مولانا مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی، مولانا عبدالماجد دریابادی، پروفیسر حمید احمد خاں، ڈاکٹر شوکت سبزواری، مولانا امتیاز علی خاں عرشی، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، مولانا غلام رسول مہر، مالک رام، قاضی عبدالودود، مولوی مہیش پرشاد، ڈاکٹر سید عبداللہ، پروفیسر محفوظ الحق، مسعود حسن رضوی ادیب، پروفیسر نجیب اشرف ندوی وغیرہم۔

Marfat.com

یہ محسوس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر آرزو اپنے معاصرین میں سب سے زیادہ قاضی عبدالودود سے متاثر ہیں۔انھوں نے اب تک ان کے بے شمار خطوط جمع کر لیے ہیں۔ (انجمن ترقی اردو ہند کے آرکایوز میں قاضی صاحب کے جو خطوط محفوظ تھے وہ بھی انھوں نے حاصل کر لیے ہیں (مکتوب ڈاکٹر خلیق انجم ۔ شاعر بمبئی جنوری ۲۰۰۳ء) وہ ان تمام خطوط کو بڑی دیدہ ریزی کے ساتھ مرتب کر رہے ہیں۔چند قسطیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔

ڈاکٹر آرزو اس معنیٰ میں بھی خوش نصیب ہیں کہ ان کے خطوط کی بھی ایک بڑی تعداد ان کی حیات ہی میں منظر عام پر آ چکی ہے ۔ اُن کا سب سے پہلا مکتوب اس کی افادیت و اہمیت کی وجہ سے نیاز فتحپوری نے آج سے کوئی ۶۵ سال پہلے رسالہ'' نگار'' میں ایک عنوان دے کر مضمون کی شکل میں شائع کیا۔ (مصحفی نمبر کی بعض لغزشیں ۔ نگار لکھنؤ اپریل ۱۹۳۹ء) پھر مکتوب فرنگ کے عنوان سے ان کے مکتوبات مولانا عبد الماجد دریابادی نے'' صدق جدید'' کی کئی اشاعتوں (۲۳،۳۰ر جولائی ۱۹۵۴، ۱۱فروری ۱۹۵۵ء) میں شائع کیے۔یہ وہ خطوط ہیں جو آرزو صاحب نے لائیڈن یونیورسٹی ہولینڈ سے وہاں کے حالات پر مشتمل مولانا کو لکھے تھے۔ ڈاکٹر مختار الدین احمد کے ۳۷ خطوط ڈاکٹر غلام مصطفے خاں صاحب (حیدرآباد سندھ) کے نام خالد محمود نے یادگار خطوط'' (کراچی ۱۹۹۸ء) میں شائع کیے ہیں از صفحہ ۶۲۶ تا ۶۹۰ ۔ڈاکٹر صاحب کے چار خط بنام مولانا حامد علی خان'' مکاتیب مشاہیر ادب'' (لاہور ۲۰۰۱) میں شائع ہوئے ہیں۔یہ ۱۹۵۱ء اور ۱۹۷۱ کے درمیان لکھے گئے ہیں ۔ اسی طرح ان کے لکھے ہوئے چار طویل خط کتاب ''انجم اعظمی حیات و خدمات'' مرتبہ ڈاکٹر مشرف احمد (کراچی ۱۹۹۷) میں شائع ہوئے ہیں جو انھوں نے اپنے علی گڑھ کے دوست پروفیسر انجم اعظمی کو ۱۳ دسمبر ۱۹۸۴ اور ۲۰ ر مارچ ۱۹۸۹ء کے درمیان لکھے ہیں۔اس کے بعد بھی ان کے پچاسوں خطوط شائع ہوئے ہیں ۔ جن کا اشاریہ 'مختار نامہ' (علی گڑھ ۲۰۰۲ء) میں دیکھا جا سکتا ہے۔اس سے یہ باور کیا جا سکتا ہے کہ ایک اچھے مکتوب نگار کی حیثیت سے بھی ڈاکٹر آرزو کا نام خاصی اہمیت رکھتا ہے۔

مختار الدین احمد صاحب کے کچھ مزید خطوط کے مختلف اخبارات و رسائل میں شائع ہونے کی اطلاع ملی ہے،

ڈاکٹر صاحب کا ایک خط مورخہ یکم ستمبر ۱۹۸۳ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن (لاہور) نے روز نامہ جنگ لاہور ۴ ر نومبر ۱۹۸۳ء میں شائع کیا ہے ۔ یہ انھیں سلیم احمد (کراچی) کے انتقال پر بطور تعزیت لکھا گیا تھا۔انھی کے نام ڈاکٹر صاحب کا ایک خط مالک رام کی

Marfat.com

وفات پر مشتمل ایک ادبی رسالے میں شائع ہوا تھا۔

نادرات کے عنوان سے ڈاکٹر جعفر بلوچ نے اپنے نام ڈاکٹر صاحب کے دو خط (مورخہ ۱۸ اور ۲۱ راگست ۱۹۸۶) اپنی تمہید وحواشی کے ساتھ رسالہ الحمراء لاہور دسمبر ۲۰۰۲ء میں شائع کیے ہیں۔ یہ مولانا ظفر علی خاں، حامد علی خاں اور حمید احمد خاں کی ملاقاتوں پر مشتمل ہیں۔

''ڈاکٹر مختارالدین احمد کے چند خطوط ۶ خطو ط جو خلیل احمد رانا صاحب کو'' ۲۵ راپریل ۱۹۹۳ اور جون ۲۰۰۳ کے درمیان لکھے گئے مرتبہ خلیل احمد رانا (رسالہ جہان رضا لاہور اکتوبر ۲۰۰۳) میں شائع ہوئے۔

ان کے کچھ خطوط بنام انیس شاہ جیلانی صادق آباد پاکستان، عبد العزیز ساحر صاحب (اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد) نے وہاں کے ایک مجلّہ میں شائع کیے ہیں۔

خطوط بنام پیرزادہ اقبال احمد فاروقی مولانا محمد عالم مختارحق نے مرتب کر کے رسالہ جہانِ رضا لاہور میں شائع کرنا شروع کیے ہیں پہلی قسط ۱۳ خطوط (۱۵ر فروری ۱۹۹۲۔۱۴ر جون ۱۹۹۲) پر مشتمل ہے۔ ستمبر۔اکتوبر سے شمارے میں دوسری قسط شائع ہونے والی ہے۔ فاروقی صاحب کے پاس ڈاکٹر صاحب کے سو سے زائد زیادہ خطوط محفوظ ہیں۔ اس رسالے میں ڈاکٹر مختار الدین احمد دس بیس خط پہلے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ یہ مختلف زمانے میں مختلف مسائل پر مدیر جہانِ رضا کو لکھے گئے تھے۔

میں اس صدی بلکہ پچھلی صدی کے بھی کسی اردو مصنف و ادیب و شاعر سے واقف نہیں جس کے خطوط اس کی زندگی میں اتنی بڑی تعداد میں ہندوستان اور پاکستان کے مختلف مقامات سے شائع ہوئے ہوں۔ یہ ان کا وہ اعزاز ہے جس میں ان کا کوئی معاصر، ان سے سبقت نہیں لے جاسکا۔

ہمارے محتاط ادباء وشعراء عام طور پر وہ خطوط خودستائی کے خوف سے شائع نہیں کرتے جن کے مکتوب الیہ وہ خود ہوتے ہیں۔ ایسے خطوط کی بیشتر تعداد ضائع ہو جاتی ہے۔ اگر کچھ دست بردِ زمانہ سے محفوظ رہ جاتے ہیں تو وقت گزرنے کے بعد غلط یا نامکمل صراحتوں یا مرتب کی مصلحت آمیز وضاحتوں کے ساتھ منظر عام پر آتے ہیں۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ کسی نے خطوط اپنے نام سے شائع کرادیے حالانکہ وہ ان خطوط کے مکتوب الیہ نہیں تھے۔ بعض اوقات ان میں حذف و اضافے کی صورت بھی پیدا کرلی جاتی ہے اس صورت میں ان خطوط سے نتائج اخذ کرنے میں بسا اوقات بڑی دقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ڈاکٹر

Marfat.com

آرزو صاحب نے اپنے نام بیشتر خطوط شائع کر کے نہ صرف ان کو محفوظ کر دیا ہے بلکہ اپنے نام کے خطوط کس طور پر مرتب کیے جاتے ہیں، کس نوعیت و معیار کے خطوط قابلِ اشاعت ہوتے ہیں، کس طرح اُن پر حواشی لکھے جاتے ہیں، مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کا تعارفی نوٹ کس طرح کا لکھا جائے، اور ان کے آپسی روابط و تعلقات کی وضاحت کس طرح کی جائے اس کا انھوں نے شائع کردہ خطوط میں ایک معیاری نمونہ پیش کر دیا ہے جو قابلِ تقلید اور انفرادی نوعیت کا کام ہے۔

راقم الحروف کو بھی خطوط کی جمع آوری، خطوط کی تاریخ کی تعیین اور خطوط کی ترتیب و اشاعت سے دلچسپی رہی ہے۔ اس لیے میں پورے وثوق اور ذمہ داری سے یہ بات لکھ رہا ہوں کہ اردو کے کسی بھی ادیب نے مکتوبات کی جمع آوری، ان کی ترتیب و تدوین ان پر تحشیہ نگاری کو مستقل ایک علمی مشغلے کے طور پر نہیں اپنایا۔ ڈاکٹر آرزو نے اپنی نصف صدی سے زاید علمی و ادبی زندگی میں علاوہ دوسرے موضوعات پر کام کرنے کے مکتوباتی ادب پر ایک خاص نظم و ضبط کے ساتھ منصوبہ بند طریقے پر توجہ دی ہے اور اسے ایک علمی و ادبی پروجیکٹ کی صورت میں اپنے پیش نظر رکھا ہے۔ اردو کے مکتوباتی ادب کی جب کبھی بھی تاریخ مرتب ہوگی اس میں ڈاکٹر صاحب کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکے گا۔

ڈاکٹر مختار الدین احمد کا کام فی الوقتی مضامین اور مقالات کی صورت میں بکھرا ہوا ہے جس سے عمومی استفادے کی صورت پیدا نہیں ہو سکتی۔ اگر یہ تمام مضامین کتابی شکل میں محفوظ کر دیے جائیں تو خطوط مرتب کرنے والوں کے لیے نہ صرف رہنما نمونے ثابت ہوں گے، بلکہ جو اہل قلم خطوط مرتب کرنے کو معمولی درجہ کا کام تصور کرتے ہیں ان کی آنکھیں بھی روشن ہو جائیں گی۔

آج کل ڈاکٹر مختار الدین حسب ذیل حضرات کے خطوط کی جمع و ترتیب میں مصروف ہیں:

۱۔ مکاتیب ڈاکٹر عبدالستار صدیقی

۲۔ مکاتیب رشید احمد صدیقی

۳۔ مکاتیب مالک رام بنام مختار الدین احمد

۴۔ مکاتیب امتیاز علی عرشی

۵۔ مکاتیب غلام رسول مہر مرتب اور دوسرے ہندوستانی مکتوب نگاروں کے نام۔

Marfat.com

۶۔مکاتیب مولانا مناظر حسن گیلانی
۷۔مکاتیب مولانا تمنا عمادی مجیبی پھلواروی مرتب اور دوسرے اصحاب کے نام
۸۔مکاتیب یوسف الدین احمد بلخی بنام مرتب
۹۔مکاتیب ریاض حسن خاں خیال بنام قاضی عبدالودود
۱۰۔مکاتیب منوہر سہائے انور بنام قاضی عبدالودود ، مختارالدین احمد
۱۱۔مکاتیب قاضی عبدالودود
۱۲۔مکاتیب فارسی مفتی صدرالدین آزردہ دہلوی

ان کے علاوہ انکے دومضامین بعنوان ''محمد حسین آزاد کے کچھ غیر مطبوعہ نادر خطوط'' اور ''عبدالرحمٰن بجنوری کے چند غیر مطبوعہ خطوط'' تکمیل کے قریب ہیں یہ جلد ہی اشاعت پذیر ہوں گے۔

ایک ضخیم مجموعہ عرب علماء وفضلاء و محققین کے عربی خطوط کا، ایک مختصر سا مجموعہ ایرانی و افغانستانی اہل قلم کا اور ایک بہت قابل قدر مجموعہ یورپ کے مستشرقین اور مشاہیر کے انگریزی خطوط کا مختارالدین احمد صاحب کی توجہ وفرصت کا منتظر ہے۔

ہماری دعا ہے کہ خدائے عزوجل انہیں طویل عمر فرمائے، صحت مند و تندرست رکھے، اوران کی زندگی مسرت وشادامانی سے معمور رکھے کہ وہ اپنے علمی وادبی منصوبوں کی تکمیل میں حسبِ دستور مصروف رہیں۔

☆☆☆

Marfat.com

ڈاکٹر نسیم اختر
بہار لیجسلیٹو اسمبلی، پٹنہ

مختار الدین احمد

(اور کربل کتھا کی دریافت)

فضلی کی 'کربل کتھا' اب تک کی معلومات کے مطابق شمالی ہندوستان کی اردو کی سب سے پہلی نثری تصنیف ہے۔ اس کا ذکر پہلی مرتبہ مولوی کریم الدّین کے تذکرۂ طبقات شعرائے ہند میں ملتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''فضل علی نام تخلص فضلی، محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں وہ موجود تھا۔ اس نے ایک کتاب 'وہ مجلس' اردو زبان میں قدما کے محاورات پر لکھی ہے۔ وہ خود کہتا ہے کہ ان ایام میں میری عمر بائیس برس کی تھی۔ اس کتاب کا نام اس نے 'کربل کتھا' رکھا ہے۔''

پھر کریم الدّین نے اس کتاب سے، جس کا ایک قلمی نسخہ ان کے پاس تھا (''اس کتاب کو میں نے دیکھا وہ میرے پاس موجود تھی''۔ طبقات ص ۶۱) ایک طویل اقتباس دیا ہے جو سات صفحوں پر پھیلا ہوا ہے۔

کریم الدّین کے بعد گارساں دُتاسی (تاریخ ادبیات ہندوی، ہندوستانی ۱/۴۵۷)، محمد حسین آزاد دہلوی (آب حیات ص ۳۴)، فرزند احمد صغیر بلگرامی (جلوۂ خضر ۲/۹۵)، احسن مارہروی (تاریخ نثر اردو ۱/۶۴-۶۸)، شمس اللہ قادری (اردوئے قدیم ص ۱۳۰)، نصیر حسین خیال (مغل اور اردو ص ۷۵-۷۸)، حامد حسن قادری (داستانِ تاریخ اردو ص ۴۷-۴۹) غرض جس مصنف نے بھی 'کربل کتھا' کے بارے میں کچھ لکھا وہ کریم الدّین کے 'طبقات شعرائے ہند' کے اسی اندراج پر مبنی ہے۔

اس طرح اردو نثر کے اس نقش اول سے متعلق ہماری واقفیت ایک زمانے تک ان چند سطری بیانات سے زیادہ نہ تھی۔ اس طویل مدت کے بعد اہل علم و ادب غالباً اس کی بازیافت کی طرف سے مایوس ہو چکے تھے۔ کون جانتا تھا کہ اردو ادب کا یہ نایاب نسخہ دیار غیر

Marfat.com

میں کسی نامعلوم مقام پر گمنامی میں دبا کسی کولمبس کے انتظار میں ہے۔ حسن اتفاق سے اس کتاب کی جلاوطنی کے ٹھیک ایک سو سال بعد یعنی ۱۹۵۶ء میں ڈاکٹر مختارالدّین احمد نے اسے وطن واپس لاکر جہاں دنیاے ادب کو حیرت میں ڈال دیا وہیں اسے مرتب کر کے اپنے تحقیقی ذوق وبصیرت کی سند بھی فراہم کردی۔ انہوں نے کام کی تکمیل کے آخری دور میں مالک رام صاحب کو بھی شریک کار بنالیا، یہ کتاب قاضی عبدالودود صاحب کے 'ادارۂ تحقیقات اردو پٹنہ' سے ۱۹۶۵ء میں شائع ہوئی۔ بلا شبہ یہ ان کا ایک عظیم الشان تحقیقی کارنامہ ہے، اور بقول گیان چند جین:

> ''شمالی ہند کی نثر کی قدیم ترین کتاب کو دریافت کرنا بے شک غیر معمولی تحقیق ہے اور یہ مختار صاحب کے تحقیقی کارناموں میں گل سرسبد ہے۔''
> (نذر مختار ص)*

لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اس 'گل' کو 'سرسبد' بننے میں مختارالدّین احمد کو کس صبر آزما اور دشوار کن راہوں کا سفر کرنا پڑا۔ انہیں 'کربل کتھا' کی دریافت کی تحریک قاضی عبدالودود سے ملی تھی۔ جیسا کہ وہ لکھتے ہیں:

> ''میں جب ۱۹۵۳ء میں آکسفورڈ جارہا تھا، تو جناب قاضی عبدالودود صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ اشپرنگر کے پاس 'کربل کتھا' کا جو نسخہ تھا، اس کا کچھ سراغ نہیں ملتا کہ کیا ہوا۔ ہو سکے تو یورپ کے کتب خانوں میں اس گمشدہ کتاب کو ضرور تلاش کریں۔ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ ہندوستان میں اشپرنگر کے پاس یہ کتاب تھی، لیکن کیا یہ جرمنی پہنچی؟ پہنچی تو یورپ کی پچھلی صدی کی متعدد لڑائیوں اور ہمارے سامنے کی دو عظیم الشان جنگوں میں، جن میں جرمنی شریک غالب رہا تھا، اس کتاب پر کیا بیتی؟ یہ سوال تھے جن کا جواب دینا آسان نہیں تھا۔''

چنانچہ ڈاکٹر مختار الدّین احمد یورپ پہنچتے ہی اس نسخے کی تلاش میں مصروف ہوگئے۔ انہیں معلوم تھا کہ اشپرنگر جب ہندوستان سے ۱۸۵۷ء میں اپنی ملازمت کے آخری عہد میں مدرسۂ عالیہ، کلکتہ کی پرنسپل شپ سے ریٹائر ہوکر یورپ واپس ہوا تھا تو 'کربل کتھا' کا مخطوطہ اور بہت سی قیمتی کتابیں بھی اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ جو بعد میں اس نے برلن کی سرکاری لائبریری کی نذر کردیا تھا۔ اس کتب خانے میں ہزاروں عربی، فارسی

* 'کربل کتھا' مرتبۂ مالک رام ومختارالدّین احمد ص ۲۷ (دہلی ۱۹۶۵)

Marfat.com

اورتر کی مخطوطات تھے اور کچھ اردو کی کتابیں بھی تھیں۔ اردو کتابوں کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر مختارالدّین احمد لکھتے ہیں:

''برلن میں اردو کتابیں بہت کم تھیں۔ خود اشپرنگر کے ذخیرے میں بھی ان کی تعداد کچھ زیادہ نہ تھی۔ اس لئے کتاب خانے کے مہتموں کو اردو مخطوطات کی فہرست تیار کروانے کی طرف توجہ نہیں ہوئی۔ ایک معمولی سے رجسٹر میں کسی نے اردو کتابوں کے نام لکھ دیے تھے اور بس، اردو مخطوطات کی تلاش میں کوئی برلن گیا بھی شاذونادر ہی ہوگا۔ اس لیے کتابوں کا یہ مختصر ذخیرہ کس مپرسی کے عالم میں پڑا رہا اور جہاں اس کتب خانے سے عربی، فارسی مخطوطات کے متعلق گیارہ ضخیم جلدیں شائع ہوئیں، اردو کتابوں کی دستی فہرست تک تیار کرنے کا کسی کو خیال نہ آیا۔ اس طرح 'کربل کتھا' کا یہ نسخہ آنکھوں سے اوجھل ہوگیا۔''*

ڈاکٹر مختارالدّین احمد جب ۱۹۵۳ء میں روکفیلر فیلو کی حیثیت سے اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان پہنچے تو جہاں وہ اپنے علمی منصوبے کی تکمیل میں مصروف ہوئے وہیں 'کربل کتھا' کی تلاش سے بھی غافل نہیں رہے۔

اس سلسلے میں انہوں نے خود ہی لکھا ہے کہ انھوں نے یورپ پہنچتے ہی جرمنی، ہالینڈ، فرانس اور مغربی ممالک کے تمام بڑے اور مشہور کتب خانوں سے خط وکتابت شروع کی۔ انگلستان اور اسکاٹ لینڈ کے تو چھوٹے سے چھوٹے کتاب خانے میں اس کی تلاش میں پہنچے، لیکن کہیں کچھ پتا نہیں چلا۔ وہ لکھتے ہیں کہ انگلستان میں اس کتاب سے متعلق کسی قسم کی اطلاع نہ ملنے سے تو انہیں مایوسی نہیں ہوئی، اس لیے کہ شروع ہی سے ان کا خیال تھا کہ اس کے جرمنی میں دستیاب ہونے کا امکان زیادہ ہے۔ لیکن وہ اس بات کی تحقیق بھی کرنی چاہتے تھے کہ شاید ہندوستان سے اس کا کوئی اور نسخہ انگلستان پہنچ گیا ہو اور یہاں کے کسی غیر معروف کتب خانے میں پڑا ہو۔*

وہ انگلستان کے بعد ہالینڈ کے مشہور عالم لائیڈن یونیورسٹی لائبریری پہنچے۔ وہاں انہیں مایوسی ہوئی تو وہ فرانس اور جرمنی کے کتب خانوں کی طرف متوجہ ہوئے۔ ساتھ ہی ساتھ اہم مستشرقین سے انہوں نے خط وکتابت کا سلسلہ شروع کیا۔ اسی اثنا میں انہیں معلوم ہوا کہ عربی، فارسی، ترکی اور اردو کے کوئی پندرہ سولہ ہزار مخطوطات، پچھلی جنگ عظیم

---

* 'کربل کتھا' مرتبۂ مالک رام ومختارالدّین احمد ص ۲۷

Marfat.com

کی تباہ کاریوں سے بچانے کی غرض سے جرمنی کے محفوظ شہروں میں بھیجوا دیے گئے تھے۔ انہوں نے ۱۹۵۴ء کے اواخر سے ۱۹۵۵ء کے اوائل تک ہالینڈ اور جرمنی کے مختلف مقامات کا دورہ کیا۔ وہ لائیڈن، ھیگ، بون، کولون، فرینکفرٹ، مائنز اور ہائیڈل برگ میں اسے تلاش کرتے ہوئے مارگ بُرگ پہنچے۔ وہاں یونی ورسٹی لائبریری اور برلن کے شاہی کتب خانے کے ہزاروں مخطوطات دیکھے مگر 'کربل کتھا' کا کوئی سراغ نہیں مل سکا۔ کوئی اور ہوتا تو ان کاوشوں کے بعد تھک کر بیٹھ جاتا یا کم سے کم اس کی تلاش اس لیے بھی التوا میں ڈال دیتا کہ وہاں ان کا اپنا تحقیقی کام زیادہ مقدم تھا، جس مقصد کے لیے وہ یورپ گئے تھے اور جس کے لیے ان کے پاس وقت بھی محدود تھا، لیکن تلاش و جستجو کی راہ میں انہوں نے کبھی ناامیدی یا تن آسانی کو حائل نہیں ہونے دیا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں*:

> ''میں مارگ بُرگ سے تھکا ہارا ہائیڈل برگ پہنچا۔ یہاں ڈاکٹر البرٹ ڈیٹرش استاد السنۂ سامی نے برلن کے کتابخانے کی انچارج انگل کا جوابی خط (مورخہ ۱۱ر جنوری، ۱۹۵۵) مجھے دیا، جس میں انھوں نے یہ مژدۂ جانفزا سنایا تھا کہ پرانے کاغذات دیکھنے سے معلوم ہوا ہے کہ مخطوطۂ اشپرنگر 137 جس کی آپ کو تلاش ہے، دوسری کتابوں کے ساتھ ٹیوبنگن بھیجا گیا تھا۔ اب کیا تھا میں خوش خوش ٹیوبنگن پہنچا اور ڈاکٹر کریمر سے ملا، جو وہاں عربی زبان وادبیات کے استاد تھے۔ انھوں نے ناظم کتابخانہ سے ملایا اور مجھے ایک نئے تعمیر شدہ کمرے میں لے گئے..... یہاں کھلی الماریوں میں کتابیں چنی رکھی تھیں۔ پہلے ہی دن** چند دنوں کے بعد چند گھنٹوں کی تلاش کے بعد ایک کتاب پر نظر پڑی، جس کی جلد کے پشتے پر انگریزی میں 173.Sprenger لکھا ہوا تھا۔ کانپتے ہاتھوں سے کتاب کھول کر دیکھا تو آنکھیں چندھیا گئیں۔ یہ فضلی کی کربل کتھا تھی۔''

اس طرح ایک طویل جدو جہد اور آبلہ پائی کے بعد 'کربل کتھا' کا نایاب نسخہ ڈھونڈ نکالنے میں ڈاکٹر مختار الدین احمد کو آخر کامیابی مل گئی جس کی اطلاع فوراً انھوں نے اپنے بزرگوں اور احباب کو ہندوستان میں دی۔ یہاں یہ بات ذہن نشیں رہے کہ ان کے سفر یورپ پر روانگی سے قبل قاضی عبدالودود نے ان سے کہا تھا: اگر آپ سفر یورپ میں کہیں سے فضلی کی کربل کتھا' کا نسخہ حاصل کرسکیں، تو یہ علم و ادب کی بڑی خدمت ہوگی،

---

*''کربل کتھا' ص ۲۸:

**ایک ملاقات میں انھوں نے بتایا پہلے ہی دن نہیں چند دنوں کے یہ بعد یہ نسخہ ہاتھ آیا تھا۔

Marfat.com

جس کے لیے اردو والے آپ کے ہمیشہ ممنون اور احسان مند رہیں گے۔، لہٰذا انھوں نے اس کی دریافت کی خبر فوراً ٹیوبنگن سے انہیں دی۔ یہ خط تو نہیں مل سکا لیکن قاضی مسعود صاحب کی عنایت سے ۲ر فروری ۱۹۵۵ کا لکھا ہوا خط اب دستیاب ہوگیا ہے جس میں مختار الدین صاحب لکھتے ہیں:

"..... وہ مجلس مل گئی..... یہیں کے انبار میں دبی تھی۔ ایک نوتعمیر تہ خانہ سا ہے جہاں برلن کا بقیہ ذخیرہ محفوظ ہے۔ اس میں پہنچ جاتا تھا اور کتابوں میں (وہ مجلس) تلاش کرتا رہتا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ کوشش رائیگاں نہیں گئی۔ تقطیع مختصر ہے اور تحریر بہت خوبصورت اور بہت واضح اور خوشی کی بات یہ کہ نسخہ مکمل ہے۔ اوراق ۲۶۱ سطور ۱۱۔ فضلی نے لکھا ہے کہ پہلا مسودہ ۱۱۴۵ء میں تیار ہوا تھا اس کا نام کربل کتھا، بھی ہے' وہ مجلس' کے عکس (مختصر تقطیع) پر تقریباً سو مارک اور متوسط تقطیع پر دو سو مارک خرچ ہوں گے۔ میرا خیال ہے کہ مختصر تقطیع سے کام چل جائے گا۔ جواب آکسفورڈ کے پتے پر دیجئے۔"

اس سلسلے میں ڈاکٹر صاحب کی ایک تحریر پرحال میں نظر پڑی۔ وہ لکھتے ہیں:

"کچھ یاد آتا ہے کہ جس دن کربل کتھا' دریافت ہوئی، اسی دن واپس آ کر قاضی عبد الودود صاحب، رشید احمد صدیقی صاحب اور قاضی عبد الغفار صاحب کو اس لعل گمشدہ کی بازیابی کی اطلاع دی۔ قاضی صاحب کو مفصل خط لکھا تھا۔ ان کے فرزند قاضی محمد مسعود صاحب کو افسوس! میرا وہ خط نہیں مل سکا، مل جاتا تو کربل کتھا' کی دریافت کی اصل تاریخ معلوم ہو جاتی۔ بہرحال یہ اواخر جنوری ۱۹۵۵ء کی کوئی تاریخ ہوگی۔"

(رسالہ تحقیق، حیدرآباد سندھ، شمارہ ۱۲۔۱۳ (۹۸۔۱۹۹۹) ص ۷۷۹)

ایک خط موصوف نے مالک رام صاحب کو بھی لکھا تھا۔ یہ پرنس کارل ہوٹل کے کمرہ نمبر ۱۲ ٹیوبنگن سے ۴ فروری ۱۹۵۵ء کو تحریر کیا گیا تھا:

"ماربرگ میں زیادہ دن ٹھہر جانا پڑا۔ ایک کتاب کی تلاش تھی۔ اندیشہ تھا کہ دنیا سے فنا ہو چکی ہے، لیکن اس بات کی اطلاع تھی کہ ۱۸۵۷ء سے پہلے ڈاکٹر اشپرنگر کے پاس موجود تھی اور یہ کہ ان کی کتابیں برلن کے ذخیرے میں محفوظ تھیں۔ اس کتاب کا کوئی پتا نہ تھا۔ لائبریرین نے اجازت دے دی کہ

Marfat.com

اسٹیک روم میں جاؤ اور ایک ایک کتاب دیکھو۔۱۵دنوں تک یہی کام کرتا رہا اور کاموں کے علاوہ اس کتاب کی بھی تلاش رہی۔ پانچ ہزار پانچ سو کتابیں الٹ پلٹ کر دیکھیں۔ بون، فرینکفرٹ، مانیز، ہائیڈل برگ ہوتا یہاں (ٹیوبنگن) پہنچا، یہاں تلاش کیا اور کتاب مل گئی۔اس کتاب کی تلاش میں میں برسوں سے تھا لوگوں کوتو یقین ہو چلا تھا کہ یہ کتاب اب دنیا سے فنا ہے۔ یہ شمالی ہند میں اردو نثر کی اولین کتاب کربل کتھا یا دہ مجلس فضلی ہے جو ۱۱۴۵ء میں لکھی گئی ہے....."

(رسالہ تحقیق، شمارہ ۱۲۔۱۳ص ۱۸۷)

ڈاکٹر مختار الدین احمد تعلیقات میں وضاحت کرتے ہیں:

''کتب خانہ برلن'' کے مخطوطات کا ایک حصہ جو عارضی طور پر مارگ برگ یونیورسٹی لائبریری کی تحویل میں تھا، لائبریری کی عمارت کے نیچے ایک تہ خانے میں محفوظ کردیا گیا تھا۔ یہ حصہ بند رہتا تھا اسے کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ مشرقی مخطوطات کے ناظم ڈاکٹر (Wolf Gang Voigt) کی وجہ سے ہال کھولا گیا اور ان کی مہربانی سے مجھے یہ ذخیرہ دیکھنے کا موقع ملا۔ ڈاکٹر فوگٹ نے برلن سے پروفیسر Luders کی نگرانی میں ۱۹۳۶ء میں The Animals in the Indian and Persian Religeon کے موضوع پر ڈاکٹریٹ حاصل کی تھی۔ یہ بڑے اچھے اسکالر، بہت اچھے انسان اور بڑے پیارے آدمی تھے۔ مارگ کے دوران قیام ان کی محبت وشفقت ۴۵ سال گزرنے پر بھی اکثر یاد آتی ہے۔''

ڈاکٹر مختار الدین احمد اپنے تحقیقی منصوبے کی تکمیل کے بعد آکسفورڈ سے پروفیسر سر ہملٹن گب کی نگرانی میں عربی و اسلامیات میں ڈی فل کی ڈگری لے کر ہندوستان واپس آئے تو دیگر نوادر کے ساتھ 'کربل کتھا' کے بیش قیمت منحصر بفرد نسخے کا عکس بھی اپنے ساتھ لائے۔ اس میں شبہ نہیں کہ موصوف کی یہ بہت بڑی علمی و ادبی خدمت ہے۔اس کی تدوین واشاعت سے متعلق مالک رام صاحب کا ایک انکشاف بہت قیمتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''کربل کتھا'' کا یہ مخطوطہ انھیں ٹیوبنگن (جرمنی) میں اواخر جنوری ۱۹۵۴ء میں دستیاب ہوا۔ انھوں نے اس کی خبر اپنے دوستوں کو ہندوستان میں دی۔(خود مجھے بھی مطلع کیا تھا۔) وہ ۲۱ اپریل ۱۹۵۶ء کو آکسفورڈ سے ہندوستان واپس آئے ،اسی کے تھوڑے دنوں بعد علی گڑھ یونیورسٹی نے تاریخ اردو ادب ،

Marfat.com

مرتب کرنے کا منصوبہ بنایا اور تقسیم کار اور تفاصیل طے کرنے کے لیے یونیورسٹی کے اساتذہ اور اردو کے مصنفوں میں سے بعض اصحاب کو مدعو کیا۔ اس میں مختار الدین احمد بھی موجود تھے۔ (انھیں اور ڈاکٹر گیان چند کو تاریخ ادب کے لیے شمال ہند کی قدیم اردو نثر پر ایک باب لکھنے کا کام سپرد ہوا تھا) حاضرین میں دلّی کے ایک پروفیسر صاحب بھی تھے۔ ان کے دریافت کرنے پر مختار الدین احمد صاحب نے انھیں بتایا کہ ''کربل کتھا'' کا خطی نسخہ ٹیوبنگن یونیورسٹی (جرمنی) کے کتاب خانے میں موجود ہے۔ یہ صاحب اس کے کچھ دن بعد (غالباً اواخر ۱۹۵۶ء) میں یورپ گئے تو خاص طور پر ٹیوبنگن کے دور دراز مقام پر پہنچے اور وہاں سے اس مخطوطے کا مائیکرو فلم لے آئے۔ ۱۹۵۶ء میں وطن واپس آ کر انھوں نے عجلت سے اس کا ناقص اور نامکمل مطبوعہ نسخہ ایک خاص تقریب میں مارچ ۱۹۶۱ء میں وزیر اعظم ہند (پنڈت جواہر لال نہرو) کی خدمت میں پیش کر دیا۔ یہ غیر مکمل نسخہ (نہرو میوزیم دہلی میں) اب بھی موجود ہے لیکن چونکہ ان کی مطبوعہ کتاب ناقص تھی اس لیے انھوں نے شائع نہیں کیا۔ میں جب ۱۹۶۴ء میں یورپ سے واپس آیا تو میں نے مختار الدین احمد صاحب کو کتاب شائع کرنے کا مشورہ دیا۔ اس پر یہ نسخہ ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا اور یہی اس کی پہلی اشاعت تھی۔ دہلی کے پروفیسر صاحب نے اپنے نسخے کو مکمل کر کے اسے دو برس بعد شائع کیا۔ لیکن چونکہ اس کے ابتدائی صفحات ۱۹۶۱ء میں چھپ چکے تھے، وہ جوں کے توں قائم رہے جس سے قاری کو غلط فہمی ہوتی ہے کہ یہ کتاب اس مطبوعہ تاریخ کو شائع ہوئی حالانکہ یہ غلط فہمی ہے۔ میں نے تفصیل اس لیے لکھی تا کہ کربل کتھا، کی بازیافت و دریافت اور اس کی پہلی اشاعت کا مسئلہ صاف ہو جائے''

اردو کے مشہور اور مستند مصنف ڈاکٹر گیان چند اپنے مضمون 'مختار الدین بحیثیت محقق، میں 'کربل کتھا' کی دریافت اور اشاعت کے متعلق حقائق سے یوں پردہ اٹھاتے ہیں:

''ڈاکٹر مختار الدین احمد کی تحقیق و تدوین دونوں کا شاہکار 'کربل کتھا' ہے۔ یہ متن ناپید سمجھا جاتا تھا۔ ۱۹۵۳ء میں مختار الدین احمد یورپ گئے تو قاضی عبدالودود نے فرمائش کی کہ کہیں ذخیرۂ اشپرنگر کا پتا چل سکے تو 'کربل کتھا' ڈھونڈنا۔ مختار صاحب دسمبر ۱۹۵۴ء میں مغربی یورپ کے بہت سے کتب خانوں میں گئے۔ ہائیڈل برگ جانے پر کسی کے خط سے پتا چلا

Marfat.com

کہ مخطوطہ اشپرنگر ممکن ہے ٹیونگن میں ہو۔ یہ وہاں گئے اور چند گھنٹوں کی تلاش کے بعد کانپتے ہاتھوں سے کربل کتھا کا نسخہ اٹھا کر دیکھا۔ ۲ فروری ۱۹۵۵ء کو اس کی اطلاع دیتے ہوئے ٹیونگن سے قاضی عبد الودود کو انھوں نے خط لکھا۔"

آگے چل کر گیان چند صاحب لکھتے ہیں:

"شمالی ہند کی نثر کی قدیم ترین کتاب کو دریافت کرنا بے شک غیر معمولی تحقیق ہے اور مختار صاحب کے تحقیقی کارناموں میں 'گل سرسبد' ہے۔ یہ صاحب حسب معمول اس نسخے کو لیے بیٹھے رہے اس کی دریافت کے بارے میں کہیں ایک مضمون بھی نہیں لکھا۔ اس کا حال سن کر 'یاروں' نے اس کا عکس حاصل کرلیا اور بڑی عجلت سے چھاپ دیا۔ لیکن چونکہ کام مکمل نہ تھا اس لیے کتاب بازار میں نہیں دی بعد میں مختارالدین احمد نے مالک رام کے ساتھ مل کر اس متن کو بے مثال انداز سے ترتیب دیا اور اکتوبر ۱۹۶۵ء میں شائع کردیا۔ کربل کتھا کی تدوین مثالی معیار کی ہے اس کارنامے نے مختارالدین صاحب کو اردو تحقیق میں پایۂ اعتبار عطا کیا۔"

(نذر مختار ص ۸۶)

'کربل کتھا' کی دریافت کی ساتھ اس کی ترتیب و اشاعت کا واقعہ بھی کچھ کم دلچسپ نہیں۔ یہ اس نادر کتاب کی بازیافت اور اس کی اشاعت سے متعلق چند گوشوں کی وضاحت تھی۔ بلاشبہ 'کربل کتھا' کی تحقیق اور اس کی اعلیٰ تدوین اردو ادب میں ایک اہم اضافہ ہے جس کے لیے اردو والے ڈاکٹر مختار الدین احمد کے ہمیشہ 'ممنون و احسان مند رہیں گے اور ذوق تحقیق میں اسے نشان راہ بنانے کی کوشش بھی کریں گے۔

نہ معلوم 'کربل کتھا' جیسے اور کتنے نادر مخطوطے کہاں کہاں غیر معروف کتب خانوں اور لوگوں کے ذاتی ذخیروں میں کسی کو لمس کے انتظار میں پڑے ہوں گے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ جدید ترین وسائل کی سہولتوں کا سہارا لے کر ایسے مزید مخطوطات کی بازیافت کی جائے تاکہ اردو ادب کی تاریخ میں نئے ابواب کا قابل قدر اضافہ ہوسکے۔

☆☆☆

Marfat.com

1341

مَینُ عندلیُبِ گلشَنِ نا آفریدہ ھُونُ

Marfat.com